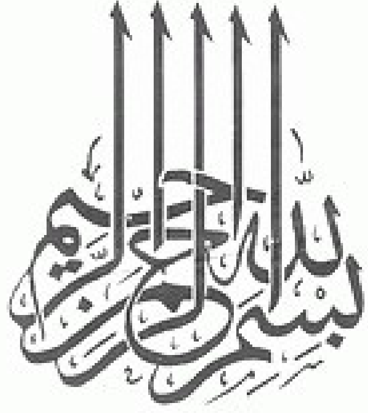
مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم اپریل ۹۶ء

تذکارِ محمود رحمہ اللہ

ترتیب و تقدیم
محمد فاروق قریشی

مفتی محمودؒ اکیڈمی پاکستان (کراچی)



مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمود رحمہ اللہ

ترتیب و تقدیم

محمد فاروق قریشی

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد

کما صلیت علیٰ ابراہیم و علیٰ آل ابراہیم

انک حمید مجید

اللھم بارک علیٰ محمد و علیٰ آل محمد

کما بارکت علیٰ ابراہیم و علیٰ آل ابراہیم

انک حمید مجید

[illegible]

سلسلہ اشاعت : ۵

اشاعتِ اول : ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ/دسمبر ۲۰۰۵ء

نام کتاب : تذکارِ محمودؒ

مرتب : محمد فاروق قریشی

کمپوزنگ : حامد احمد شرفی

صفحات : ۳۲۰

مطبع : المخزن پرنٹرز۔کراچی

قیمت : 200/=

ناشر

مفتی محمود اکیڈمی۔پاکستان

کراچی

ملنے کے پتے

۱۔مکتبہ رشیدیہ نزد مقدس مسجد، اردو بازار۔کراچی

۲۔اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن۔کراچی

۳۔مکتبہ قاسمیہ، اردو بازار۔لاہور

۴۔جمعیت پبلی کیشنز، وحدت روڈ۔لاہور

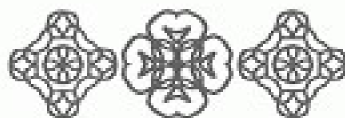
انتساب

افکارِ محمودؒ کے امین، مفتی محمودؒ اکیڈمی کے نگرانِ اوّل

فقیہ ملت ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کے نام

؎ اک ولولۂ تازہ دیا جس نے دلوں کو

فہرست



مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

حرفِ تحسین

فقیہ العصر مفسرِ دوراں

مفتی محمد زرولی خان مدظلہٗ

رئیس جامعہ احسن العلوم
کراچی

مفتی محمودؒ اکیڈمی پاکستان (کراچی)

حق تعالیٰ شانہٗ اپنے بعض اور نیک بندوں کی محبت اپنے نیک خصلت بندوں کے ہاں ایسی عام کردیتا ہے جو دوسروں کے لیے اصولِ راہ بن جاتی ہے۔ زمانہ قریب میں قافلہ حق کے آخری سالار محمود الملت والدین حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ اُن برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جن کی محبت کے لیے عام وخاص کے قلوب دیدہ و فرش کی طرح بچھائے گئے تھے۔ صحیحین کی حدیث میں ثم یوضع له القبول فی الارض کے اندر اس کی طرف اشارۂ بلیغ ہے، حق تعالیٰ نے جس طرح ایشیا کے سب سے بڑے عالم مولانا شمس الحق افغانیؒ اور امام العصر مولانا انور شاہؒ کے علوم کے امین حضرت بنوریؒ اور شیخ التفسیر حضرت لاہوریؒ اور برکت المحدثین مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک جیسے نابغۂ روزگار ہستیوں کو حق تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کی صلاحیتوں کا ایسا معترف بنایا تھا کہ وہ اعتراف عقیدت کا ترجمان تھا۔ اس طرح مظاہر دنیا کے بہت سارے بیش بہا افراد کو بھی حضرت مفتی صاحبؒ سے کمالِ عقیدت رہی، میری طالبِ علمی کا زمانہ تھا اور گلشن اقبال جامع مسجد احسن میں برائے امامت وخطابت تقرر ہوچکا تھا تو حید وسنت کی نشر واشاعت اور مسلکِ حق کی حمایت ونصرت کا جذبہ موجزن تھا بہت ساری تدابیر میں سے ایک تدبیر یہ کی گئی کہ علاقہ کے نوجوانوں کا جمعیت طلبا اسلام کے نام پر یونٹ قائم کردیا گیا یہ لڑکے وہی تھے جو فجر کے بعد درسِ قرآن اور جو فجر میں نہیں پہنچ سکتے تھے ان کے لیے نمازِ عصر کے بعد درسِ قرآن اور نمازِ عشاء کے بعد شمس الدین ذہبیؒ کی ''الطب النبوی'' اور نور الایضاح کے درس، ترمذی اور ہدایہ کے طرز پہ ہوتے تھے۔ پروفیسر مزمل حسن، مولانا سید صبا مرحوم، ڈاکٹر مدثر اور ڈاکٹر ہمایوں وغیرہ اس وقت کے گوہر آبدار ہیں۔ نوجوانوں کی اصلاح اور تربیت کے لیے

ایک تقریب منعقد کی گئی غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ ایک چاق و چوبند نوجوان معتدل قد و قامت جاذبِ نظر اور حسن و جمال کا مرقع بظاہر کالج یا اسکول کا باصلاحیت طالب علم ❶ معلوم ہو رہا تھا جب انھیں موضوع پر گفتگو کے لیے کہا گیا تو اندازہ ہوا کہ صلاحیتوں کا پیکر حضرت مفتی صاحب کا عاشق زار اور اہلِ حق کا سر بہ کف مجاہد ہمارے عزیز دوست محمد فاروق قریشی ہیں۔ یہ موصوف سے پہلی ملاقات تھی اور حق اور اہل حق سے ان کی معصومیت بھری والہانہ محبت و جذبات اور جماعتِ حقہ کے لیے جس گھن گرج کے ساتھ وہ اس نو وجود تقریب کے لیے گویا ہوئے گویا تقریب ایک جسم تھی جس میں اس روح کی ضرورت تھی موصوف کی شوکتِ تحریر و صحافت کے مظاہر تو بعد میں دیکھے ہیں لیکن ان کی بیش بہا صلاحیتوں اور غیر معمولی قوتِ گویائی کا یہ پہلا مظاہرہ تھا کسی نے خوب کہا ہے ؎

اس وقت سے میں تیرا پرستار حسن ہوں
دل کو میرے شعور محبت بھی جب نہ تھا

وقت گزرتا گیا موصوف اپنے دنیاوی اشغال کے ساتھ ساتھ اس مقصدِ اصلی اور غرضِ اعظم پر ہمیشہ متوجہ رہے۔ واقعتاً وہ اس شعر کا مصداق ہیں ؎

طریقِ عشق میں گو کارواں پہ کارواں بدلا
نہ اس نے راستہ بدلا نہ میرِ کارواں بدلا

بعد میں حضرت مفتی صاحب مرحوم و مغفور سے متعلق ان کی اہم مہم اور شاہکار تصانیف شائع ہونے لگیں۔ حال ہی میں ان کی شوکتِ تحریر اور سلطنت صحافت کی آئینہ دار ''تذکارِ محمود'' منصۂ شہود پر آ چکی ہے۔ مجھ عاجز و فقیر سے انھوں نے سابقہ رشتوں کے توسط سے ''پیش لفظ'' لکھنے کا فرمایا کیوں کہ ہم بھی اس وادی کے سرگردانوں میں سے ہیں۔ اور حضرت مفتی صاحبؒ اور دیگر اکابرِ توحید و سنت کا ذکرِ خیر اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتے ہیں ؎

❶ جامعہ کراچی میں ایم اے معاشیات کا طالب علم۔ (مرتب)

جہاں جاتے ہیں ہم تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں
کوئی محفل ہو تیرا رنگِ محفل دیکھ لیتے ہیں

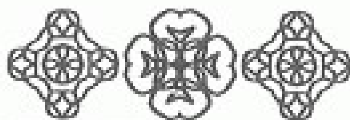
میری وجہ سے ''تذکارِ محمود'' جیسی ادب و محبت کی ترجمان کتاب کا قد و کاٹھ تو نہیں بڑھے گا البتہ برادرِ مکرم کی حسن محبت کی دعائیں اور حضرت مفتی صاحبؒ سے عقیدت و احترام کا مقام مل سکے گا جو اس ناسوتی زندگی میں ہم جیسے شرمساروں کا اوڑھنا بچھونا ہے ؎

تمہارا نام لے کر جی رہا ہوں
تمہاری یاد میری زندگی ہے

حق سبحانہٗ و تعالیٰ برادرم کی یہ کوشش اور سعی قبول فرمائیں اور حضرت مفتی صاحبؒ کی عقیدت و احترام کے بادہ پیاؤں کو اس آبِ شیرین سے تشنگیٔ علم کی پیاس بجھانے کی توفیق عطا فرمائے اور برادرِ مکرم کی یہ گراں قدر تالیف اور ان کی دیگر بیش بہا مولفات کی طرح قبول و مقبول فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

والسلام
عاجز و فقیر
محمد زرولی خان عفا اللہ عنہ



مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

تقدیم

ابوسفیان **محمد فاروق قریشی**

مینیجنگ ڈائریکٹر مفتی محمودؒ اکیڈمی - پاکستان

(کراچی)

مفتی محمودؒ اکیڈمی پاکستان کراچی

حق تعالیٰ شانہٗ اپنے بعض اور نیک بندوں کی محبت اپنے نیک خصلت بندوں کے ہاں ایسی عام کر دیتا ہے جو دوسروں کے لیے اصول راہ بن جاتی ہے۔ زمانہ قریب میں قافلہ حق کے آخری سالار محمود الملت والدین حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ؒ ان برگذیدہ ہستیوں میں سے تھے جن کی محبت کے لیے عام و خاص کے قلوب دیدۂ فرش کی طرح بچھائے گئے تھے۔ صحیحین کی حدیث میں ثم یوضع لہٗ القبول فی الارض کے اندر اس کی طرف اشارۂ بلیغ ہے، حق تعالیٰ نے جس طرح ایشیا کے سب سے بڑے عالم مولانا شمس الحق افغانیؒ اور امام العصر مولانا انور شاہؒ کے علوم کے امین حضرت بنوریؒ اور شیخ التفسیر حضرت لاہوریؒ اور برکت المحدثین مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک جیسے نابغۂ روزگار ہستیوں کو حق تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کی صلاحیتوں کا ایسا معترف بنایا تھا کہ وہ اعتراف عقیدت کا ترجمان تھا۔ اس طرح مظاہر دنیا کے بہت سارے بیش بہا افراد کو بھی حضرت مفتی صاحبؒ سے کمال عقیدت رہی، میری طالبِ علمی کا زمانہ تھا اور گلشن اقبال جامع مسجد احسن میں برائے امامت و خطابت تقرر ہو چکا تھا توحید و سنت کی نشر و اشاعت اور مسلکِ حق کی حمایت و نصرت کا جذبہ موجزن تھا بہت ساری تدابیر میں سے ایک تدبیر یہ کی گئی کہ علاقہ کے نوجوانوں کا جمعیت طلبا اسلام کے نام پر یونٹ قائم کر دیا گیا یہ لڑکے وہی تھے جو فجر کے بعد درسِ قرآن اور جو فجر میں نہیں پہنچ سکتے تھے ان کے لیے نمازِ عصر کے بعد درسِ قرآن اور نمازِ عشاء کے بعد شمس الدین ذہبیؒ کی ''الطب النبوی'' اور نور الایضاح کے درس، ترمذی اور ہدایہ کے طرز پہ ہوتے تھے۔ پروفیسر مزمل حسن، مولانا سید صبا مرحوم، ڈاکٹر مدثر اور ڈاکٹر ہمایوں وغیرہ اس وقت کے گوہر آبدار ہیں۔ نوجوانوں کی اصلاح اور تربیت کے لیے

کہ اکیڈمی کا قیام حضرت مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ اور دیگر ساتھیوں کے مشورے سے ۱۴/ جون ۱۹۹۸ء کو کراچی میں عمل میں آیا۔

مولانا فضل الرحمان صاحب سرپرست، مفتی نظام الدین شامزئیؒ نگران، جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری چیئرمین اور یہ ناکارہ بہ طور مینیجنگ ڈائریکٹر جب کہ برادر عزیز مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ اور عزیزی الطاف حسین موتی علی الترتیب ڈائریکٹر پبلی کیشنز اور ڈائریکٹر فنانس منتخب کیے گئے۔

میرے اور اراکین اکیڈمی کے لیے اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہمارے بیش قیمت، مرجع خلائق اور اکیڈمی کی جان حضرت مفتی نظام الدین شامزئیؒ اور مفتی محمد جمیل خانؒ صاحب چھ ماہ کی قلیل مدت میں مقامِ شہادت پر فائز ہوگئے اور یہ ناتواں ادارہ آج تک اپنے عالی مقام اور ذی مرتبت عہدیداروں کے فراق سے نڈھال اور نیم جان ہے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

حضرت مفتی صاحب نے دونوں احباب کی آمد کا مقصد بیان کیا کہ بنوں میں ۱۹۹۶ء میں مفکر اسلام مولانا مفتی محمود علیہ الرحمہ کی یاد میں ایک ادارہ قایم کیا گیا اور وہاں پر ایک عظیم سمپوزیم بہ یاد مفتی محمودؒ منعقد کیا گیا جس میں ملک بھر کے علمائے کرام اور دانش وروں نے اپنے خطاب و مقالات کے ذریعہ حضرت مفتی محمود علیہ الرحمہ کو خراج عقیدت پیش کیا چوں کہ اب حضرت مفتی صاحب سے موسوم اکیڈمی کراچی میں قایم ہوگئی ہے اس لیے بنوں کے دوستوں نے کمالِ اخلاص وایثار کے جذبہ سے معمور ہوکر اپنے ادارہ کو مفتی محمود اکیڈمی میں ضم کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور سمپوزیم کے تمام مقالات وخطبات اکیڈمی کے حوالے کرنے کے لیے طویل سفر اختیار کیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے مفتی صاحب نے کاغذات کا بنڈل میرے حوالے کیا۔ یہی مقالات و خطبات کا اصل مجموعہ تھا۔

میں اپنے دوستوں کے ایثار واخلاص سے متاثر ہی نہیں خجالت محسوس کر رہا تھا کہ کہاں یہ اہل علم اور کہاں مجھ سا ناکارہ؟

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی!

مفتی محمود سمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہوا تھا جس میں جید علمائے کرام، قومی زعما اور اہل قلم نے شرکت کی تھی۔ کراچی سے مخدوم ومکرم ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ (علامہ بنوری ٹاؤن)، مکرمی ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ اور اس خاکسار کو شرکت کرنا تھی، پروگرام طے تھا۔ یہ ناکارہ اپنا مقالہ لے کر محترمی ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر مدظلہٗ کے پاس جامعہ پہنچا کہ وہیں سے ائرپورٹ کے لیے شام کو روانہ ہونا تھا۔ غالباً شام پانچ بجے کراچی سے پشاور کے لیے فلائی کرنا تھا جب کہ پشاور سے بنوں تک سمپوزیم کے منتظمین نے گاڑی کا اہتمام کیا ہوا تھا لیکن شومئ قسمت حضرت مفتی نظام الدین شامزئیؒ کسی ہنگامی پروگرام کے تحت حب چوکی چلے گئے ہم دونوں ان کی راہ تکتے رہے تا آنکہ فلائٹ کا وقت گزر گیا اور یوں ہم تینوں میں سے کوئی بھی نہ جاسکا۔

ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر مدظلہٗ اور اس ناکارہ نے اپنے مقالات بذریعہ ڈاک بھیج دیئے تھے اس لیے وہ دونوں اس سمپوزیم کی کارروائی کا حصہ ہیں اور اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔

''مشاہدات وتاثرات'' کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کا قیمتی مقالہ شامل کتاب ہے لیکن اس میں سے دو ایک واقعات حذف کردیئے ہیں کیوں کہ جیسا کہ قارئین بہ خوبی آگاہ ہیں کہ اکیڈمی کی پہلی کتاب ''مفتی محمود ایک قومی راہنما'' میں ڈاکٹر صاحب کا خطاب شامل ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف کے خطاب اور مذکورہ مقالے میں کہیں تکرار محسوس ہوئی تو معمولی ترمیم وتنسیخ سے کام لیا گیا ہے لیکن اس طرح کہ مقالے کے حسن اور اس کی سج دھج میں کوئی فرق نہیں پڑنے دیا۔ کیوں کہ ایک ہی

شخصیت کے بارے میں مختلف مواقع پر گفتگو کرتے ہوئے واقعات کی تکرار فطری امر ہے۔

خاکسار کا مقالہ ''داعیٔ اتحادِ ملی'' اسی طرح ہے اس میں کسی قطع و برید کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ عجیب اتفاق کہ جس وقت سمپوزیم کی کارروائی کا مسودہ ہمیں ملا اس وقت ہم کراچی میں ''مفتی محمود ایک قومی راہنما'' کے عنوان سے سیمنار کے انتظامات میں مصروف تھے یا فارغ ہو چکے تھے اور اس کے مقالات و خطبات کی ترتیب و اشاعت کے اہتمام کا مرحلہ درپیش تھا اس لیے بنوں سمپوزیم کے مقالات کی اشاعت کا معاملہ مؤخر ہو گیا۔ وقتی التوا کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مقالات جس حالت میں ملے تھے ان کی ترتیب و تدوین اور ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت بھی تھی۔ اس سے پہلے کہ تدوین و نظرِ ثانی کا کام شروع کیا جائے اس ناکارہ کو اچانک ایسے مرض نے آگھیرا کہ قلم و قرطاس سے تعلق برقرار نہ رہ سکا اور کئی برس اسی حالت میں گزر گئے۔

تک تک ویدم دم نہ کشیدم

''مفتی محمود ایک قومی راہنما'' اکتوبر ۱۹۹۹ء میں جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور کے تعاون سے شائع ہو سکی۔ جس کے ماشاءاللہ دو ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں اور تیسرا زیرِ طبع ہے۔

۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء میں عالم اسلام کی عظیم شخصیت اور مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سانحۂ ارتحال نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

فروری ۲۰۰۰ء میں ایک تعزیتی سیمنار بہ یادِ علی میاںؒ تھیوسوفیکل ہال کراچی میں منعقد کیا گیا۔ جس کے مقالات و خطبات ''علی میاں'' کے نام سے ۲۰۰۲ء میں عزیزم حافظ محمد ریاض درانی کے تعاون سے انتہائی خوب صورت انداز میں شائع کیے گئے۔ اس طرح مذکورہ سمپوزیم کے مقالات کی تدوین و اشاعت میں مزید تاخیر ہو گئی۔ ہم اپنے بنوں کے احباب کے سامنے شرمندہ ہیں لیکن ان کی عظمت اور کمالِ تحمل کا اندازہ فرمائیں کہ آج تک ہم ان کی طرف سے حرفِ شکایت سے ناآشنا ہیں۔ ان

کے حسنِ عمل اور عالی ظرفی پر احسان دانش کا شعر یاد آتا ہے۔

وہ کہ میری ہر خطا پر درگذر کرتے رہے
میں کہ ان کے ہر کرم پر منفعل ہوتا گیا

بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ سمپوزیم کے مقالات کی کمپوزنگ کے دوران عزیزی مولانا قطب الدین عابد نے حضرت مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کی حیات ہی میں ان کے خطبات جمع کر دیے۔ اکیڈمی کے نگران کے خطبات کو اکیڈمی کی طرف سے شائع کرنا ایک خوش گوار عمل تھا سو اس میں ہم نے کوئی کوتاہی نہیں کی اور اس مجموعہ کو ''خطبات شامزئی'' کے نام سے شائع کر دیا گیا۔

خرابیٔ صحت کا عمل اور اکیڈمی کے منصوبے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مفکرِ اسلام مولانا مفتی محمود علیہ الرحمہ کے تمام خطبات اور انٹرویوز (مشافہات) کو جمع کرنے کا اہتمام جاری رہا۔

انٹرویوز تو تقریباً تمام جن کی تعداد اکیس تک ہے، جمع ہو گئے لیکن خطبات (1) تاحال تقریباً چالیس میسر آسکے ہیں مزید کے لیے کوششیں جاری ہیں انٹرویوز کو عزیزم

(1) قارئین کرام سے گذارش کرنا چاہوں گا کہ اگر ان کے یا ان سے متعلق کسی دوست، ساتھی یا عزیز کے پاس مفکرِ اسلام مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی کوئی تقریر، تحریر یا کسی بھی قسم کا کوئی واقعہ مرتب یا ذہن میں ہو تو اس کو نقل کر کے اکیڈمی کو عاریتاً عنایت فرما دیں تاکہ افادۂ عام کے لیے اس کو محفوظ اور اس کی اشاعت کا اہتمام کیا جا سکے اس کے علاوہ الحمدللہ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی شخصیت اور کردار کے دیگر پہلوؤں پر کام ہو رہا ہے۔ اگرچہ کام میں قدرے تساہل اور تاخیر کا عنصر غالب ہے اور بہ ظاہر کوئی مستعدی اور بھرپور انداز نظر نہیں آتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اکیڈیمک مراحل بہ تدریج اور دھیمے انداز میں ہوتے ہیں اور خاص طور پر ایسے اداروں کے کام جو پروفیشنل ازم اور مختلف قسم کی امداد و تعاون سے الگ ہوں۔ یہ صرف عقیدت و محبت کا کھیل ہے کاروبار نہیں اس لیے محبت کا رچاؤ اور عقیدت کے رساؤ کی آنچ مدھم ہوتی ہے شعلۂ مستعجل نہیں۔

مولانا قطب الدین نے مرتب کردیا تو ایک بار پھر نوجوان ساتھی کی حوصلہ افزائی کا مرحلہ درپیش تھا اس لیے ان کی کاوش جو وقت کی ایک اہم ضرورت بھی تھی کو اولیت دیتے ہوئے ''مفتی محمود سے ملیے'' کے نام سے شائع کردیا گیا۔

یہ تاریخی امانت جو اذکار محمودؒ کا خزینہ ہے اور ساڑھے پانچ سو صفحات پر محیط ہے دسمبر ۲۰۰۴ء میں اکیڈمی کی جانب سے شائع کردی گئی ہے۔ سیمپوزیم کے مسودے کی کمپوزنگ ہو چکی، اغلاط کی تصحیح کا کام بھی ایک حد تک مکمل ہو گیا جون ۲۰۰۴ء تک کتاب شائع کرنے کا پروگرام طے تھا کہ اچانک حضرت مفتی نظام الدین شامزئی کی شہادت کے حادثہ فاجعہ نے حالات کو دگرگوں کردیا اور اس حادثہ شہادت نے ہمارے ہوش اڑادیے۔

ان کی شہادت محض جامعۃ العلوم الاسلامیہ یا صرف کراچی اور پاکستان کا المیہ نہیں بلکہ عالم اسلام کا المیہ ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قدر ومنزلت کا ملت کے ایک ایک فرد کو احساس ہوتا چلا جائے گا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت مفتی صاحب کی شہادت سے مفتی محمود اکیڈمی بے آسرا ہوگئی۔ ۲۲؍ اگست ۲۰۰۴ء کو حضرت مفتی صاحب کی یاد میں ایک سیمینار ہوٹل ریجنٹ پلازہ کراچی اور ۲۹؍ اگست کو الحمرا لاہور میں منعقد کیا گیا۔ جس میں ملک کی نامور شخصیات کے علاوہ مفتی محمود اکیڈمی کے سرپرست حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب نے بہ طور خاص شرکت کی۔ ابھی ان سیمیناروں کی صدائے بازگشت جاری تھی کہ قوم کو دوسرے صدمے نے نڈھال کردیا یعنی ہمارے محبوب اور ہردل عزیز ساتھی مفتی محمد جمیل خان ۹؍ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو کراچی میں اپنے گھر کے دروازے پر دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر منصب شہادت سے سرفراز ہوگئے اور یہ مفتی محمود اکیڈمی کے لیے دوسرا جان گسل صدمہ تھا۔

مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ بہت سے افراد اور اداروں کے لیے بہت کچھ تھے۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ وہ مسلک حقہ کی جان تھے۔

ان کو مفتی محمود نوراللہ مرقدہٗ سے عقیدت ومحبت زمانۂ طالب علمی سے ودیعت ہوئی تھی اور یہ عقیدت ان کے رگ وریشے میں رچ بس گئی تھی۔ اس ناکارہ سے تعلق ۱۹۷۲ء سے تھا اور تمام گرم وسرد حالات سے بے نیاز ان کے وجود میں محبت کے سوا کچھ نہیں تھا، ہم تو خیر ان کے ہمدم دیرینہ تھے وہ تو اپنے دشمن کے بھی بدخواہ نہیں تھے۔

علما کی خدمت، اکابر کی محبت اور مسلک حقہ کی ترویج واشاعت ان کی زندگی کے ارکانِ ثلاثہ تھے۔ میری ان سے نظریاتی ہم آہنگی تو تھی ہی لیکن حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے عقیدت ومحبت ہماری نمایاں قدر مشترک تھی۔

مسلک حقہ کا نقصان جس قدر ان کی شہادت سے ہوا ہے وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ مفتی محمود اکیڈمی کے وہ روحِ رواں تھے ان کی موجودگی میں ہم بے فکر تھے اور اب وہ نہیں تو ہر سو اندھیرا نظر آرہا ہے۔

زیر نظر کتاب کل تیرہ مقالات پر مشتمل ہے۔

مکرم ومحترم ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر مدظلہٗ مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن جو محدثِ کبیر علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے مسند نشین ہیں اور مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کی میزبانی کا لطف بیشتر بار اٹھا چکے ہیں۔ انھوں نے سفر وحضر میں حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور ''مشاہدات و تاثرات'' کے عنوان سے اپنے احساسات کو قلم بند کیا ہے یہ مقالہ قارئین کے لیے تحفۂ خاص ہے۔

حضرت مولانا نور محمد صاحب دامت برکاتہم جو دارالعلوم وزیرستان وانا کے مہتمم ہیں موصوف جامعہ قاسم العلوم ملتان میں زیر تعلیم اور حضرت مفتی صاحبؒ کے خصوصی شاگرد رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے مربی اور مشفق استاذ سے متعلق واقعات کو ''مفتی محمود کی یادیں'' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ مولانا موصوف نے انتہائی محنت

اور محبت سے اپنی یادوں کو قلم بند کیا ہے۔ لیکن ایک دو واقعات کتاب کے مزاج اور طوالت کی بنا پر حذف کر دیئے ہیں اس کے باوجود ان کے مضمون کے مطالب نہایت مفید اور دل چسپ ہیں۔ مولانا نور محمد صاحب نے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے اپنی آخری ملاقات کا دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے جو ہری پور جیل میں ہوئی۔ مولانا کے بہ قول

"الوداع کرتے ہوئے میں نے حضرت کے ہاتھ میں دو سو روپے تھما کر عرض کیا کہ یہ احباب کی چائے ہے مگر مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے رقم واپس کر دی اور فرمایا کہ "انھیں کیوں شرمندہ کرتے ہو۔"

درج بالا واقعہ اگر چہ بہ ظاہر معمولی سی بات ہے لیکن اس معمولی سے واقعہ سے حضرت مفتی صاحب کے کردار کی عظمت کے نقوش اُجاگر ہوتے ہیں جو ہم ایسے کوتاہ عمل لوگوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

یہ واقعہ ۱۹۷۷ء کا ہے جب جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے موقعہ پر حضرت مفتی صاحب کو ہری پور جیل میں پابند سلاسل کیا گیا تھا۔ راقم السطور بھی اپنے مرحوم دوست مولانا سعید الرحمان علوی کے ہمراہ حضرت سے ملاقات کے لیے ہری پور جیل گیا تھا۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ جو ۱۹۷۰ء کا ہے آج بھی میرے پردۂ ذہن پر نقش ہے۔

جمعیۃ المسلمین خانیوال کے زیر اہتمام ایک بڑے جلسہ عام سے حضرت مفتی صاحب کا خطاب تھا غالباً سرمایہ دارانہ نظام، سوشل ازم اور اسلام کے موضوع پر حضرت مفتی صاحب کی انتہائی ایمان افروز تقریر جاری تھی کہ ایک تنظیم کے کچھ لوگوں نے جلسہ میں گڑبڑ کرنا چاہی لیکن انہیں منہ کی کھانا پڑی۔ جلسہ کے اختتام پر منتظم جلسہ جناب اکرام القادری صاحب اور یہ خاکسار حضرت مفتی صاحب کو موجود نہ پا کر ان کی تلاش میں دوڑتے ہوئے بس اڈے پر پہنچے تو دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب ملتان جانے والی بس میں ڈرائیور کی عقبی نشست پر تشریف فرما ہیں۔

ہم نے ہاتھ ملا کر حضرت مفتی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور محترم اکرام القادری

صاحب نے ۳۰ روپے ہاتھ ملاتے ہوئے مفتی صاحب کو دینا چاہے مگر مفتی صاحب نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کیا "کرایہ" فرمایا "اس کی ضرورت نہیں یہی کافی ہے کہ آپ کا جلسہ کامیاب رہا آپ جلسہ گاہ میں جا کر اپنا کام مکمل کریں میری فکر نہ کریں۔" آج بھی اس واقعہ کا خیال آتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہے۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

اپنے عظیم اسلاف کرام کے اسوہ کے بارے میں کتابوں میں دیکھا اور بزرگوں سے سنا ہے لیکن حضرت مفتی صاحب کی عظمتِ کردار کے تابندہ نقوش تو ہماری آنکھوں کے سامنے جا بہ جا بکھرے پڑے ہیں۔ افسوس! کہ ایسے کردار کے حامل علما اور قومی رہنما ایک ایک کر کے عازم آخرت ہوتے جا رہے ہیں۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مفکر اسلام مولانا مفتی محمود صاحب جامعہ قاسم العلوم ملتان کے شیخ الحدیث اور مہتمم رہے ہیں اس لیے مذکورہ مدرسہ کے مدرس اور طلبا حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے بارے میں معلومات کا قلزم ہیں۔ اسی جامعہ کے فاضل مولانا منظور احمد صاحب نے "مفتی محمود کی جامع علمی شخصیت" کے عنوان سے انتہائی جامع مضمون تحریر کیا ہے جو تقریباً ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ مضمون جہاں مولانا موصوف کی حضرت مفتی صاحب سے عقیدت و تعلق کا مظہر ہے وہاں جامعہ کے دیگر اساتذہ و طلبا کے لیے مہمیز بھی ہے کہ وہ بھی حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ سے متعلق یاداشتوں کو مختلف عنادین کے تحت قلم بند کریں تا کہ امت اس صدی کے عظیم مفکر کے خیالات و افکار سے مستفید ہو سکے۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب علم و تحقیق اور سیاسی، دینی حلقوں کا معروف و معتبر نام ہے اور کیوں نہ ہو کہ

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ جمعیت علماء اسلام پاکستان کے مرکزی ناظم

عمومی تھے تو محترمی راشدی صاحب جمعیت کے مرکزی ناظم نشرواشاعت کی ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی پوری کررہے تھے۔محترم ڈاکٹر احمد حسین کمال مرحوم کے بعد اور جناب اکرام القادری صاحب سے قبل جمعیت کا آرگن ہفت روزہ ''ترجمان اسلام'' لاہوران کی زیرادارت قوم کی سیاسی وفکری راہنمائی کرتا رہا ہے۔

موصوف شاہ سوار علم ہی نہیں قلم کے بھی دھنی ہیں۔جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں حق ادا کردیتے ہیں۔

آج کل ماہ نامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ ان کی قلمی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔مولانا موصوف نے حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی شخصیت کا بہ حیثیت ایک سیاسی قائد جائزہ پیش کیا ہے۔اگرچہ مضمون بہت مختصر ہے (۸ صفحات) اور قاری کو تشنگی محسوس ہوگی کہ وہ اس موضوع پر بڑے شرح وبسط کے ساتھ لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کے ایجاز واختصار کا یہ انداز بھی دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے۔

قارئین محترم! اس بات سے تو ملک کا ہر شخص واقف ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان سے تھا اس لیے اس تاریخی شہر میں حضرت مفتی صاحب کے محبین ومخلصین کی کثیر تعداد موجود ہے۔

یوں تو اس شہر کے فدائین کا ایک ایک ساتھی ''جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے'' کا مصداق ہے لیکن جناب ابو معاویہ خواجہ محمد زاہد کا نام ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔خواجہ صاحب جمعیت علما اسلام کے ''غلام اسحاق خان'' ہیں کہ ایک معمولی کارکن سے مرکزی سطح کے اہم عہدوں پر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں جمعیت کے عام کارکن سے لے کر مرکزی امیر تک کا اعتماد انتہائی سلیقہ سے سنبھالے ہوئے ہیں۔خواجہ صاحب جمعیت علما اسلام اور مولانا مفتی محمود صاحبؒ کے سیاسی روز وشب کا آئینہ ہیں۔

خواجہ صاحب نے ''سیاسی جدوجہد پر ایک نظر'' کے عنوان سے اپنی یادداشتوں کو محفوظ کیا ہے جو قارئین کے لیے معلومات کا خزینہ ثابت ہوگا اگرچہ خواجہ صاحب کا

مضمون خاصا طویل ہے اور ان کی یادداشتیں بیش وکم ۳۶ صفحات پر پھیل گئی ہیں۔انھیں دیکھتے ہوئے دریچۂ ذہن سے خاصے واقعات از خود صدا دینے لگتے ہیں۔مثلاً انھوں نے جمعیت علما اسلام پاکستان کی پہلی آئین شریعت کانفرنس کا تذکرہ کیا تو خیال آیا کہ اس میں کچھ تشنگی ہے اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ قارئین خصوصاً نسل نو کی معلومات اور تاریخ کے ریکارڈ کی درستگی کے لیے ایک اہم واقعہ کی طرف توجہ دلاؤں۔یہ تاریخی کانفرنس ۳، ۴، ۵ رمئی ۱۹۶۸ء کو باغ بیرون موچی دروازہ لاہور کے تاریخی میدان میں منعقد ہوئی تھی۔راقم اس وقت فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا اور بحمد اللہ اس کانفرنس کے تمام پروگراموں میں شرکت کی سعادت کا اعزاز رکھتا ہے۔

کانفرنس کے آخری روز یعنی ۵ رمئی ۱۹۶۸ء کی شام جمعیت کی طرف سے احتجاجی جلوس نکالنے کا پروگرام تھا جب کہ بعد از عشا جلسہ عام ہر روز کے پروگرام میں شامل تھا لیکن تیسرے روز آخری پروگرام کے طور پر جلسہ عام کا بہت بڑا اہتمام کیا گیا تھا موچی دروازہ کے میدان میں پورے ملک سے آئے ہوئے وابستگان جمعیت کے لیے ہر شہر کی بنیاد پر خیمے ایستادہ تھے۔دوپہر کو اچانک خیمہ درخیمہ یہ خبر پھیل گئی کہ رات کے جلسہ عام میں اکابرین جمعیت کے علاوہ ملک کے معروف صحافی وخطیب جناب آغا شورش کاشمیری صاحب بھی خطاب کریں گے۔اس خبر سے ہر شخص لذت اور خوشی محسوس کررہا تھا۔

حسب پروگرام بزرگان امت کی رہنمائی میں علما وطلبا اور کارکنوں کا ایوب آمریت کے خاتمہ، جمہوریت کی بحالی اور اسلامی نظام کی تنفیذ کے مطالبہ کے لیے پاکستان کی سیاسی تاریخ کا پہلا احتجاجی جلوس ترتیب دیا گیا۔

جس میں ملک کے چاروں صوبوں سے آئے ہوئے وقت کے صلحا، اتقیا، علما و طلبا اور سیاسی کارکن ہزاروں کی تعداد میں شامل تھے۔شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے خلیفہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب آف چکوال، حضرت مولانا گل بادشاہ صاحب آف پشاور اور دیگر سیکڑوں اولیائے کرام وعلماء عظام

کوعوام الناس کے ساتھ لاہور کی سڑکوں پر چشمِ فلک کی طرح میں نے بھی پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ یہ لوگ اللہ کی حاکمیت اور اس کی مخلوق کی فلاح کے لیے سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔

جلوس شہر کی شاہراہوں سے گزرتا ہوا نمازِ مغرب سے قبل جب میکلوڈ روڈ پر پہنچا تو لکشمی چوک سے ذرا پہلے دفتر چٹان کے نیچے سڑک پر کھڑے وقت کے مشہور صاحب طرز خطیب و انشا پرواز جناب آغا شورش کاشمیری جناب صادق کاشمیری اور ہفت روزہ چٹان کے اسٹاف کے ساتھ جلوس کا خیر مقدم کرتے ہوئے گل پاشی کر رہے تھے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ کچھ عرصہ سے آغا صاحب اور اکابر جمعیت کے درمیان تعلقات قابل رشک نہ تھے تاہم نظریاتی وفکری بنیادیں ایک ہونے کے باعث دونوں میں ایک دوسرے کے لیے فطری کشش موجود تھی۔

آغا صاحب کی موجودگی سے جلوس کے شرکا کا جذباتی تموج قابل دید تھا۔

جمعیت کے فدائین ابوالکلامؒ و حسین احمد مدنیؒ کے سپاہی اور امیر شریعتؒ کے چہیتے کو دیکھ کر اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکے نعرہ ہائے تکبیر سے لاہور کے در و بام لرزنے لگے۔ اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا جب اسٹیج وقت کے عظیم صلحا و علما اور قومی راہنماؤں سے آراستہ ہوا۔ اسٹیج اپنے دور کے جنیدؒ و شبلیؒ ہی سے مزین نہ تھا بلکہ عصر حاضر کا سب سے بڑا خطیب، ادیب و شاعر اور بطل حریت بھی شریک کارواں تھا۔

جلسۂ عام میں آغا صاحب نے تقریر کیا کی کہ ایک طوفان بپا کر دیا پورا مجمع ان کی مٹھی میں تھا۔ ان کے دہن سے پھول جھڑتے یا یک لخت شعلہ باری شروع ہو جاتی گویا پورا جلسہ ان کے ہاتھ کی چھڑی بن کر رہ گیا تھا۔

بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایسی تقریر اس سے قبل نہیں سنی تھی اور اس کے بعد بھی تادم تحریر اسی کی لذت سے شاد کام ہوں پھر کوئی دوسری تقریر یا خطاب اس پائے کا نہ سن سکا۔ آغا صاحب کو دیکھنے اور سننے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو مجھے مبہوت کر گیا اگر چہ

اس کے بعد بھی آغا صاحب مرحوم کو کئی بار سنا مگر وہ بات محسوس نہ ہوئی۔ آغا صاحب مرحوم نے اپنے اسٹائلش اور پرجوش خطاب میں صدر ایوب خان، گورنر مغربی پاکستان جنرل موسیٰ خان اور مرکزی وزیر اطلاعات احمد سعید کرمانی کو خاص موضوع بنایا اور جوشِ خطابت میں وہ کچھ کہہ گئے کہ جس کی ہمت صرف وہی کر سکتے تھے۔

جمعیت علما اسلام کے اکابر علما کا طرز اپنے مقام و منصب کے مطابق ہوتا ہے جب کہ آغا صاحب مرحوم ایسے کسی ضابطے کے پابند نہیں تھے۔

درج بالا واقعہ کی تفصیل بیان کرنے کا مقصد ایک اہم مسئلہ کی نشاندہی ہے، جس سے قصداً یا سہواً برادرم خواجہ محمد زاہد صاحب نے پہلوتہی کی ہے، وہ یہ کہ جلسہ کے بعد آغا صاحب کے خلاف مقدمہ درج ہوا اور ازاں بعد انھیں گرفتار کر لیا گیا۔

جمعیت علما اسلام نے ان کی گرفتاری کی مذمت کی اور صوبائی ناظم حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے وضاحتی بیان جاری کیا کہ آغا صاحب کی تقریر کا جمعیت علما اسلام کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں۔ مولانا ہزاروی صاحب کا بیان اگرچہ جمعیت کا پالیسی بیان تھا۔ لیکن ان کے بیان نے گویا جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔

مولانا غلام غوث ہزاروی جمعیت علما اسلام مغربی پاکستان کے ناظم کے اہم عہدے پر فائز تھے، ان کا شمار جمعیت کے مرکزی اور سرکردہ اہم راہنماؤں میں ہوتا تھا۔ جمعیت سے متعلق پالیسی بیان دینا ان کی ذمہ داری تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ آغا صاحب کا جمعیت علما اسلام کے جماعتی نظم سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے واقعاتی طور پر مولانا غلام غوث ہزاروی اپنے بیان میں حق بجانب تھے اور پھر جناب آغا صاحب نے محض جمعیت کی پالیسی کے خط و خال کے مطابق تقریر نہیں کی بلکہ ان کا خطاب آزادانہ رنگ لیے ہوئے ایک فری اسٹائل کشتی کی مانند تھا جس میں حسب خواہش اپنے داؤ پیچ آزماتے اور اپنے مخالفین کو اڑنگے پر لا کر چاروں شانے چت کرتے رہے ظاہر ہے اس کی تمام تر ذمہ داری بھی ان کے ہی دوش پر تھی لیکن مولانا غلام غوث رحمہ اللہ کے بیان پر وہ سیخ پا ہو گئے ان کے دل میں یہ گرہ لگ گئی کہ

جمعیت کے علما نے مجھ سے پیٹھ موڑ لی۔ بعض خفیہ ہاتھوں نے اس ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آغا صاحب کا گھیراؤ کر کے ان کو جمعیت کے اکابر کے بارے میں مسلسل بدگمان کیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ آغا صاحب اور جمعیت علما اسلام کے درمیان فاصلے بڑھتے چلے گئے اس سے زیادہ تفصیل کا یہ محل نہیں۔

آغا صاحب کے آخری دور میں جب وہ امراض کی پوٹ بن گئے تھے، مدیر ''لولاک''، فیصل آباد مولانا تاج محمود صاحب رحمہ اللہ نے ان کے اور حضرت مفتی صاحب کے درمیان پل بننے کی کوشش کی اور باہمی مصالحت کرانا چاہی لیکن حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

> ''میں نے رب العزت سے دعا کی ہے کہ میری وجہ سے کسی کا مواخذہ نہ کرے۔ میں نے اپنے تمام مخالفین و معاندین کو معاف کر دیا ہے اس لیے آغا صاحب کے لیے میرے دل میں کوئی غبار نہیں ہے لیکن جہاں تک دوستی کا معاملہ ہے تو میں اس باب میں آزاد ہوں کہ کسی سے دوستی کروں یا نہ کروں۔''

حسن اتفاق ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو جب آغا صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو جمعیت علما اسلام کی آئین شریعت کانفرنس جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ میں منعقد ہو رہی تھی۔ جمعیت کی مرکزی شوریٰ کا اجلاس جاری تھا کہ اچانک خبر آئی کہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد خطابت کا دوسرا باب بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اور حضرت مفتی صاحب سے نماز جنازہ کی درخواست کی گئی۔

حضرت مفتی صاحب فوری لاہور پہنچے اور ناصر باغ لاہور کے تاریخی میدان میں اپنے دور کے عظیم خطیب و ادیب کی نماز پڑھائی۔

یہ کہاں تھی اپنی قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یونہی انتظار ہوتا

خواجہ صاحب کے مضمون میں ایک دوسرے واقعہ کا بھی تذکرہ ہے یعنی جمعیت علما اسلام پاکستان کی طرف سے ''یوم نفاذ اسلام'' جو ۲۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء بہ مطابق ۲۹ر رمضان المبارک بروز جمعہ کو منایا گیا۔ اس موقعہ پر ملک بھر میں احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ لاہور کے جلوس سے متعلق خواجہ صاحب رقم طراز ہیں:

> ''لاہور میں حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحبؒ امیر جمعیت علما اسلام مغربی پاکستان کی زیر قیادت جلوس کا پروگرام تھا نماز جمعہ کے بعد بیرون شیرانوالہ گیٹ جلوس کی صفیں ابھی ٹھیک طور پر مرتب نہ ہوئی تھیں کہ عقل کی اندھی پولیس لٹھ لے کر لوگوں کو بے تحاشا پیٹنے لگی اور بدبخت ڈی ایس پی چیمہ نے بذات خود مولانا کو زد و کوب کیا مولانا پر اس قدر تشدد ہوا کہ وہ البرٹ وکٹری ہسپتال لاہور (Albert Victory Hospital) میں تین روز تک بے ہوش رہے حتیٰ کہ عید الفطر کی نماز بھی بے ہوشی کی وجہ سے ادا نہ کر سکے۔''

قارئین کرام! درج بالا دل خراش واقعہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا! حضرت مولانا عبید اللہ انور علیہ الرحمہ کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے فلسفہ کے عظیم شارح، جید عالم دین اور وقت کے شیخ طریقت ہی نہیں بلکہ جمعیت کے امیر اول، ولی کامل، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے خلف اکبر و جانشین صادق تھے۔ وہ جمعیت علما اسلام مغربی پاکستان اور از اں بعد جمعیت علما اسلام پنجاب کے تا دم آخر امیر رہے۔ انھوں نے ایسے پرخطر مواقع پر بھی رخصت پر عمل نہیں کیا بلکہ ہمیشہ عزیمت کی راہ اپنائی۔ ان کی ہمت مردانہ اور فراست مومنانہ کے بعض واقعات کا یہ ناکارہ بھی چشم دید گواہ ہے۔

لاہور کے واقعہ کے بعد جب تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوا تو ہم حسب سابق تمام احباب شرکت کے لیے بڑے ذوق و اہتمام سے رائے ونڈ پہنچے اور تبلیغی خطبات بڑی دل جمعی کے ساتھ سنے لیکن جب بہاول پور کے ایک عالم نے اپنے

خطاب کے دوران بڑے طمطراق اور استہزائی انداز سے یہ کہا:

''جھنڈے اٹھا کر سڑکوں پر نکلتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اسلامی نظام نافذ کریں گے۔ تم کون ہوتے ہو، خدائی دعویٰ کرنے والے؟ دیکھا پھر کیا نتیجہ ہوا خدائی دعویٰ کرنے کا؟؟ ڈنڈے پڑے.....................''

میں عالم حیرت میں ڈوبا سوچ رہا تھا کہ یا خدا میں تو رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع میں آیا تھا۔ کہاں پہنچ گیا ہوں؟ دل میں خیال آیا کہ ہوسکتا ہے موصوف کو وقتی طور پر کوئی مغالطہ ہوگیا ہو لیکن شنید ہے کہ بہت بعد میں آں جناب نے نواب شاہ کے اجتماع میں بھی ایسی ہی گوہر افشانی فرمائی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ اس نوع کا ذاتی ذوق رکھتے ہیں جس کا تبلیغی جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔

ہم بہ صدقِ دل یقین رکھتے ہیں کہ تبلیغی جماعت عام مسلمانوں کی ابتدائی تربیت کے لیے نرسری کا درجہ رکھتی ہے اور بہت اہم اور بنیادی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس کو بہر طور میدان میں رہنا چاہیے لیکن کیا جماعت کے ارباب حل وعقد اس قسم کے حضرات کے طرز گفتگو اور اس کے اثرات کی طرف متوجہ ہوسکیں گے؟

مولانا محمد ضیاء القاسمی صاحب مرحوم اپنے دور کے نامور صاحب طرز خطیب رہے ہیں خصوصاً پنجاب میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ان کا نام کسی بھی جلسہ کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے توحید وسنت پر مدلل تقاریر سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا بالآخر وہ پاکستان کے مصروف ترین اور مقبول عام خطیب بن گئے۔ ان سے پہلے ایسے طرز خطابت کا چلن نہیں تھا وہ اپنے لہجے اور اسٹائل کے خود موجد تھے انھوں نے بہت بڑے طبقے کو متاثر کیا۔ اس دور میں عام نوجوان علما اور واعظین ان کی نقالی ہی کو اپنی معراج خیال کرتے تھے۔ وہ بلاشبہ بے پناہ خوبیوں کے مالک اور اپنے دور کے لاثانی خطیب تھے۔ ان کا تعلق تو فیصل آباد سے تھا لیکن پنجاب کا چپہ چپہ ان کا دل دادہ وگرویدہ تھا۔

۱۹۷۰ء سے قبل جب عوام کا سیاسی ذوق نہیں تھا محض مذہبی اور مسلکی مسائل

کے عنوان سے جلسوں کا رواج تھا تو مولانا موصوف ہی ہر جلسے میں باعث رونق ہوا کرتے تھے۔

مولانا محمد ضیاء القاسمی صاحب نے مفتی محمود سمپوزیم کے لیے ''سرحد کے عالم دین وزیر اعلیٰ'' کے عنوان سے مقالہ لکھا جو شامل کتاب ہے۔ قارئین مستفید ہوں گے۔ تاہم مقالے کا ایک اقتباس ناقابل فہم ہے۔ قاسمی صاحب فرماتے ہیں:

''مفتی محمود جب ملتان میں جمعیت کے اجلاس میں شریک ہوئے تو وہ مجھے بھی چند رفقا کے ساتھ اجلاس میں لے گئے کہ آپ بھی میرے ساتھ ہی جمعیت میں شامل ہوں جمعیت کی تشکیل ہوگئی اور پھر ایک طویل عرصہ مفتی محمود کا ساتھ رہا۔''

درج بالا اقتباس کے مطالعہ سے قاری کے ذہن میں جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ قاسمی صاحب حضرت مفتی کے برابر کی شخصیت تھے اور دونوں میں بے تکلفی بھی تھی۔ اس لیے مفتی صاحب نے جمعیت میں شمولیت بھی قاسمی صاحب کے ہمراہ ہی ضروری سمجھی۔ قاسمی صاحب نے اپنے مضمون میں مفتی صاحب کا نام بصیغہ واحد استعمال کرکے اس تاثر کو مزید گہرا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا محمد ضیاء القاسمی صاحب کا مقام واحترام اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جامعہ قاسم العلوم ملتان کے طالب علم اور مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہٗ شیخ الحدیث تھے۔ اگر جمعیت کے اجلاس سے مراد ملتان کنونشن ہے تو اس کا سن انعقاد اکتوبر ۱۹۵۶ء ہے اس وقت مولانا قاسمی صاحب کی عمر عزیز محض ۱۹ سال تھی غالباً ان کا سن فراغ ۱۹۵۷ء ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ حالات وواقعات کی میزان پر موصوف کا یہ دعویٰ پورا نہیں اترتا۔

۱۹۷۲ء میں حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کے اختلاف کے موقعہ پر چند دیگر احباب کی طرح مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ صاحب بھی مولانا

غلام غوث ہزارویؒ کی حمایت ومحبت کا عنوان دے کر جمعیت سے علیحدہ ہوگئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہٗ اور مولانا غلام غوث ہزاروی علیہ الرحمہ کا اختلاف جسے عوام الناس دو اشخاص یا محض دو شخصیتوں کا اختلاف سمجھتے ہیں۔ محض دو اشخاص کا فکری اختلاف نہیں تھا بلکہ جمعیت علما اسلام پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلے سے مولانا غلام غوث ہزارویؒ کا اختلاف تھا اپریل ۱۹۷۲ء میں جمعیت علما اسلام پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ نے صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی سے مل کر حکومت بنانے کا فیصلہ کیا جب کہ مولانا غلام غوث ہزارویؒ پاکستان پیپلز پارٹی اور عبدالقیوم خان کی مسلم لیگ کے تعاون سے حکومت بنانے کے حامی تھے۔ مولانا مفتی محمود صاحب نیپ کے مقابلے میں پی پی اور قیوم لیگ کو ساقط الاعتبار سمجھتے تھے، دونوں بزرگوں نے اپنا اپنا مؤقف جمعیت کی مرکزی مجلسِ عاملہ اور مجلسِ شوریٰ میں اپنے اپنے دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا، حسن اتفاق کہ جمعیت کی اتھارٹی نے حضرت مفتی صاحب کے مؤقف کی تصویب کی جس پر مولانا ہزارویؒ جو اپنے مؤقف میں انتہائی مخلص تھے اس صورت حال کو گوارا نہ کر سکے اور جمعیت سے علیحدہ اپنا گروپ بنا کر حکومت سے تعاون کی پالیسی کے تحت اسلامی قوانین کے نفاذ کی مخلصانہ جدو جہد کرتے رہے۔

مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے مؤقف اور طریق سے ہر شخص اختلاف کرنے کا حق رکھتا ہے لیکن واقفان حال جانتے ہیں کہ اس مردِ مومن اور بطلِ حریت کے دل میں للّٰہیت اور اخلاص کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے بہت سے ایسے لوگوں کی جو جمعیت علما اسلام کی سامراج دشمن اور جابر سلطان کے سامنے اعلاء کلمۃ الحق کی سخت جان پالیسی پر گامزن رہنا اپنے حالات اور مزاج کے خلاف سمجھتے تھے کی مشکل آسان کردی۔ کہ انھوں نے موقعہ ملتے ہی مولانا ہزارویؒ کی حمایت کی چادر تان کر حکومت کی صفوں میں شامل ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔

ان لوگوں کے انفرادی احوال و واقعات کی تفصیل بے محل سہی لیکن غور طلب

بات یہ ہے کہ وجہ اختلاف کی حقیقت اور اس کا پس منظر کیا تھا اس ناکارہ نے یہ بات واضح کرنے کی کسی حد تک کوشش کی ہے بناء اختلاف یعنی نیپ جمعیت معاہدہ کیا تھا؟ اس سے قومی سیاست کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔ اس باب میں مولانا ضیاء القاسمی صاحبؒ کے الفاظ پیش خدمت ہیں۔

"ولی خان پارٹی کا کردار بھی کوئی زیادہ دوستانہ نہیں تھا، وہ بھی اس داؤ میں رہتے تھے کہ کام تو ان کے کارکنوں کا ہو اور بدنامی مفتی محمود اور جمعیت کے کھاتے میں آئے۔ مولانا غلام غوث ہزاروی اس لیے زیادہ دیر نیپ کے ہم نوا نہیں رہے اور بالآخر معاہدہ ختم ہوگیا اور مفتی محمود وزارت اعلیٰ سرحد کے منصب سے الگ ہوگئے اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔"

مولانا قاسمی صاحب کے مضمون کا اقتباس اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہے کہ معاہدہ صرف مولانا مفتی محمود نے نہیں بلکہ جمعیت کی قیادت نے جس میں مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب بھی شامل تھے کیا تھا۔

مولانا قاسمی صاحب کے درج بالا اقتباس سے جہاں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جمعیت نیپ معاہدہ جمعیت کا اجتماعی فیصلہ تھا وہاں دو باتیں مزید وضاحت طلب ہیں:

(۱) مولانا غلام غوث ہزاروی اس لیے زیادہ دیر نیپ کے ہم نوا نہیں رہے۔

(۲) بالآخر معاہدہ ختم ہوگیا اور مفتی محمود وزارت اعلیٰ سرحد کے منصب سے الگ ہوگئے اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

قارئین کرام! انتہائی افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ محترم مولانا ضیاء القاسمی صاحب کے خیال کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مولانا ہزاروی نیپ کی وعدہ خلافیوں اور بداعمالیوں کی بنا پر معاہدہ کے خلاف ہوگئے تھے حالاں کہ نیپ جمعیت معاہدہ کی مخالفت میں جب جمعیت کی ہائی کمان نے ان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے نیپ کے تعاون سے سرحد میں حکومت سازی

مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۱

مشاہدات وتاثرات

جانشین محدثِ کبیرؒ

مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر مدظلہٗ

رئیس جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

کی اور یکم مئی ۱۹۷۲ء کو مولانا مفتی محمود صاحب نے سرحد کے وزیر اعلیٰ کے طور پر حلف اٹھایا جس میں امتناع شراب کا تاریخی فیصلہ کیا گیا تھا اس تقریب میں جہاں پورے ملک سے جمعیت کے راہنما اور ارکان شامل تھے وہاں مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے اپنے مؤقف کے اختلاف کی بنا پر شرکت گوارا نہ کی۔

دوسرے جملے سے قارئین کے ذہن میں یہ التباس ہوسکتا ہے کہ جمعیت اور نیپ معاہدہ ختم ہونے کی بنا پر مفتی محمود نے حکومت سے علیحدگی اختیار کی۔ افسوس! صد افسوس! کہ واقعات کی ترتیب اس تاثر کی بھی نفی کرتی ہے۔

صورت حال یہ تھی کہ بھٹو مرحوم اور پی پی پی کی مرکزی حکومت صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جمعیت اور نیپ کی مخلوط حکومت سے نہ صرف یہ کہ خوش نہیں تھے بلکہ آئے روز ان کے لیے مشکلات پیدا کرنے کے لیے قومی وسائل کے بے جا تصرف کو معمول بنائے ہوئے تھے۔

مولانا مفتی محمود کو بھٹو مرحوم نے بہت سے مواقع پر نیپ سے علیحدہ ہو کر پیپلز پارٹی کے تعاون سے حکومت کی پیش کش کی لیکن انھوں نے ان کی پیش کش سے اتفاق نہیں کیا۔ بالآخر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے بلوچستان کی حکومت اور سرحد کے گورنر کو برخاست کر دیا۔ گویا مفتی محمود کو ''راہ راست'' پر لانے کے لیے یہ آخری سگنل تھا۔ لیکن مفتی محمود جس کی چمڑی میں خوف اور لالچ نام کی کوئی شے نہ تھی نے مرکزی حکومت کے جارحانہ اور آمرانہ اقدام پر بہ طور احتجاج صوبہ سرحد کی وزارت علیا سے استعفیٰ دیدیا۔ یہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔

حکومت سے استعفیٰ کے بعد بھی بھٹو مرحوم نے مفتی صاحب کو منانے کی کوشش کی لیکن مولانا مفتی محمود نے اس عمل کو معاہدہ کی خلاف ورزی سے تعبیر کرتے ہوئے مسترد کر دیا۔ گویا حکومت سے علیحدگی جمعیت نیپ معاہدہ کی باہمی خلاف ورزی کی بنا پر نہیں بلکہ مرکزی حکومت کی جارحیت کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ سہ فریقی معاہدہ جس کے تحت بلوچستان اور سرحد میں حکومت سازی کا عمل مکمل ہوا تھا وہ مذکورہ صوبوں

کی اکثریتی جماعتوں نیپ، جمعیت اور مرکزی حکومت کی نمائندہ پیپلز پارٹی کے درمیان ہوا تھا جس کے بارے میں قاسمی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''یہ سیاسی معاہدہ پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علما اسلام کے درمیان ہوا تھا۔ جمعیت علمائے اسلام کے قائدین اور سربرآوردہ شخصیات نے متفقہ طور پر کیا تھا۔''

مولانا قاسمی مرحوم مزید ارشاد فرماتے ہیں:

''مجھے اس وقت یہ شعور ملا کہ سیاسی معاہدوں میں عقائد و نظریات کا اتحاد مقصود نہیں ہوتا بلکہ سیاسی، دینی اہداف یا عوامی فلاح و بہبود کے تقاضے ملحوظ ہوتے ہیں جو کسی طرح بھی اسلامی اقدام سے متصادم نہیں ہوتے۔

ان معاہدوں میں نہ کوئی بکتا ہے اور نہ ہی اپنے عقائد تبدیل کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اپنا قبلہ الگ بناتا ہے۔

ایسے معاہدے سیرت النبی ﷺ میں بھی ملتے ہیں اور میثاق مدینہ ایک تاریخ ساز معاہدہ ہے جو یہود مدینہ کے ساتھ پیغمبر انقلاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تنگ نظر نقادوں اور نام نہاد مصلحین کو سیرت النبی ﷺ کے ان روشن پہلوؤں پر بھی نظر رکھنی چاہیے اور اندھادھند تنقید کی بجائے شعور و آگہی کے چراغ جلا کر حقائق تلاش کرنا چاہئیں۔''

ہم قاسمی صاحب مرحوم کے درج بالا خیالات سے حرف بہ حرف متفق ہیں اور واقعتاً ان کے خیالات کا ایک ایک لفظ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے مگر اے کاش! وہ ۱۹۹۶ء کے تحریر کردہ حقائق کا ۱۹۷۲ء میں ادراک کر لیتے تو ہم بہت سے ناخوش گوار حالات و واقعات سے دوچار نہ ہوتے۔

حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمی صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے اور ہر ایک نے اپنے وقت پر اس دنیا کو خیر باد کہنا ہے۔

اے کاش! یہ کتاب ان کی حیات میں شائع ہوتی تو گفتگو مزید شرح وبسط کے ساتھ کی جاتی۔ ہوسکتا ہے کہ پس مرگ ہماری گذارشات چند لوگوں کو بے وقت کی راگنی محسوس ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقائع نگار کا قلم عقیدت مند کا دل اور نقاد کی نظر نہیں بلکہ سورج کی مانند ہوتا ہے جس کی کرنیں مرغزاروں اور صحراؤں پر یکساں پڑتی ہیں، جن سے ان کے حقیقی مناظر اپنی جزئیات کے ساتھ نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

ہمارا مقصد بھی محض عام قارئین کے لیے واقعات کے تاریخی پس منظر کی وضاحت سے زیادہ کچھ نہیں!

جامعہ قاسم العلوم کے محترم مفتی مسعود تحسین صاحب کا مضمون بہ عنوان ''مفتی صاحب کے اقتصادی نظریات'' شامل کتاب ہے۔ انھوں نے حضرت مفتی صاحب کے اقتصادی افکار ونظریات کے بارے میں ایک عمدہ اور لائق تحسین کوشش کی ہے لیکن موصوف کے بقول ۱۹۷۰ء کی میڈیا وار سے کنفیوژن کے شکار لوگوں میں حضرت مفتی صاحب کے بیانات کے خود تراشیدہ اقتباسات عام کر کے رائے عامہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی، مثلاً:

> ''موجودہ جاگیرداروں کے پاس جتنی بڑی بڑی جاگیریں ہیں اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان زمینوں کو ان لوگوں سے چھین کر ملک کے غریب کاشت کاروں اور کسانوں میں تقسیم کردے۔''

مفتی صاحب سے منسوب درج بالا نظریہ لکھنے کے بعد مفتی مسعود تحسین صاحب اپنا خیال اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

> ''بالفرض اگر حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کا مؤقف بغیر کسی دوسری تفصیل کے بعینہٖ یہ ہوتا تو ایک مفتی صاحب ہی کیا کوئی بھی بڑے سے بڑا صاحب علم یہ مؤقف کیوں نہ اپنالے، اس کی تائید نہیں کی جاسکتی کہ یہ مؤقف قرآن وسنت، اجماع امت اور فقہائے اسلامی کی تصریحات کے سراسر خلاف ہے۔''

مسئلہ ملکیت زمین کے بارے میں فقہا کی اختلافی آرا پر مستقل کتابیں موجود ہیں اس طوالانی بحث کا یہ محل نہیں، ویسے بھی حضرت مفتی صاحب سے منسوب درج بالا بیان محض ایک ادھورا اقتباس ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں، حقیقت یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب اعلانیہ طور پر فرمایا کرتے تھے کہ

> ''اسلام دولت آفریں ذرائع پر کنٹرول کرتا ہے اور کاروبار کے اسلامی اصولوں سے ہٹ کر حرام افروز ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ ہم کامیاب ہوگئے تو حرام طریقوں سے کمائی ہوئی تمام دولت چھین لی جائے گی۔ اسلام کے نزدیک زمین پر صرف اس شخص کو ملکیت کا حق پہنچتا ہے جس نے اپنی محنت سے اسے آباد کیا ہو۔''

اس باب میں محترم مفتی مسعود تحسین صاحب کی تحسین آفریں کاوش بہت خوب تاہم اس قدر عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ

(۱) مولانا مفتی محمود صاحب ایک جید عالم دین، بیدار مغز مفتی اور بے مثال شیخ الحدیث تھے اسلامی فقہ کے ذخیرہ پر ان کی جس قدر گہری نظر تھی اس کے قائل محدث کبیر علامہ محمد یوسف بنوریؒ اور دجلۂ علوم علامہ شمس الحق افغانی اپنے وقت کے رازی و غزالی تھے اور فقیہ العصر مفسرِ دوراں مفتی محمد زرولی خان صاحب مدظلہ یوں ہی تو نہیں کہتے کہ مفتی محمود فقہ میں ابوحنیفہ کے بعد دوسرا بڑا امام ہے۔ اسلامی فقہ کا کوئی گوشہ ان کی نظر سے مستور نہیں تھا اس لیے ان کا مؤقف کم از کم فقہی اعتبار سے غلط نہیں ہوسکتا۔ ہم ایسے کم علم ان کو اپنی عقل کی میزان پر تولنے لگیں تو یہ قرین انصاف نہیں ہوگا۔

(۲) جمعیت علمائے اسلام ایک سیاسی جماعت ہے لیکن عام قسم کی روایتی سیاسی جماعت نہیں ہے بلکہ ملک کے علمائے حق کی اکثریت کی نمائندہ جماعت ہے۔ جمعیت علمائے اسلام کا کوئی بھی فیصلہ اس کی مجلس شوریٰ کی تصویب کے بغیر منظر پر نہیں آتا اس لیے جمعیت کی مجلس شوریٰ کا فیصلہ یا مؤقف محض ایک سیاسی فیصلہ نہیں بلکہ ایک شرعی فتویٰ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

(۳) جمعیت علمائے اسلام کا مؤقف یا نظریہ بادی النظر میں معمول سے مختلف

نظر آئے تو بھی علمائے حق کے جمہور کی رائے سوادِ اعظم کے مؤقف کے مترادف ہے۔ اس لیے بھی وہ عامۃ الناس کے لیے لائقِ تردید نہیں بلکہ قابلِ تائید ہے۔

اس باب میں اپنی گذارشات کو اسی مضمون میں شامل حضرت مفتی محمود صاحب کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں جس سے ان کے مؤقف کی وضاحت بہ خوبی ہو جاتی ہے۔

"قدیم زمینوں کے متعلق یہ تحقیقات کی جائیں کہ آیا یہ اراضی کسی جائز طریقے سے حاصل کی گئیں تھیں یا انگریز نے بہ طور جاگیر کے حق الخدمت میں کسی کو عطا کی ہیں اور اگر ایسا ہے تو یہ اراضی فوری طور پر واپس لے کر بے زمین لوگوں میں تقسیم کردی جائیں۔"

(ہفت روزہ اخبار جہاں ۲۴ ستمبر ۱۹۶۹ء)

ہوں کے سید ظہیر الدین ایڈووکیٹ نے حضرت مفتی صاحب کے پارلیمانی کردار کا احاطہ کیا ہے جب کہ کراچی کے مولانا لطافت الرحمان نے عربی زبان پر عبور اور ان کی ادیبانہ حیثیت کو موضوع بنایا ہے۔

مولانا مفتی محمود صاحب کو انگریزی کی شد بد تھی عبور حاصل نہ تھا لیکن عربی و فارسی تاریخ و ادبیات میں ان کی گہری نظر تھی جب کہ اردو، پنجابی و سرائیکی میں مشاق تھے اور پشتو تو ان کی مادری زبان تھی ❶۔ گویا تاجدار اقلیم ہفت زبان تھے۔ عربی و فارسی میں تو نثر و نظم دونوں اصناف میں رواں تھے جب کہ اردو میں ایک عرصہ تک ہفت

❶ ایک لطیفہ قارئین کی تفنن طبع کے لیے عرض کرتا ہوں۔

حضرت مفتی صاحب سفرِ حج کے موقع پر حرم شریف میں پشتون حجاج کے اجتماع سے پشتو زبان میں خطاب کر رہے تھے کہ ایک ملتانی نوجوان حاجی نے دیکھا تو حیران ہو کر اپنے والد بزرگوار کو متوجہ کیا اور کہا کہ ابو! مفتی صاحب تو پشتو میں تقریر کر رہے ہیں؟

یعنی ملتان میں مفتی صاحب کو ایسی فصیح سرائیکی میں بلا تکان گفتگو کرتے ہوئے دیکھنے کے بعد موصوف یہ سمجھ رہے تھے کہ مفتی صاحب تو سرائیکی ہیں انھیں پشتو کہاں آتی ہوگی!

روزہ خدام الدین کی ادارت کا فریضہ انجام دیا ہے۔

ان حقائق کی بنیاد پر رفیق محترم بخی داد بےتو اخوتی صاحب نے جن کا تعلق ژوب (بلوچستان) سے ہے نے بہت خوب صورت مقالہ تحریر کیا ہے جو یقیناً آپ کی تفریحِ طبع کا باعث ہوگا۔

جامعہ قاسم العلوم ملتان کے محترم مولانا محمد اکبر صاحب اور اکوڑہ خٹک کے حافظ فاروق احمد صاحب (ایم اے۔ بی ایڈ) نے حضرت مفتی صاحب کے سیاسی کردار اور قیادت کے پیشِ نظر اپنی معلومات سپردِ قلم کی ہیں جب کہ کتاب کا آخری مقالہ اس ناکارہ کی کاوشِ فکر ہے جس میں حضرت مفتی صاحب کی ان گراں قدر خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جو انھوں نے ملی یک جہتی اور قومی اتحاد کے لیے سرانجام دیں تھیں۔ کتاب میں شامل تیرہ مقالات ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور ہر قلم کار نے اپنے اندازِ نظر کے مطابق اپنے ممدوح کو خراج پیش کیا ہے۔ دراصل مولانا مفتی محمود صاحب ایک ہمہ جہت اور گوناگوں خصوصیات کی حامل شخصیت تھے۔ ہر شخص نے ان کو اپنے مزاج و مذاق کے مطابق دیکھا اور سمجھا اور اسی نسبت سے ان کے بارے میں تاثر قائم کیا ہے۔

معاملہ بالکل جناب احمد ندیم قاسمی صاحب والا ہے کہ

ایک ہی گل تھا مگر اندازِ نظر کے فتنے
ایک کو رنگ بچا ایک کو راس آئی شمیم

کسی کو ان کی فقاہت نے متاثر کیا تو کوئی ان کے مہارتِ علم وفن کا اسیر ہوگیا ایک ان کی سیاسی بصیرت کا گرویدہ ہے تو دوسرا ان کی خطابت کے سحر میں شوریدہ، کوئی ان کی قیادت کا گرفتہ ہے تو کوئی ان کی ہفت زبانی پر وارفتہ، کوئی ان کے اندازِ تکلم پر جان دیتا ہے تو کوئی ان کی عظمتِ کردار پر نثار ہوا جاتا ہے۔ ایک ان کو تدریس کی جان سمجھتا ہے تو دوسرا قومی سیادت کی شان، گویا ایک شمع کے گرد بے شمار پروانوں کا ہالہ ہے جو ابھی تک ناتمام ہے اور ہر شخص ان کا ہی تذکرہ اپنے انداز میں کرتا اور دوسرے

سے بھی ان کے بارے ہی میں سننا چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کا تذکرہ دوسروں کی زبانی بھی اپنے دل کی ہی حکایتیں لگتی ہیں۔

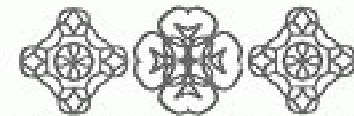
ویسے بھی تذکارِ محمود تو اسم بامسمّیٰ ہے، لیجیے اب آپ ہیں اور یہ تذکار — تذکار محمود!

خاک پائے محمود

محمد فاروق قریشی

کراچی

۲۴/مارچ ۲۰۰۵ء



آئینۂ سیرت

مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۱

مشاہدات وتاثرات

جانشین محدثِ کبیرؒ

مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر مدظلہ

رئیس جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن۔کراچی

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۱)

’’اپنے اسلاف کا تذکرہ ان کے اخلاق و اعمال اور حالات زندگی کا سننا یا پڑھنا، علما و صالحین کی مجلس، عقلاء اور صالحین کے ہاں زندگی کا ایک اہم مقصد رہا ہے۔
اس سے وہ اپنی صفات اور اخلاق کی تکمیل، نیک اعمال میں اضافہ اور آخرت کے لیے زادِ راہ تیار کرتے ہیں۔‘‘

محترم علمائے کرام اور معزز مہمانانِ گرامی!

ہم جب اپنے اسلاف اور اپنے بزرگ علمائے کرام کا ذکرِ خیر کرتے ہیں، ان کے علمی کارناموں اور علمی شغف، ان کی صفات، ان کے اخلاق اور دینی خدمات کو یاد کرتے ہیں، تو اس سے ہمارے سامنے بہت سے اہم مقاصد ہوتے ہیں:

(۱) اس سے ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ حضرات بھی سلف صالح کے سلسلۂ ذہب کی ایک کڑی ہیں اور وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (سورۂ توبہ:۱۰۰) کے مصداق ہیں۔

(۲) اس سے ہم یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارا تعلق بھی اُن سلف صالحین سے ہے ہم ان کی روحانی اولاد ہیں انہی کے راستہ پر ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ...... (سورۂ طور:۲۱)

(۳) ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اہل حق کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اپنے سلف کو خیر سے یاد کرتے ہیں اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں، اور ان کے بارے میں اپنے دلوں کو ہر قسم کے حسد اور کینہ سے پاک رکھنے کی دعا کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

(سورۂ حشر:۱۰)

(۴) سلف صالحین کے تذکرہ سے دلوں کو تقویت اور سکون حاصل ہوتا ہے،

بعض علما نے لکھا ہے کہ سلفِ صالحین کی حکایات جنود اللہ (اللہ کے لشکر) ہیں، وہ ان کے ذریعہ اپنے اولیا کے دلوں کو مضبوط کرتا ہے، اور اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ...... (سورۂ ہود:۱۲۰)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ علمائے کرام کے واقعات اور ان کے محاسن کا تذکرہ کرنا مجھے بہت سے فقہی مسائل سے زیادہ پسند ہے، کیوں کہ یہ علما کے آداب واخلاق ہیں جن کے بارے میں آیا:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ......

(سورۂ انعام:۹۰)

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ.

(سورۂ یوسف:۱۱۱)

(۵) اپنے اسلاف کا تذکرہ ان کے اخلاق واعمال اور حالات زندگی کا سننا یا پڑھنا، علما وصالحین کی مجلس، عقلاء اور صالحین کے ہاں زندگی کا ایک اہم مقصد رہا ہے، اس سے وہ اپنی صفات اور اخلاق کی تکمیل، نیک اعمال میں اضافہ اور آخرت کے لیے زادِ راہ تیار کرتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے:

"اگر دنیا میں تین چیزیں نہ ہوتیں تو مجھے زندہ رہنے کی خواہش نہ ہوتی:

۱۔ اگر میں اللہ کی راہ میں لشکر تیار کر کے نہ بھیجتا۔

۲۔ اگر رات کے وقت عبادت نہ ہوتی۔

۳۔ اگر ایسے صالحین کی ہم نشینی نصیب نہ ہوتی جو عمدہ اور پاکیزہ باتوں کو اس طرح چن لیتے ہیں جس طرح عمدہ کھجوروں کو چنا جاتا ہے۔

(ذکرہ فضیلۃ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ فی آخر کتابہ

"الرسول المعلم صلی اللہ علیہ وسلم واسالیبہ فی التعلیم، طبعہ حلب)

اس تمہید کے بعد اب میں حضرت اقدس مولانا مفتی محمود صاحب (محمود الدین و الدنیا) رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تاثرات کا ذکر کروں گا، جن کا میں مختلف مواقع میں مشاہدہ کر چکا ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں حضرت مفتی صاحب کے تلمذ سے تو محروم رہا، کیوں کہ میں نے تعلیم کے لیے کراچی کو اختیار کیا اور حضرت مفتی صاحب قاسم العلوم ملتان میں تھے۔ لیکن یہ میری سعادت مندی تھی کہ حضرت مفتی صاحب کا حضرت شیخ مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے دوستانہ اور برادرانہ تعلق تھا، اس لیے جب بھی آپ کراچی تشریف لاتے حضرت بنوری سے ملتے اور مہمان خانہ میں قیام فرماتے اور اس طرح مجھے قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملتا، کیوں کہ میں حضرت بنوری رحمہ اللہ کا خادم تھا اور ان کے ساتھ رہتا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان کا کراچی آنا کبھی کبھی ہوتا تھا اور اتنے تھوڑے وقت میں ان کے کمالات اور صفات کا جاننا آسان کام نہ تھا، اور وہ بھی میرے جیسے ایک ادنیٰ طالب علم کے لیے، کیوں کہ کسی عالم کا مقام جاننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود بھی اس درجہ کا عالم ہو، مثل مشہور ہے "ولی را ولی مے شناسد" لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ایک خوش بودار پھول جہاں بھی ہوگا قریب والے شخص کو، اگر اس کی قوت شامہ صحیح ہے، خوش بو ضرور آئے گی، اور وہ اس خوش بو سے ضرور متمتع ہوگا۔

لہٰذا اگر آپ حضرات کو میرے اس بیان میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں، ان کے کمالات یا اوصاف کے بیان اور تعبیر میں کوئی کوتاہی نظر آئے تو اسے میری کوتاہی سمجھا جائے کہ میں اسے صحیح سمجھ نہ سکا، یا اس کی صحیح تعبیر نہ کر سکا۔

حضرت اقدس مولانا مفتی محمود صاحب (محمود الدین والدنیا) رحمہ اللہ تعالیٰ

اپنے علم وفضل، صلاح وتقویٰ، زہد وقناعت، دعوت وعزیمت اور ہمت وشجاعت میں سلفِ صالح کا بہترین نمونہ تھے۔

عصرِ حاضر کے دینی اور سیاسی تقاضوں سے خوب واقف تھے، اور سیاسی میدان میں ان کے حریف بھی ان کے کمال کے معترف تھے (والفضل ماشہدت بہ الاعداء)۔

لیکن میں اپنے مشاہدات کی روشنی میں آپ کے چند کمالات اور صفات کا ذکر کروں گا۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو میں نے فقیہ النفس، باوقار، امت کا درد رکھنے والے، صاحبِ استقامت، باوفا اور متواضع پایا اور ان صفات و اخلاق کا مشاہدہ میں نے کراچی، ملتان، اور بیرون ملک حرمین شریفین اور مصر میں سفر کے دوران کیا۔

وفا اور حقِ رفاقت:

حضرت مفتی محمود رحمہ اللہ کی اعلیٰ صفات میں ایک صفت، صفتِ وفا تھی کہ جس سے بھی انھوں نے دوستی کی آخر تک اسے نبھایا اور اس کا حق ادا کیا۔

حضرت شیخ بنوری رحمہ اللہ کے ساتھ ان کی گہری دوستی اور قلبی محبت تھی، اور یہی حال حضرت بنوری رحمہ اللہ کا تھا اور دوستانہ تعلق اس وقت تک مضبوط ہو ہی نہیں سکتا جب تک جانبین سے یہ جذبہ نہ ہو۔

ان دونوں حضرات میں یہ صفات بھی کامل طور پر موجود تھیں اور محبت ورفاقت کے ساتھ ایک دوسرے کا انتہائی احترام بھی۔

حضرت مفتی صاحب نے اس تعلق کو خوب نبھایا، جب بھی کراچی تشریف لاتے حضرت بنوری رحمہ اللہ کے ہاں جامعہ کے چھوٹے سے مہمان خانہ میں قیام فرماتے اور جب کہ کراچی شہر میں ان کی جماعت کے لوگوں میں اور ان کے عقیدت مندوں میں بڑے بڑے سیاسی اور مال دار لوگ بھی تھے، جو بنگلوں اور بڑے بڑے

محلات کے مالک تھے، لیکن حضرت مفتی صاحب بہ ایں ہمہ ان کی بجائے حضرت بنوری رحمہ اللہ کے ہاں ٹھہرتے اور انھیں کو ترجیح دیتے۔

ہاں اس میں صرف ایک بار تخلّف ہوا جب آپ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے، اور اس وقت ایک بار کراچی آنا ہوا تو آپ سرکاری مہمان خانہ میں ٹھہرے اور دوسرے دن حضرت بنوری رحمہ اللہ سے ملنے بنوری ٹاؤن تشریف لائے اور معذرت پیش فرمائی کہ میں تو اس بار بھی آپ کے ہاں ہی ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن سرکاری پروٹوکول اجازت نہیں دیتے کہ میں کسی اور جگہ ٹھہروں۔

حضرت مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ نے حضرت بنوری رحمہ اللہ کی وفات کے بعد بھی اس وفا کا عملی ثبوت پیش فرمایا، کہ جب کراچی تشریف لاتے حضرت کی جامعہ میں ضرور تشریف لاتے اور پرانی یادیں تازہ فرماتے اور آخری بار جب حج کے لیے جاتے وقت کراچی تشریف لائے تو جامعہ میں تشریف لائے اور حسبِ سابق مہمان خانہ میں تشریف فرما ہوئے، میرے پاس گھر پر جامعہ کا خادم آیا اور کہا کہ حضرت مفتی محمود صاحب تشریف لائے ہیں، مہمان خانہ میں بیٹھے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں یہ خبر سن کر خوش ہوا اور خدمت میں حاضر ہو کر سلام کیا، بہت خوش ہوئے اور شفقت سے پیش آئے، کیوں کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ کے خادم ہونے کی وجہ سے مجھ سے محبت اور شفقت فرماتے تھے۔

اتنے میں جامعہ کے دوسرے اساتذہ کرام بھی تشریف لے آئے خصوصاً حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب نیز مولانا محمد تقی عثمانی بھی اتفاق سے تشریف لے آئے، علما کا اچھا خاصہ مجمع ہو گیا اور حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے جو اس وقت نہایت ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔ ایک علمی موضوع پر عالمانہ انداز میں مدلل گفتگو شروع فرمائی۔ سب علمائے کرام نہایت توجہ اور غور سے ان کی یہ گفتگو سن کر متاثر ہو رہے تھے کہ اچانک ایسا لگا کہ کسی نے ان کی زندگی کے بٹن کو بند کر دیا ہو۔ نہ چہرے پر تکلیف کے آثار ظاہر ہوئے اور نہ ہی آواز میں کوئی

فرق پڑا اور اس طرح حضرت بنوری رحمہ اللہ کے ادارہ میں وفا کا عملی ثبوت دیتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور علمائے کرام کو یہ سبق دے گئے کہ وہ آپس میں کیسے تعلقات رکھیں کہ ان کو کس طرح نبھائیں۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ، وادخلہ الجنۃ مع النبیین والصدیقین والصالحین و حسن اولئک رفیقا.

تواضع:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں ایک اہم صفت تواضع تھی، اور اس تواضع کے بارے میں آپ نے ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

من تواضع للّٰہ رفعہ.

"اور تواضع تو بڑوں کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔"

علمائے کرام چوں کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں اس لیے جو عالم بھی صفت تواضع کو اختیار کرتا ہے، اس سے اس کا مقام اور اونچا ہو جاتا ہے، اور وہ عوام وخواص کے دلوں میں مقام حاصل کر لیتا ہے۔

حضرت مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ میں یہ صفت کافی عیاں تھی جس کا مشاہدہ ہر شخص کر سکتا تھا، میں ان کی صفت وفا میں ذکر کر چکا ہوں کہ مفتی صاحب جب صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ تھے اور کراچی تشریف لائے، تو وزارتِ اعلیٰ کے اس منصب سے بھی ان میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ پہلے ہی کی طرح حضرت بنوری رحمہ اللہ کی ملاقات کے لیے ان کے پاس جامعہ میں تشریف لائے اور معذرت بھی پیش کی کہ میں تو آپ کے پاس اب بھی مہمان خانہ میں آکر ٹھہرتا لیکن سرکاری پروٹوکول اجازت نہیں دیتے۔

اسی کے ساتھ میں ان کی تواضع کا ایک اور واقعہ ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جس کا مشاہدہ میں نے بہت قریب سے کیا ہے۔

وزارت اعلیٰ ہی کے زمانہ میں حضرت مفتی صاحب حج کے لیے تشریف لے گئے، اور سعودی گورنمنٹ نے اکراماً ان کو اپنا مہمان ٹھہرایا۔ حضرت شیخ بنوری رحمہ اللہ بھی اس حج میں موجود تھے اور وقوف عرفات کے بعد منیٰ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ حضرت مفتی صاحب منیٰ میں سعودی گورنمنٹ کے مہمان خانہ میں ٹھہرے تھے۔ حضرت شیخ بنوری رحمہ اللہ نے مجھے حکم دیا کہ میں مہمان خانہ میں جاؤں اور حضرت مفتی صاحب اگر موجود ہوں تو ان سے سلام کے بعد عرض کروں کہ حضرت بنوری آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔

میں مہمان خانہ میں حاضر ہوا اور حضرت مفتی صاحب سے ملا اور حضرت بنوری رحمہ اللہ کا سلام اور پیغام پہنچایا، حضرت مفتی صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"حضرت بنوری کیوں تشریف لائیں میں خود ان کی خدمت میں جاتا ہوں اور مجھے فرمایا کہ آپ چند منٹ بیٹھیں میں تیار ہوتا ہوں۔"

چناں چہ مہمان خانہ سے روانہ ہوئے، ساتھ نہ کوئی سیکرٹری، نہ کوئی سپاہی اور نہ محافظ، صرف حضرت مفتی صاحب اور یہ خادم، جگہ دور تھی اور پیدل چل کر آئے۔ حضرت بنوری سے ملے اور علما بھی تھے، ان سے بھی ملے، حضرت بنوری رحمہ اللہ کا دستر خوان بچھا ہوا تھا جس پر تازہ اور خشک پھل اور میوے پڑے تھے، انھیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا:

"اصل شاہی مہمان تو حضرت مولانا ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے، ہم تو برائے نام شاہی مہمان ہیں، ابھی میرے پاس مولوی عبدالرزاق ملے اور ان کو صرف ٹھنڈی بوتل پیش کی گئی۔"

کافی دیر تک مجلس اور گفتگو ہوتی رہی، بڑے حضرات کی گفتگو اور مجلس کا بھی عجیب منظر ہوتا ہے، خصوصاً جب دونوں طرف سے احترام اور محبت کے جذبات ہوں، اور ہم چھوٹے خوب محظوظ ہو رہے تھے۔

مجلس کے بعد حضرت بنوری رحمہ اللہ سے آپ نے اجازت لی اور اسی طرح تنہا پیدل روانہ ہوئے، صرف یہ خادم ساتھ تھا، اس طرح انھوں نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ ان کے لیے وزارت کی کرسی، اپنا گھر، درس گاہ اور جیل کی کوٹھری سب برابر ہیں اور بڑے سے بڑا منصب بھی ان کو ان کی عمدہ صفات سے ذرہ بھر بھی تبدیل نہیں کرسکتا۔ اور عملی طور پر علمائے کرام کو یہ سبق سکھایا کہ وہ بڑے سے بڑے منصب پر پہنچنے کے بعد بھی تواضع جیسی صفت کو نہ چھوڑیں۔ حضرت سعدی رحمہ اللہ نے خوب کہا ہے۔ نہد شاخ پر میوہ سر بر زمین۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

استقامت اور مسئولیت و ذمہ داری کا احساس:

ایک عالم دین کی اعلیٰ صفات میں دین میں استقامت، اخلاق میں استقامت اور اعمال اور تصرفات میں استقامت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ کہ وہ شدت طیش، شدت جذبات میں، اور دوسروں سے متاثر ہوکر جادۂ حق اور صراط مستقیم کو نہ چھوڑے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اہل استقامت کی مدح فرمائی ہے اور انھیں بشارت دی ہے۔ ارشاد باری ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا...... (سورۂ فصلت: ۳۰)

میں نے اپنے مختصر مشاہدہ میں اس عالم جلیل، مفتی وفقیہ اور باوقار شخصیت میں یہ صفات دیکھیں، وہ صرف مفتی نہیں بلکہ فقیہ تھے، جب کسی مسئلہ میں گفتگو فرماتے تو دلیل سے گفتگو فرماتے اور نہایت عمدہ اسلوب سے دوسرے کو مطمئن فرماتے، کراچی میں حاضری کے وقت حضرت بنوری، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور دوسرے علما کے ساتھ مجلس ہوتی، اور بعض نئے فقہی مسائل پر گفتگو ہوتی تو حضرت مفتی صاحب کی رائے زیادہ وزنی ہوتی۔ میں خود تو ان مجالس میں حاضر نہ ہوسکا کیونکہ اس عرصہ میں ملک سے باہر تعلیم حاصل کررہا تھا۔ لیکن حضرت شیخ بنوری رحمہ اللہ سے یہ بات سنی

تھی۔

البتہ میرے سامنے ایک چھوٹا سا واقعہ ہے، جسے میں نے خود دیکھا اور سنا، اور اس سے اس بطل جلیل کی استقامت اور مسئولیت اور ذمہ داری کا پتہ ملتا ہے۔

قاہرہ میں ''مجمع البحوث الاسلامیۃ'' کی جانب سے کانفرنس ہورہی تھی جس میں حضرت مولانا بنوری، حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہم اللہ تعالیٰ جمیعاً بھی شریک تھے، اور یہ خادم بھی ان کے ساتھ تھا۔

ایک روز یہ حضرات عصر کے وقت شہر سے باہر گھومنے پھرنے کے لیے نکلے گاڑی میں آگے حضرت شیخ بنوری، اور پیچھے ہم تینوں بیٹھے تھے، درمیان میں حضرت مفتی صاحب، داہنی طرف میں اور بائیں جانب حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہم اللہ بیٹھے تھے۔

حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی نے بعض ایسی شخصیات کا ذکر چھیڑا جن پر علمائے حق کے تحفظات ہیں، اور آخر میں مفتی صاحب سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے: مفتی صاحب آپ ان پر کفر کا فتویٰ کیوں نہیں صادر فرماتے، لوگ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں اور آپ مفتی ہیں؟!

حضرت مفتی صاحب نے ان کی گفتگو سن کر مسکراتے ہوئے فرمایا: مولانا مشکل تو یہی ہے کہ میں مفتی ہوں۔

گویا وہ اس جملہ میں اشارہ فرما رہے ہیں، کہ ایک مفتی ہونے کی حیثیت سے میری یہ ذمہ داری ہے کہ جذبات کے بجائے احتیاط اور ذمہ داری سے فتویٰ صادر کروں۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

حضرت مفتی صاحب کا علمی شغف اور امت کی خیر خواہی:

ہمارے سلف صالح کی صفات میں سرفہرست ان کے علمی مشاغل علمی مذاکرہ، افادہ واستفادہ اور امت کی خیر خواہی جیسی صفات ہیں۔ اور ایسی بہت سی مثالیں آپ کو

ملیں گی کہ ان حضرات کی وفات علمی مذاکرہ میں ہوئی۔

اسلامی دنیا کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی مرض الوفات میں ان کے ایک شاگرد قاضی ابراہیم بن الجراح مازنی ان کی تیمارداری کے لیے حاضر ہوئے۔ آپ پر بے ہوشی طاری تھی جب ہوش آیا تو فرمانے لگے: ابراہیم! حاجی رمی جمار کرنا چاہے تو اس کے لیے کونسی حالت بہتر ہے، پیادہ چل کر یا سوار ہوکر؟ میں نے عرض کیا: پیادہ چل کر، فرمایا: جواب صحیح نہیں۔ میں نے عرض کیا: سوار ہوکر، فرمایا: یہ بھی صحیح نہیں پھر فرمایا: جس رمی کے بعد دعا کرنا مسنون ہے وہاں پیادہ چل کر رمی کرنا افضل ہے، کیوں کہ اس حالت میں سکون اور یک سوئی سے دعا ہوگی اور جس رمی کے بعد ٹھہرنا نہیں اسے سوار ہوکر ادا کرنا بہتر ہے۔ کیوں کہ سواری کی حالت میں وہاں سے جلدی ہٹنا آسان ہوگا۔ میں نے عرض کیا: حضرت کیا یہ حالت مسائل میں مذاکرہ کی ہے؟ فرمایا: ہم اس لیے علمی مذاکرہ کرتے ہیں کہ شاید کسی اللہ کے بندہ کے لیے نجات کا ذریعہ بن جائے۔ ابراہیم فرماتے ہیں کہ میں اٹھ کر روانہ ہوا اور ابھی ان کے مکان کے دروازہ تک نہیں پہنچا تھا کہ مجھے اندر سے عورتوں کے رونے کی آواز آئی۔ ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔

حضرت مفتی صاحب زندگی بھر علم سے وابستہ رہے، شیخ الحدیث کی حیثیت سے پڑھاتے رہے، اور سیاست میں آنے کے بعد بھی یہ مشغلہ نہیں چھوڑا۔ ایک بار جب ہری پور کی جیل میں تھے تو علما کو جیل میں حدیث کا درس دیتے رہے اور علمی مذاکرہ ہی کے دوران ان کی پاکیزہ روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

حج کے سفر کے لیے کراچی تشریف لائے، جامعہ علوم اسلامیہ میں دوپہر کے وقت تشریف لائے، علما کا مجمع تھا، نہایت ہشاش بشاش تھے اور ایک علمی مسئلہ شروع فرمایا، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ کے قلم سے لکھا ہوا نقل کردوں، فرمایا:

"اس وقت گفتگو خالص شرعی نقطہ نظر سے ہے، کوئی سیاسی ذہن یا تعصب

اس میں کارفرما نہیں ہونا چاہیے، اور میں اپنی ذات کے بارے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے اپنی غلطی معلوم ہوگئی تو میں اس سے رجوع کرلوں گا۔"

یہ کہہ کر فرمایا کہ آپ حضرات نے میرے فتوے کا جواب لکھا ہے گو اس میں صراحتاً میری تردید نہیں کی گئی، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے فتوے کا جواب ہے۔ مجھے آپ حضرات پر تین اعتراض ہیں، پہلے نکتے کی جو تشریح فرمائی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

"آپ حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ بینکوں میں جو روپیہ جمع کردیا جاتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اموال ظاہرہ میں داخل ہو جاتا ہے بلکہ وہ اموال ظاہرہ سے بڑھ کر حکومت کی ضمانت وحفاظت میں داخل ہو جاتا ہے۔ حال آں کہ بینک میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے وہ ربوی قرض ہوتا ہے۔ چناں چہ بینک بھی اس کو قرض سمجھتے ہیں، اور کھاتے دار بھی یہی سمجھتے ہیں، اور قرض کی رقم کا حکم یہ ہے کہ وہ قرض دہندہ کی ملک سے خارج ہوکر مستقرض کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس میں مالکانہ تصرف کرتا ہے۔ اگر وہ رقم ضائع ہوتی ہے تو مستقرض کی ضائع ہوتی۔ اور فقہ کا ایک جزئیہ بھی ایسا نہیں جس کے مطابق مستقرض کو قرض دہندہ کی جانب سے اس رقم کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حق حاصل ہو۔ پس جب بینک میں جمع شدہ رقم قرض دہندگان کی ملکیت ہی نہیں۔ بلکہ بینک کی ملکیت ہے تو اس کو اموال ظاہرہ میں کس طرح شمار کیا جاسکتا ہے۔ اور بینک کو اس رقم پر قرض دہندہ کی طرف سے زکوٰۃ وضع کرنے کا حق کس شرعی اصول سے دیا جاسکتا ہے؟ یہ رقم اموال ظاہرہ میں شامل ہے یا اموال باطنہ میں؟ یہ بحث تو اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ وہ رقم قرض دہندہ کی ملک میں ہو۔ لیکن جب وہ رقم قرض دہندہ کی ملک سے خارج ہوکر بینک کی ملک میں داخل ہوگئی ہے

تو اس رقم پر اموال ظاہرہ یا اموال باطنہ کا اطلاق کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔''

(شخصیات و تاثرات۔ص ۱۹۲، مولانا محمد یوسف لدھیانوی)

حضرت مفتی صاحب ابھی پہلے نکتے کی وضاحت فرما رہے تھے کہ اچانک ایسا لگا جیسے کسی نے زندگی کا بٹن دبا دیا ہو لیکن نہ گفتگو میں کوئی فرق آیا نہ کسی قسم کی تکلیف کے آثار چہرے پر ظاہر ہوئے، اور روح پرواز کر گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی موت قابلِ رشک تھی، وہ سفرِ حج پر تھے، پھر ایک دینی اور شرعی مسئلہ کی تشریح فرماتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے، جو کہ ذکر الٰہی کی ایک صورت ہے۔

ایک محدث کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ فرمانے لگے کہ جب میری موت آئے گی تو تمہاری طرح مجھے جھٹکے نہیں لگیں گے۔ پھر مصلے پر کھڑے ہو کر نماز شروع کی، جب سجدہ میں پہنچے وہیں روح پرواز کر گئی۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ، وعافہ واعف عنہ، واکرم نزلہ، ووسع مدخلہ، وابدلہ داراً خیراً من دارہ، واھلا خیرا من اھلہ، اللھم لاتحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ.

اس عالم جلیل کی زندگی میں علمائے کرام کے لیے مفید درس اور عبرت کا سامان ہے تا کہ وہ ان کی اقتدا کرکے وفا، تواضع، استقامت اور مسئولیت کا نمونہ بنیں۔

یاد رکھیں کہ اہل کمال ہر فن اور زندگی کے ہر شعبہ میں بہت کم ہوتے ہیں، اس لیے ان کے وجود کو غنیمت جانتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ ان کی قدر کریں اور ان کے وجود اور ان کے تجارب سے فائدہ اٹھائیں۔

مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ ہم اپنے ان بڑے بزرگ علما کی صحیح قدر نہ کر سکے، اور ان کے علوم اور تجارب سے صحیح فائدہ نہ اٹھا سکے، کیوں کہ ہم اس دھوکہ میں پڑے رہے کہ ان بزرگوں کی زندگیاں کافی لمبی ہوں گی اور ہم ان سے فائدہ حاصل کریں

گے، لیکن یہ ہماری غلطی تھی اور ہمیں دھوکا ہوا۔ فنستغفر اللہ ونتوب الیہ

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قحط الرجال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی قدر کرنے کی ترغیب دی۔ اور ارشاد فرمایا:

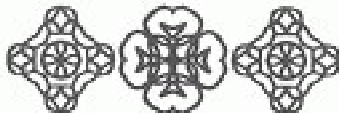
انما الناس کابل مائة لا تکاد تجد فیھا راحلة.

''لوگوں کی مثال سو اونٹوں جیسی ہے کہ ان سو میں بمشکل تمھیں ایک اونٹنی ملے گی جو سواری اور سفر کے قابل ہو گی۔''

لہٰذا اس وقت بھی جو صاحب علم موجود ہیں، ان کے وجود سے فائدہ اٹھایا جائے، اور ان کا موازنہ جانے والے اکابر سے نہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے سلفِ صالحین کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم



مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۲

ایک جامع علمی شخصیت

مولانا مفتی منظور احمد صاحب
جامعہ قاسم العلوم ۔ ملتان

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۲)

''مفتی صاحبؒ کو فقہ میں نہ صرف خصوصیت حاصل تھی بلکہ آپ درجہ اجتہاد تک پہنچے ہوئے تھے۔

آپ کے قلم سے ہزاروں فتوے نکل کر ملک اور بیرون ملک میں گم کردہ راہوں کی رشد وہدایت کا ذریعہ بنے۔

جدید مسائل میں مفتی صاحب کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔''

آپ کے والد ماجد کا نام مولانا خلیفہ محمد صدیق تھا۔خلیفہ محمد صدیق کا تعلق افغانوں کے قبیلہ ناصر کی شاخ یحییٰ خیل سے تھا خلیفہ صاحب ۱۹۰۱ء کو خانہ بدوش افغانوں کے ایک قافلہ کے ساتھ قندھار سے ہجرت کر کے ایک مہینہ کا سفر طے کر کے پنیالہ کے مقام پر پہنچے پنیالہ کھجوروں کے باغات اور مختلف میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے چشموں کے درمیان سطح سمندر سے تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی پر نہایت خوش نما دامن کوہ میں ایک قصبہ ہے، پنیالہ کے قیام کے دوران وہاں کے باشندگان سے خلیفہ صاحب کو معلوم ہوا کہ پنیالہ سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر شمال کی جانب شیخ بدین کے پہاڑ کے دامن میں خانقاہ یاسین زئی میں ایک رجل رشید اور خدا رسیدہ سادات قندھار کے قبیلہ یاسین زئی کے مولانا سید احمد گل شاہ صاحب تشنگان علوم ظاہرہ و باطنہ کو سیراب فرما رہے ہیں تو اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے وہاں اکیلے پہنچ گئے اور سید صاحب سے مل کر ان کی شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ باقی ماندہ زندگی انہی کے قدموں میں گزارنے کی ٹھان لی اور علوم ظاہرہ اور باطنہ ان سے حاصل کرنے کا فیصلہ فرمایا چند دن کے بعد ساتھ آنے والا قافلہ اپنی نئی منزل کے تلاش میں پنیالہ سے ادھر ادھر روانہ ہوگیا۔لیکن خلیفہ محمد صدیق صاحب اپنے استاد اور مرشد کے ہاں ٹھہر گئے۔

خلیفہ محمد صدیق صاحب نے شیخ کی خدمت اور ان سے محبت نیز خداداد صلاحیت اور محنت کی بدولت سید احمد گل شاہ کے خادم خاص اور مرید باصفا بن گئے۔
اس تعلق خاص کی بنا پر خانقاہ کے سارے لوگ آپ کو خلیفہ کہنے لگے۔

سید احمد گل شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے مولانا

سید عبدالحلیم شاہ ان کے جانشین مقرر ہوئے تو خلیفہ محمد صدیق صاحب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور ان سے مجاز ہوئے۔ اسی اثنا میں انھوں نے پٹیالہ میں شادی بھی کرلی تھی۔

مفتی محمود کی ولادت:

آپ کی ولادت باسعادت ۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۴ جنوری ۱۹۱۹ء پیر کی رات پٹیالہ میں خلیفہ صاحب کے یہاں ایک مولود مسعود کی عالم شہود میں آمد ہوئی۔

مولانا سید عبدالحلیم شاہ نے اس مولود کا نام محمود تجویز کیا ہاں وہ سعادت مند اور بلند اقبال مولود تھا۔ جسے آج دنیا مفتی محمود کے نام سے جانتی ہے۔

خلیفہ محمد صدیق آخر دم تک خانقاہ یاسین زئی میں مقیم رہے وہیں وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہیں۔

۱۹۲۴ء میں مفتی صاحب پانچ برس کی عمر میں پٹیالہ گورنمنٹ مڈل اسکول میں داخل کرادیے گئے۔

آپ ابتدا ہی سے نہایت ذہین وفطین تھے اس لیے چوتھی جماعت سے ہی وظیفہ حاصل کرنا شروع کردیا۔ اسی وجہ سے اسکول کے تمام اساتذہ آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ مڈل پاس کرلینے کے بعد اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے آپ کے والد خلیفہ محمد صدیق صاحب سے منت خوشامد کی کہ محمود کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے اگر آپ اجازت دیں تو اس کے تمام تعلیمی اخراجات میں خود برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن خلیفہ صاحب نے یہ کہہ کر انگریزی تعلیم جاری رکھنے سے انکار کردیا کہ میں اس کو دینی تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر پر محمود کی دینی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اپنے والد ماجد اور ماموں مولانا شیر محمد پٹیالوی سے قرآن مجید ناظرہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شیخ بدین کی مسجد کے امام مولانا غلام رسول

اور مولانا شیر محمد قندھاری سے عربی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں۔

شرح جامی ہدایہ اولین اور سلم العلوم تک انھیں سے پڑھیں۔

خانقاہ یاسین زئی سے دارالعلوم دیوبند اور مراد آباد تک ہدایہ اور جامی تک پڑھنے کے بعد محمود دارالعلوم دیوبند حصول تعلیم کے لیے تشریف لے گئے۔

تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مطابق شوال ۱۳۶۴ھ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، تاریخ دارالعلوم دیوبند مرتبہ مجلس شوریٰ صفحہ ۷۰ جلد ۲ آپ دارالعلوم دیوبند ہی میں پڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن والد صاحب آپ کو جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد بھیجنا چاہتے تھے۔ چناں چہ مفتی محمود کو دارالعلوم دیوبند میں ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ آپ کے بڑے اور سوتیلے بھائی صاحب زادہ احمد دارالعلوم پہنچ گئے وہ اس وقت سرہند میں قیام پذیر تھے۔ انھیں سرہند میں خلیفہ صاحب کا یہ پیغام پہنچا کہ محمود جو دیوبند میں اکیلا ہے اس کو مراد آباد ہی لے جائیں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ آپ کے دوسرے بھائی یعنی سید عبدالحلیم کے صاحب زادے محمد اور عبدالحمید وہاں پڑھ رہے ہیں۔

دوسرے اس وجہ سے بھی کہ وہاں فنون کی تعلیم بہت اچھی ہورہی ہے چناں چہ تعمیل ارشاد کے لیے صاحب زادہ احمد دارالعلوم دیوبند پہنچا اور محمود کو والد کا پیغام پہنچایا۔ محمود نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن دل سے وہ دارالعلوم چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ چناں چہ دوسرے دن عین روانگی کے وقت کہیں چھپ گئے اور بھائی کے ساتھ مراد آباد نہ گئے۔ کچھ دن بعد پھر خلیفہ صاحب کا پیغام آیا تو محمود نے بادل نخواستہ دارالعلوم دیوبند کو چھوڑ کر جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں داخلہ لے لیا اور پھر مراد آباد میں چھ سال گزار دیے۔

جامعہ قاسمیہ مراد آباد کے اساتذہ گرامی قدر میں ایک استاد صاحب حضرت مولانا سید محمد میاں بھی تھے۔

سید محمد میاں صاحب اسی زمانہ میں اپنی مشہور زمانہ اور مقبول عام کتاب علمائے ہند کا شاندار ماضی تالیف فرمارہے تھے۔

مفتی محمود نے اس کے مسودات کی نقل وتصحیح کے کام میں استاذ محترم کا ہاتھ بٹایا۔

اس کام کے ضمن میں مفتی محمود کے جوہر خوب نمایاں ہوئے اور خداداد صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوا۔

استاذ صاحب کو آپ کا کام بہت پسند آیا اور ان کی علمی سوجھ بوجھ سے بے حد متاثر ہوئے۔ حضرت محمود صاحب نے روزنامہ حریت کے نمائندے حافظ مقصود احمد جالندھری کو وزارت اعلیٰ کے زمانہ میں انٹرویو دیتے ہوئے اپنی زبان سے دارالعلوم دیوبند جامعہ قاسمیہ مرادآباد اور مظاہر العلوم سہارنپور کا ذکر بھی فرمایا اور بعض تذکرہ نویسوں نے جامعہ امینیہ دہلی کا ذکر بھی کیا ہے کہ آپ وہاں پر بھی پڑھتے رہے ہیں۔

۱۹۴۱ء کو مرادآباد سے وطن واپسی ہوئی تو اپنے مرشد سیدالعزیز شاہ بن سید احمد گل شاہ کے حکم پر آپ نے مدرسہ معین الاسلام عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں پندرہ روپے تنخواہ پر تدریس کا آغاز کیا۔ اور اس دوران حضرت سید عبدالعزیز شاہ صاحب سے بیعت بھی ہوگئے تھے سید عبدالعزیز شاہ اپنے بھائی سید عبدالحلیم شاہ سے بیعت اور مجاز تھے۔ اور انہی کے حکم پر ۱۹۲۵ء کو ابا خیل لکی مروت ضلع بنوں میں سلسلہ مجددیہ کی ترویج و اشاعت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ سید عبدالعزیز شاہ نے ابا خیل میں مدرسہ قائم کیا اور تین چار سال بعد معین الاسلام سے آپ کو ابا خیل بلالیا گیا۔

۱۹۴۶ء میں خانقاہ یاسین زئی میں سید عبدالعزیز شاہ کے پاس کچھ مریدین جمع تھے۔ ان میں عبدالخیل کے نیاز محمد صاحب موجود بھی تھے اور خلیفہ محمد صدیق صاحب بھی موجود تھے باتوں باتوں میں شادی بیاہ کا ذکر چھڑ گیا تو سید عبدالعزیز شاہ نے نیاز محمد صاحب کو حکم فرمایا کہ تم خلیفہ محمد صدیق صاحب کے بیٹے محمود کو لڑکی کیوں نہیں دے دیتے۔ نیاز محمد صاحب نے مرشد کے حکم پر سر تسلیم خم کردیا۔ اسی وقت اپنی جھونپڑی میں گئے (جو خانقاہ کے قریب تھی) اور مفتی محمود کو بلا کر اپنی بیٹی کے ساتھ نکاح پڑھا دیا

۱۹۴۵ء کو سید عبدالعزیز شاہ بن سید احمد گل شاہ نے نماز استسقاء پڑھائی اور طلب باراں کی دعا کی مفتی صاحب نے اپنے مرشد کے حکم پر ایسے دل نشین انداز میں دعا کی اور

ضروری مسائل پر روشنی ڈالی۔

عبدالخیل کے امام مولانا محمد صالح ۱۹۴۵ء میں وفات پا چکے تھے اور مسجد ویران تھی گاؤں والوں نے جو مفتی صاحب کا بیان سن کر فریفتہ ہو چکے تھے۔ عبدالعزیز شاہ صاحب سے مطالبہ کیا کہ یہ مولوی صاحب ہمیں دے دیں۔ اس وقت یہ بات طے نہ ہوسکی اور وہاں پر ایک دو دن کے قیام کے بعد شاہ صاحب اور مفتی صاحب ابا خیل واپس چلے گئے تو عبدالخیل سے چند دن بعد تین آدمیوں پر مشتمل ایک وفد جس میں مفتی صاحب کے سسر نیاز محمد بھی تھے۔ شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ انھوں نے سید عبدالعزیز شاہ سے یہ درخواست کی کہ مولوی محمود ہمیں دیا جائے۔

مفتی صاحب سے ان کے اس تقاضے کا ذکر ہوا تو فرمایا اس شرط پر جانے کے لیے تیار ہوں کہ میرے ساتھ جتنے طالب ہوں گے ان کے قیام وطعام کا انتظام گاؤں والوں کے ذمہ ہوگا۔ وفد نے اس شرط کو بخوشی قبول کرلیا تو مفتی محمود صاحب ان کے ساتھ پچاس ساٹھ طالب علموں کے ہمراہ تشریف لے گئے عبدالخیل میں پڑھنے والا ایک طالب علم محمد موسیٰ نامی بھی تھا۔ محمد موسیٰ انتہائی ذہین وفطین طالب علم تھا۔ جسے صدرا احمد اللہ خیالی جیسی مشکل ترین کتابیں ازبر تھیں۔ چناں چہ عبدالخیل سے کچھ طالب علم مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں پڑھنے کے لیے آئے۔ مولوی محمد موسیٰ طالب علم نے مذکورہ بالا کتب کا امتحان بطور داخلہ دیا۔ ممتحن نے حیران ہوکر صدر مدرس مولانا عبدالخالق سابق استاذ دارالعلوم دیوبند کو بتایا کہ ایک پٹھان لڑکا آیا ہے جسے سب کتابیں زبانی یاد ہیں۔

اس زمانہ میں قاسم العلوم میں ایک استاذ کی ضرورت تھی۔ اسباق شروع ہو چکے تھے تو بہت سے طلبا نے اپنے اپنے اساتذہ کے نام پیش کیے مولوی محمد موسیٰ صاحب نے بھی اپنے استاذ مفتی محمود صاحب کا نام پیش کردیا۔

حضرت مولانا عبدالخالق صاحب نے محمد موسیٰ طالب علم کی ذہانت اور قابلیت دیکھتے ہوئے انداز لگایا کہ ان کے استاذ کتنے قابل ہوں گے۔ اسی وجہ سے انھوں نے

فوراً مفتی محمود صاحب کے نام ایک خط لکھ کر مولوی محمد موسیٰ صاحب کے سپرد کیا اور خط لے کر مفتی صاحب کے پاس عبدالخیل پہنچے جس پر مفتی صاحب قاسم العلوم میں تشریف لائے۔

مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں آمد:

۱۹۵۲ء کو مولانا محمد موسیٰ صاحب کی وساطت سے ماہانہ ستر یا اسی روپے تنخواہ پر تشریف لائے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۰ء تک مفتی صاحب نے قاسم العلوم میں بالالتزام مختلف فنون کی کتابیں پڑھائیں۔ ۱۹۷۰ء سے کسی قدر وقفے کے ساتھ یہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۷۷ء شروع ہونے کے بعد تو شاید ہی انھیں کبھی درس دینے کا موقع ملا ہو لیکن مشغلہ تدریس کے ترک کا انھیں شدید احساس تھا۔ مفتی صاحب کے پڑھنے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ طلبا دل و جان سے نثار ہوتے تھے۔

مفتی محمود صاحب کا طریقہ تدریس اور طرزِ تعلیم:

مفتی صاحب بحیثیت استاذ بہت سخت گیر واقع ہوئے تھے تعلیمی کوتاہی ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلبا کے ساتھ بے انتہا شفقت اور ان کی خیر خواہی مفتی صاحب کا امتیازی وصف تھا۔ ان کا طریقہ تدریس اور انداز تعلیم نہایت حکیمانہ تھا وہ پڑھانے سے زیادہ سمجھانے کے قائل تھے ان کے سبق میں غبی سے غبی تر طالب علم بھی سبق سمجھ کر اٹھتا تھا وہ مشکل ترین مباحث کو چند آسان جملوں میں اس طرح سمجھاتے تھے کہ وہی مشکل بحث سب سے زیادہ آسان نظر آتی تھی اور اسے انتہائی آسان لفظوں میں بیان کرنے کی قدرت حاصل ہوجاتی تھی، منطق اور فلسفہ ان کا پسندیدہ ترین موضوع تھا اور معقولات کی مشکل ترین کتابوں کے صفحوں کے صفحے اور عبارات ازبر تھیں ان موضوعات کی اساس انکار اور طویل

مباحث میں الجھے بغیر قانونی پے چیدگیوں اور فنی مشکلات کو اس طرح آسان انداز میں پیش کرتے کہ پڑھنے اور سننے والوں کو سخت حیرت ہوتی۔

منطق اور فلسفہ کے ماہرین میں ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ ان فنون کے دلائل و قوانین سے متاثر ہو کر علم کلام اور عقائد کو ثانوی حیثیت دے دیتے ہیں یہ دراصل ان علوم کے دلائل کی قطعیت کا لازمی تاثر ہوتا ہے لیکن حضرت مفتی صاحب مرحوم ان موضوعات میں طلبا کو دلائل کے چکر سے نکال کر آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تاکہ ان میں تحقیق و تفتیش کا ذوق بڑھے پھر وہ منطق و فلسفہ کے دلائل کا عقائد و کلام کے دلائل سے موازنہ کرتے اور عقائد و کلام کی برتری کے ثبوت پر ایسے دلائل دیتے کہ طلبا پر واضح ہو جاتا کہ علوم و فنون میں منطق و فلسفہ اصل نہیں عقائد و کلام ہی اصل ہیں اور یہ فنون صرف اس حد تک ضروری ہیں کہ مبتدی کو غور و فکر اور تحقیق و جستجو کے بعد یہ معلوم ہو سکے کہ صحیح و غلط، حق و باطل اصل اور فرع میں کیا فرق ہے اور یہ کہ ان فنون کے دلائل کو عقائد کے مقابلہ میں کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اس طرح تدریسی و تعلیمی میدان میں وہ ایک ایسی فکر دینے میں کامیاب ہوئے جو منطق و فلسفہ کے معلم و متعلم کو توازن کی راہ پر قائم رکھ سکے۔

تمام دینی علوم پر دسترس:

مفتی صاحب کو ویسے تو تمام علوم متداولہ پر عبور تھا لیکن علم حدیث اور فقہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ قاسم العلوم ملتان کے زمانہ تدریس میں انھوں نے حدیث کی اہم ترین کتب بخاری اور ترمذی شریف کا تقریباً بیس، پچیس برس تک مسلسل درس دیا اور دوران درس نہایت پے چیدہ اور مشکل ترین مباحث کو آسان ترین انداز میں پیش فرماتے تھے۔

اور اختلافی مسائل پر پہلے مخالفین کے دلائل پیش فرماتے پھر ان دلائل کے جوابات ارشاد فرماتے آخر میں احناف کے دلائل اور ان دلائل میں قوت پیدا کرنے

کے لیے ایک ایک مسئلے پر بیسیوں شواہدات پیش فرماتے۔ اور بیسیوں مسائل کا استخراج واستنباط ہوتا۔ آپ کا درس ترمذی معاصرین محدثین میں نمایاں خصوصیات سے مزین ایک شاہ کار تھا اور ہر حدیث سے مسلک حنفی کی تائید ہوتی چلی جاتی۔ جس سے طالب علم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کہ مذاہب اربعہ میں سے حدیث کے قریب ترین مذہب صرف امام صاحب کا ہے۔

مفتی صاحب کی علم حدیث میں مہارت اور کمال دراصل ان کے مشائخ حدیث کے طفیل تھا کیوں کہ آپ نے ان مشائخ حدیث سے علم حدیث حاصل کیا جن کی نظیر اس زمانے میں تقریباً عدیم المثال تھی۔ جیسا کہ ان کی سند حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

سلسلہ سند:

محمود عن الشيخ مولانا فخر الدين احمد الديوبندى (مراد آبادى) عن شيخ الهند مولانا محمود الحسن (اسير مالتا) عن الشيخين الكريمين الشيخ الجنجوهي والشيخ النانوتوى كلاهما عن الشيخ الشاه عبدالغنى المجددى المحديث الدهلوى عن الشيخ الشاه محمد اسحق عن الشيخ الشاه عبدالعزيز عن الشيخ مجدد الملة الشاه ولى الله عن ابيه الشاه عبدالرحيم عن الشيخ ابو الطاهر المدنى عن ابيه الشيخ ابراهيم الكردى عن الشيخ سلطان بن احمد المزاحى عن الشيخ شهاب الدين احمد السبكى عن الشيخ محمد بن احمد عن الشيخ زين الدين الذكريا عن الشيخ عبدالرحيم عن الشيخ عمر بن حسن عن الشيخ

فخر الدين ابو الحسن على بن احمد عن الشيخ ابو حفص عمر بن تبرزد عن الشيخ ابى الفتح عبدالملك بن ابى القاسم عن عبدالله بن ابى سهل الهروى عن قاضى الزاهر ابو عابد محمد بن قاسم بن احمد الازدى.

السند الثانی:

محمود عن الشيخ السيد محمد ميان الديوبندى عن الشيخ محمد بن اسمٰعيل عن الشيخ الشاه محمد انور كاشميرى عن الشيخ الهند المزكور الخ.

السند الثالث:

محمود عن الحافظ عبدالرحمن الامروهى صدر المدرسين بالجامعته الاسلاميه داهبيل (حيدر آباد دكن) عن الشيخ النانوتوى المذكور السند الرابع ايضاً محمود عن الشيخ الحافظ عبدالرحمن عن الشيخ ابن حسين ابن محسن الخزاعى نزيل بهوپال الشيخ بن الشوكانى عن العلامته الحافظ الشوكانى صاحب نيل الاوطار وهذا السند عن اعا الاسانيد.

بے مثال فقاہت اور تبحر علمی:

مفتی محمود صاحب اپنے دور کے جید عالم، مشاق قاری، شعلہ نوا خطیب، نکتہ سنج

ادیب، قادر الکلام شاعر حقیقت شناس ذہین وفطین محدث اور بلند پایہ شیخ الحدیث اور منفرد مفسر قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بالغ نظر صاحب اجتہاد فقیہ اور حقیقت شناس مفتی بھی تھے۔ وہ بحیثیت فقیہ ادوار سابقہ کے آدمی لگتے تھے۔ فتویٰ زبانی ہو یا تحریری دونوں میں احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔ فتویٰ لکھتے وقت بھول کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ بسا اوقات نظر ثانی کرتے وقت بھول کا احساس ہو جاتا ہے اور بعض اوقات فتویٰ جاری کرنے کے بعد بھی مفتی کو کسی غلطی کا احساس یا اس بارے میں کسی نئی بات کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ شروع ہی سے فتویٰ کامل احتیاط سے لکھتے تھے۔ آج تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے تحریر کردہ فتویٰ پر کسی مفتی یا عالم نے کوئی اعتراض کیا ہو یا انھوں نے اپنے کسی فتویٰ سے رجوع کیا ہو۔ اگر بات صحیح فتویٰ دینے کی حد تک ہی ختم ہو جاتی تو اس بارے میں مفتی صاحب کی کوئی انفرادیت نہیں تھی۔ لیکن ان کے ہاں ایک انفرادیت پائی جاتی تھی اور وہ تھی فتویٰ دینے میں اعتدال کی راہ اختیار کرنا، ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ کسی مسئلے کا ایک رخ کیسا ہی واضح ہو اور کتنا ہی روشن کیوں نہ ہو مگر وہ مسئلے کے دوسرے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ جب تک مسئلے کے دوسرے پہلو پر پوری تحقیق نہیں کر لیتے تھے۔ فتویٰ ہرگز جاری نہیں فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے۔ کہ کسی مسئلے کے اثبات یا نفی میں دلائل لکھتے وقت مبالغہ اور افراط وتفریط سے کام نہ لیا جائے اور جس چیز کی جس قدر نفی ہو اس کی اتنی ہی اور اسی قدر نفی کی جائے۔ افراط وتفریط سے بہت سی استحبابی چیزیں وجوب کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور بہت سی وجوب کا درجہ رکھنے والی چیزیں استحباب کی جگہ پر آجاتی ہیں اس لیے ان کے نزدیک نفی اور اثبات میں تشدد کا راستہ اختیار کرنا جائز نہیں تھا۔ مفتی صاحب چوں کہ بحیثیت مفتی انتہائی اعتدال پسند تھے۔ اس لیے یہ اعتدال ان کی شخصیت کا لازمہ بن چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی قومی زندگی میں بھی ہمیشہ اعتدال نظر آتا تھا۔

مفتی صاحب کو فقہ میں نہ صرف خصوصیت حاصل تھی بلکہ آپ درجہ اجتہاد تک

پہنچے ہوئے تھے۔ آپ کے قلم سے ہزاروں فتوے نکل کر ملک اور بیرون ملک میں گم کردہ راہوں کی رشد وہدایت کا ذریعہ بنے۔ جدید مسائل میں مفتی صاحب کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ چناں چہ حضرت العلامہ شیخ الاسلام مولانا سید محمد یوسف بنوری کی حیات میں جدید فقہی مسائل اور احکام پر شرعی نقطہ نظر سے غور کرنے کے لیے پانچ جید علمائے کرام کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا تھا۔ جس کے روح رواں حضرت بنوری حضرت مفتی محمد شفیع اور حضرت مفتی محمود صاحب تھے۔ علاوہ ازیں مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی مفتی رشید احمد صاحب مفتی محمد رفیع عثمانی اور مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی بھی شریک رہے۔ اس مجلس کا نام ''مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' تھا۔ دس روز تک یہ حضرات اسلام کے معاشی نظام اور مسئلہ اجیر وغیرہ پر تحقیقات کرتے رہے۔ جو بعد میں جمعیت علمائے اسلام نے اخبارات میں ایک سو اٹھارہ علما کے دستخطوں سے شائع کرایا جیسا کہ چھبیس جون ۱۹۷۰ء کے ترجمان اسلام کی رپورٹ ہے۔

مفتی محمود صاحب نے روزانہ اجرت پر کام کرنے والے یا ماہانہ یا سالانہ اجرت پر کام کرنے والے سب کو اجیر خاص قرار دیا تھا اور صرف مضارع کو اجیر عام قرار دیا اور بالآخر مجلس تحقیق نے وہی فیصلہ کیا جو مفتی صاحب کا موقف تھا۔ (رسالہ اعلان حق صفحہ:۱۳) اس موقع پر مجلس تحقیق کے ایک بزرگ رکن نے مفتی صاحب پر کچھ اعتراضات کے عقلی اور نقلی دلائل سے جوابات دیے اس موقع پر مفتی صاحب اور اس بزرگ رکن کے درمیان ہونے والی گفتگو کے حوالہ سے علامہ سید محمد یوسف بنوری نے فرمایا مفتی محمود سے جو سابق حسن ظن تھا کہ وہ فقہی بصیرت میں امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں اس موقع پر اس کا خوب خوب مشاہدہ ہوا۔ آگے لکھتے ہیں خدا شاہد ہے کہ پہلی مرتبہ ہمیں اس حقیقت کا شدید احساس ہوا کہ مفتی محمود صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علم فقہ میں وہ بصیرت عطا کی ہے کہ ان کے کسی معاصر میں اس کی نظیر نہیں ملے گی اور اس مجلس میں موصوف کی خداترسی فقہ شناسی اور جامعیت کا پہلی مرتبہ مشاہدہ ہوا۔

(اعلان حق، صفحہ:۹)

مفتی محمود کے تبحر اور وسعت علم کی جید معاصرین علما نے نہ صرف شہادت دی بلکہ توصیف بھی فرمائی ہے۔ چناں چہ ملاحظہ ہو:

۱۔ مفتی محمود علم و حکمت میں پچاس جید علما سے بڑھ کر ہیں۔ مولانا شمس الحق افغانی

۲۔ مفتی محمود بے مثل مدرس ہیں۔ قدوۃ الکاملین حضرت بہلوی

۳۔ مفتی محمود کی زیارت کے لیے میرا دل بے چین رہتا ہے۔ مولانا عبدالہادی دین پوری

۴۔ مفتی محمود ذہین بالطبع ہیں اور ان کے علم میں توسع ہے۔ مفتی صاحب وسیع المطالعہ اور استدلال میں زکی ہیں۔ مولانا عبدالرحیم اشرف مدیر المنبر فیصل آباد

۵۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی سے بھٹو صاحب نے اس وقت سوال کیا کہ جب ان کے اور مفتی محمود صاحب کے درمیان سیاسی اختلاف پیدا ہو چکے تھے۔

بھٹو صاحب، کیا مفتی محمود بہت بڑے عالم ہیں؟

حضرت ہزاروی نے جواب میں کہا کہ مولانا مفتی محمود صاحب جید عالم دین ہیں بہت بڑے فقیہ اور مفتی ہیں بلند پایہ محدث اور عظیم مفسر ہیں چاروں سلسلوں میں ان کو خلافت ملی ہوئی ہے۔ قرآن مجید کی ساتوں قرآتوں کے قاری ہیں۔ اس کے علاوہ بہت بڑے سیاست دان بھی ہیں۔

ایک اور واقعہ:

۱۹۶۶ء میں مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے مشینی ذبیحہ کے مسئلہ پر اختلاف کیا۔ مفتی محمد شفیع صاحب کا خیال تھا کہ مشین پر بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ لینے کی صورت میں ذبیحہ درست ہوگا۔ ان کے پاس اپنے دلائل تھے۔ لیکن مفتی محمود کو ان کی رائے اور دلائل سے اختلاف تھا۔

مفتی محمد شفیع کا خیال تھا کہ اگر کسی مسلمان شخص نے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر مشین کا بٹن آن کر دیا تو مشین کے چلنے سے جتنے جانور ذبح ہوں گے وہ سب حلال ہوں گے

کیوں کہ مشین چلانے والا مسلمان ہے اور اس نے بوقت ذبح اللہ کا نام لیا ہے مشین چوں کہ تکبیر کی شرط پوری نہیں کر سکتی وہ شرط اس مسلمان نے بٹن آن کرتے وقت پوری کر دی تو یہ ذبیحہ حلال ہوگا کیوں کہ تکبیر اور ذبح دونوں کا ظہور ہوا ہے۔

مفتی محمود صاحب کا استدلال تھا کہ جانور پر تکبیر پڑھنے والے مسلمان شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود ذابح ہو، ذبح کا سبب نہ ہو مشین چلانے والے عمل میں مسلمان ذابح نہیں بنتا بلکہ وہ ذبح کا سبب بنتا ہے ذابح وہ مشین ہوتی ہے جو بٹن آن کرنے سے چلتی ہے اس لیے اس صورت میں ذبح کی شرط مکبر ذابح کی ختم ہو جاتی ہے لہٰذا ذبیحہ حرام ہوگا حلال نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں مفتی محمود صاحب نے مفتی محمد شفیع کے سامنے یہ مثال پیش کی کہ فرض کریں ایک مجوسی شخص جانور ذبح کرنا چاہتا ہے اور ایک دوسرا شخص اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ذبح کے عمل سے روک دیتا ہے اچانک ایک مسلمان وہاں پہنچ کر اس دوسرے روکنے والے آدمی کو پکڑ لیتا ہے اور مجوسی سے کہتا کہ اپنا ذبح کا عمل کرو۔

جب مجوسی جانور کی گردن پر چھری چلاتا ہے تو مسلمان بسم اللہ اللہ اکبر کہتا ہے کیا ایسا ذبیحہ حلال ہوگا جس پر ایک مسلمان نے تکبیر کہی اور مجوسی نے اسے ذبح کیا؟

مفتی محمود صاحب نے کہا کہ بالیقین یہ جانور حرام ہوگا حلال نہیں ہوگا کیوں کہ مسلمان یہاں ذبح کا سبب بنا ہے اس نے تیسرے آدمی کو پکڑ کر صرف رکاوٹ کو دور کیا ہے۔ رکاوٹ دور کر کے اس نے تکبیر کہہ دی لیکن چوں کہ وہ مکبر خود ذابح نہیں اس لیے ذبیحہ حرام ہے، ذابح مجوسی ذبح میں جس کے ہاتھ استعمال ہوئے ہیں۔

جس طرح مجوسی کا ہاتھ پکڑنے والا شخص مجوسی کے ذبح میں رکاوٹ تھا۔ اسی طرح مشین کے چلنے میں بٹن رکاوٹ ہے۔ جس طرح مجوسی کو روکنے والے شخص کو ایک مسلمان آدمی پکڑ کر رکاوٹ دور کرتا ہے اسی طرح مشین کا بٹن آن کر کے ایک مسلمان اس رکاوٹ کو دور کرتا ہے، اور مجوسی کے ہاتھ کی طرح مشین چل پڑتی ہے اگر مجوسی کا ذبیحہ حلال نہیں تو اس مشین کا ذبیحہ بھی حلال نہیں کیوں کہ ان دونوں کو متحرک کرنے کا

سبب مسلمان ہوا ہے۔ اس نے سبب بن کر رکاوٹ کو دور کیا جب کہ ذبح کے لیے اس کا ذابح ہونا ضروری تھا اور ان دونوں حالتوں میں یہ ذابح بن ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا جس طرح اس مجوسی کا ذبیحہ حرام ہے اسی طرح اس مشین کا ذبیحہ بھی حرام ہے اس علمی مجلس کا اہتمام حضرت علامہ بنوری نے فرمایا تھا جس میں دونوں بزرگوں نے کھل کر بحث کی۔ حضرت بنوری نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد مفتی محمود کے دلائل سے اتفاق کیا اور ان کی تصویب فرمائی۔

تفقہ اور تبحر علمی کا ایک واقعہ:

ایک بار ڈاکٹر معروف الدوالبی مفتی صاحب سے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال راول پنڈی میں ملنے کے لیے تشریف لائے تو مفتی صاحب نے فرمایا کہیے جناب ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جناب مسئلہ رجم پر گفتگو کرنا ہے کیوں کہ دشمنان اسلام اس بارے میں عجیب وغریب اعتراضات کرتے ہیں۔

معترضین کے نزدیک یہ ایک وحشیانہ سزا ہے لیکن چوں کہ شریعت نے شادی شدہ زانی مرد اور زانیہ عورت کے لیے رجم ہی کی سزا مقرر کی ہے۔

اس بارے میں اسلام دشمنوں کی باتوں کو کچھ زیادہ اہمیت تو نہیں دینی چاہیے۔ جہاں تک سزا کے نفاذ کا تعلق ہے یہ تو بہر حال ضروری ہے لیکن سزا کے طریقے پر نظر ثانی کر لینے میں کچھ حرج نہیں اس سزا کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک ایسے فاسق آدمی کا وجود برداشت نہیں کرتا جو گناہ کا بیج بو کر سوسائٹی کو ناپاک کرتا ہے۔ اسلام نے اس کے وجود سے سوسائٹی کو پاک کرنے کے لیے اس کے لیے سزائے موت تجویز کی ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ ثبوت جرم کے بعد اس پر حد جاری کر دی جائے۔ اس سزا کی انتہا اس کی جان کا اتلاف ہے اب اگر جان کا اتلاف ہی مقصود ہے تا کہ زنا جیسے بھیانک جرم کے ارتکاب کا دروازہ بند ہو اور سوسائٹی اس آلودگی سے بچی رہے۔ تو جدید دور میں اگر کسی دوسرے معروف طریقے کو اختیار کر لیا جائے جس کے مجرم کی

جان کنی کا مرحلہ آسان ہو جائے تو اس میں کوئی قباحت نہ ہونی چاہیے۔

مثال کے طور پر ثبوت جرم کے بعد مجرم کو گولی مار دی جائے۔ بجلی کا کرنٹ لگا کر ہلاک کر دیا جائے یا پھانسی دے دی جائے۔ یہ عمل اس صورت سے بہتر ہے کہ ایک آدمی کو سر عام کھڑا کر کے تمام لوگوں کو حکم دیا جائے کہ اس پر سنگ باری کریں تا کہ وہ ہلاک ہو جائے جب کہ اس کی ہلاکت کی دوسری صورتیں موجود ہیں ان سے مقصد پورا ہو جاتا ہے اور دشمنان اسلام کی زبانیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔

ہمیں اجتماعی طور پر اس مسئلے میں اجتہاد کر کے اس سزا کی صورت متعین کرنی چاہیے میں نے اب تک عالم اسلام کے جن اکابر علما کے سامنے اپنی رائے پیش کی ہے بیشتر علما نے میرے خیال سے اتفاق کیا ہے۔ البتہ کچھ علما ایسے بھی ہیں جو رجم کے حق میں ہیں لیکن رجم کیوں ضروری ہے اس کے ضرور ہونے کی کوئی وزنی دلیل موجود نہیں؟

جواب: مفتی محمود صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا آپ کی بات ختم ہوگئی یا اس سلسلے میں آپ مزید کچھ فرمانا چاہتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب، نہیں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر مفتی صاحب نے فرمایا دراصل آپ نے رجم کی مقصدیت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس سزا کے اجرا سے شریعت کا مقصد مجرم کی جان کا اتلاف ہے،۔

جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے اگر مجرم کو ہلاک کرنا ہی مقصود ہوتا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہلاکت کے دوسرے طریقے موجود تھے کسی زانی یا زانیہ کو تلوار کے ایک ہی وار سے ختم کیا جا سکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رجم کا مقصد کم از کم وہ نہیں جو آپ نے سمجھا ہے دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی مقرر کردہ اس حد پر گفتگو کا جواز ہی نہیں۔ اگر رسول اللہ علیہ وسلم کا صرف قولی حکم ہوتا تو اس کو سمجھنے سمجھانے کے لیے اس پر کسی حد تک گفتگو کا جواز تھا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف قولی حکم نہیں اس پر آپ کا عمل بھی موجود ہے

اور آپ نے شادی شدہ زانی اور زانیہ پر خود حد جاری فرمائی ہے یہ حد رجم کی صورت میں تھی قتل محض کی صورت میں نہیں تھی لہٰذا یہ مفروضہ باطل ہو گیا کہ اس سزا سے مقصد مجرم کی جان کا اتلاف ہے اب سوال یہ ہے کہ اس سزا کا مقصد کیا ہے؟ جب مقصد سمجھ میں آ جاتا ہے تو اس سزا پر اعتراض یا سزا کے نفاذ کے طریقہ میں تبدیلی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو واقعات موجود ہیں اور ان دونوں واقعات میں اس سزا کی حکمت مضمر ہے۔

دلیل نمبر ۱: حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اعتراف جرم کر کے آپ سے اپنے اوپر حد جاری کرنے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا جاؤ چلے جاؤ سوچ کر آنا تم نے واقعی یہ جرم کیا ہے؟

دوبارہ حاضر خدمت ہوا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا اس شخص کو شاید جنون ہو گیا ہو۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یہ تو بالکل ٹھیک ہے اور صحیح الدماغ آدمی ہے اس موقع پر بھی رسول خدا نے انھیں واپس بھیج دیا پھر وہ تیسری بار حاضر خدمت ہوا اور آپ سے حد جاری کرنے کا مطالبہ کرنے لگا۔ آپ نے صحابہؓ سے پوچھا اس شخص نے کچھ پی تو نہیں لیا شاید بہک گیا ہو صحابہؓ میں سے بعض نے اس کا منہ سونگھ کر دیکھا اور عرض کیا اس کے منہ سے بو نہیں آتی۔ اس نے ہرگز کوئی نشہ آور چیز استعمال نہیں کی اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

دلیل نمبر ۲: غامدیہ نامی خاتون خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اوپر حد جاری کرنے کا مطالبہ کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ وہ سوچ سمجھ کر آئے۔ کیا واقعی اس نے یہ گناہ کیا ہے۔ وہ دوبارہ اس وقت حاضر خدمت ہوئی جب اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اس نے اپنے گناہ پر اس بچے کو بطور ثبوت پیش کر کے وہی

مطالبہ دہرایا کہ اسے گناہ سے پاک کرنے کے لیے اس پر حد جاری کی جائے۔ آپ نے فرمایا جاؤ چلی جاؤ جب یہ بچہ دودھ چھوڑ دے اس کے بعد آنا۔ تیسری مرتبہ وہ عورت اس وقت آئی کہ جب اس کے بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا وہ کہنے لگی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اب تو یہ بچہ کھانے پینے کے قابل ہو گیا ہے۔

اس کے تیسرے اقرار کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنگ سار کرنے کا حکم دیا اسی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ رجم کے وقت جب لوگ اسے پتھر مار رہے تھے تو ایک پتھر لگنے سے اس کے جسم سے خون فوارے کے طرح نکلا اور حضرت خالد بن ولید کے کپڑوں پر چھینٹے پڑے اس پر انھوں نے کوئی سخت جملہ کہہ دیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ''خالد! ایسا مت کہو یہ تو اب اتنی پاک ہو چکی ہے کہ اس کی توبہ اگر مدینہ کی پوری بستی پر تقسیم کیا جائے تو تمام اہل مدینہ کی بخشش کے لیے کافی ہے۔''

ان دلائل کے بعد ڈاکٹر دوالبی صاحب نہ صرف مسئلہ کے قائل ہو گئے بلکہ مفتی صاحب کے تفقہ اور تبحر علمی کی داد دینے لگے۔

علمی وسعت کی ایک اور نظیر:

غالباً ۱۹۵۶ء کی بات ہوگی کہ حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ ایک ایسی رپورٹ تیار کرے جس میں عورتوں کے حقوق محفوظ ہو جائیں جو اسلام نے انھیں نہیں دیے ہیں لیکن جن لوگوں کے ذمہ یہ کام لگایا گیا۔ انھیں اسلام کے بارے میں مطلوبہ علم نہیں تھا۔ چناں چہ جب اس نے رپورٹ تیار کر لی تو کمیشن کے واحد عالم رکن حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ نے اس پر اختلافی نوٹ لکھا۔ اس طرح وہ رپورٹ التوا میں پڑ گئی لیکن ۱۹۵۸ء کے بعد قائم ہونے والی فوجی حکومت نے ایک آرڈیننس کے ذریعے اس رپورٹ کے بعض حصے نافذ العمل قرار دے دیئے

مفتی صاحب کی تقریر کا موضوع یہی آرڈیننس اور اس کی دفعات تھیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا:

"جناب والا! اس آرڈیننس کی پہلی دفعہ وراثت سے متعلق ہے جس میں طے کیا گیا ہے کہ کسی لڑکی یا لڑکے کا باپ سے پہلے انتقال ہو جائے تو ان کو باپ کی اسی قدر وراثت کا حصہ دار تصور کیا جائے گا۔ جو انہیں زندہ ہونے کی صورت میں ملتی پھر وراثت کا یہی حصہ ان کی اولاد کو منتقل کیا جاسکے گا۔

سب سے پہلے غلطی یہ ہے کہ اس دفعہ کے ذریعے اسلامی وراثت کا مفہوم ہی بدل دیا گیا ہے وہ وراثت رہی ہی نہیں از روئے لغت وارث زندہ شخص کو کہتے ہیں جو مرے ہوئے شخص کے ترکے سے حصہ لیتا ہے۔ لیکن آپ کا قانون مردہ کو وارث قرار دیتا ہے جو مرے ہوئے انسان سے حصہ لینے کا مجاز ہے۔ کیا آپ دنیا کے کسی ملک کے قانون سے اس کی کوئی مثال پیش کر سکتے ہیں۔"

خلاف اسلام ہی نہیں خلاف عقل بھی ہیں:

اس میں ایک مردہ شخص کو مفروضے کے طور پر زندہ تسلیم کیا جاتا ہے پھر اسے وارث بنا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر زید کے دو بیٹے ہیں جنہیں آپ زاہد اور شاہد سمجھ لیں۔ زاہد اپنے باپ سے پہلے فوت ہو جاتا ہے اور شاہد زندہ ہے اس قانون کی رو سے وراثت کی تقسیم کے وقت پہلے زاہد کو زندہ تصور کیا جائے گا اور اسے شاہد کے برابر حصہ ملے گا پھر فوراً ہی اسے مردہ تصور کر کے اس کا تمام حصہ اس کی اولاد کو منتقل کر دیا جائے گا۔ اس طرح قانون نے جتنا حصہ زید کے بیٹے شاہد کو دیا اتنا ہی حصہ زید کے پوتے کو بھی دے دیا، یہ قرآن وسنت کے علاوہ عقل اور قوانین عالم کے بھی خلاف ہے۔ اگر ایک شخص مرنے کے بعد پہلے زندہ اور پھر مردہ تصور کرنا ضروری ہے اور صرف اس لیے کہ اس کی اولاد کو اس کے باپ کی وراثت کا حق دار قرار دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ

اس قانون میں یتیموں سے کیوں ہمدردی ظاہر کی گئی ہے؟ متوفی کی بیوہ اور ماں کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے؟ اس فرضی ضابطے کو صرف اولاد ہی میں نہیں! تمام ورثا میں نافذ ہونا چاہیے تھا۔ کیا دنیا کے کسی بھی قانون میں اس قدر اندھیر نگری دکھائی جاسکتی ہے؟

پھر اس قانون کو بناتے وقت اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ جس طرح باپ کے مرنے سے بیٹا وارث بنتا ہے اسی طرح بیٹے کے فوت ہونے سے باپ کو بھی وراثت منتقل ہو جاتی ہے جب زید کا بیٹا زاہد فوت ہو گیا تو باپ خود بخود ہی اس کا وارث بن گیا یہ کہاں کا انصاف اور کیسا انصاف ہے کہ باپ کو محروم کرنے کے لیے مرے ہوئے شخص کو زندہ تصور کر کے اس کا وارث بنایا جائے۔

مندرجہ بالا خرابیوں کے علاوہ یہ قرآن مجید کے بھی خلاف ہے۔

قرآن مجید کی پہلی مخالفت:

وراثت کے متعلق قرآن مجید نے جو اصول مرتب کیے ہیں اس میں اقربیت کو وراثت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ.

(سورۃ نساء:۷)

"مرد کا حصہ ہے اس مال میں جو اس کے والدین یا قریب ترین رشتہ دار چھوڑیں۔"

قریب ترین رشتہ داروں کو اقربون کہتے ہیں۔ ہر اقرب سے ابعد محروم ہو جاتا ہے۔ اس لیے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو وارث قرار دینا یہ قرآن کریم کی صریح مخالفت ہے۔

ایک اور بڑی خرابی:

علاوہ ازیں ایک اور بڑی خرابی یہ لازم آتی ہے مثلاً ایک شخص مر جاتا ہے جس کا

نام زید ہے اس کا ایک لڑکا ہے اور ایک لڑکی، لڑکا اس کی زندگی میں مرجاتا ہے لیکن اس لڑکے کی ایک لڑکی (زید کی پوتی) زندہ ہے (اب گویا زید کے مرتے وقت اس کے صرف دو وارث ہیں۔ ایک اس کی حقیقی لڑکی اور ایک اس کی پوتی) عائلی قانون کی اس دفعہ کی رو سے وراثت اس طرح تقسیم ہوگی (کہ مرے ہوئے لڑکے کو زندہ تسلیم کر کے) دو حصے لڑکے کو جائیں گے اور ایک حصہ لڑکی کو جائے گا۔ پھر لڑکے کے دو حصے اس کی لڑکی (زید کی پوتی) کو منتقل ہو جائیں گے۔

اب حاصل یہ ہوا کہ زید کی حقیقی لڑکی تو صرف ایک حصہ کی حق دار ہوگی۔ اور اس کی پوتی دو حصوں کی حق دار بن جائے گی۔

دیکھیے کہ پوتی جو زید کی حقیقی لڑکی نہیں ہے اس کو تو دو حصے مل رہے ہیں اور زید کی حقیقی لڑکی کو صرف ایک حصہ مل رہا ہے کیا یہ قرین عقل ہے؟

قرآن مجید کی دوسری مخالفت:

اس کے علاوہ ایک اور بات سنیے۔ اگر ایک شخص کے دو لڑکے ہیں ایک لڑکا تو اس کی زندگی میں مرجاتا ہے اور دوسرا زندہ ہے اور مرے ہوئے لڑکے کی ایک لڑکی زندہ موجود ہے۔

اب جب وہ شخص مرتا ہے تو اس کا مال دو حصوں پر تقسیم ہوگا۔ ایک حصہ تو زندہ بیٹے کو ملے گا۔ دوسرا حصہ اس کی پوتی کو ملے گا (گویا حقیقی لڑکے اور پوتی کا حصہ برابر ہوگیا)

وزیر صحت رانا عبدالحمید نے کہا کہ اس میں کیا حرج ہے؟

مفتی صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اس میں حرج یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کے واضح ارشاد کے خلاف ہے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ. (سورۂ نساء:۱۱)

"اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد کے بارے میں وصیت کرتے ہیں کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔"

اللہ ہم کو اولاد کے بارے میں وصیت کرتے ہیں کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا اب اگر بقول آپ کے پوتی کو اولاد میں شمار کیا جائے تو اس کا حصہ لڑکے سے آدھا ہونا چاہیے تھا۔

لیکن اس قانون میں پوتی کا حصہ بیٹے کے برابر کردیا گیا ہے جو کہ حکم خداوندی کی صریح مخالفت ہے۔ صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے۔

صحیح بخاری صفحہ ۹۹۸، جلد۲ پر ہے الحقوا الفرائض باهلها فما بقي فهو لاولى رجل ذكر یعنی مقرر شدہ حصے ان کے مستحقین کے حوالے کردو۔ اور جو بچ جائے وہ قریب ترین مرد کا حق ہے اب اس حدیث کی روشنی میں بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوسکتا۔

امام بخاری نے اس حدیث کے اوپر یہ باب باندھا (عنوان قائم کیا) ہے۔

باب میراث ابن الابن اذا لم یکن لہ ابن یہ باب ہے پوتے کی وراثت میں جب کہ اس کی بیٹا حقیقی نہ ہو۔ اور امام بخاری نے اس حدیث سے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کے محروم ہونے پر استدلال کیا ہے۔

حدیث صحیح کی دوسری مخالفت:

ایک دوسری حدیث صحیح بخاری میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص صورت میں ایک فیصلہ کیا ہے کہ ایک شخص فوت ہوگیا ہے اور اس کی ایک بیٹی ایک پوتی اور ایک بہن زندہ ہیں یہی اس کے تین وارث ہیں۔ ان تین وارثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا ہے۔ جسے عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خود ایسی صورت میں فیصلہ کرتے وقت نقل فرمایا ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

اقضی فیها بما قضی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

الا بنته النصف و لا بنته الابن السدس تکملته الثلثین وما بقی فللاخت...... الخ (بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۹۸)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں وہ فیصلہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ لڑکی کو نصف پوتی کو چھٹا تا کہ دونوں کا حصہ ملکر دو تہائی ہو جائے۔ اور باقی یعنی تہائی بہن کو ملے گا۔''

اب دیکھیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے۔ بیٹی کو آدھا پوتی کو چھٹا الابنته النصف و لا بنته الابن السدس اور بہن کو تیسرا وما بقی فللاخت حدیث میں بہن کے لیے تیسرا حصہ بیٹی کے لیے آدھا۔ پوتی کے لیے چھٹا یہ تو حضور کا فیصلہ ہے۔ مگر اس صورت میں عائلی قانون کی رو سے اگر جائیداد تقسیم ہوگی تو وہ اس طرح ہوگی کہ دو حصے پوتی کو اور ایک حصہ بیٹی کو ملے گا اور بہن بالکل محروم ہو جاتی ہے۔ اس آرڈیننس کی رو سے بیٹی کو ملتا ہے تیسرا حصہ جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے اسے ملتا ہے چھٹا حصہ۔ آپ کے عائلی قانون کی رو سے پوتی کو ملتا ہے دو تہائی حصہ۔ جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے مطابق اسے ملتا ہے آدھا حصہ۔ اس آرڈیننس کی رو سے بہن محروم ہے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے ماتحت اسے ملتا ہے تیسرا حصہ۔ اس لیے یہ تقسیم جائیداد شریعت اسلام کے خلاف ہے۔

اجماع امت کی مخالفت:

علاوہ ازیں میں یہ بھی کہوں گا۔ کہ یہ دفعہ آرڈیننس کی تمام فقہائے امت کے اقوال کے خلاف ہے۔ اسلام میں جتنے بھی فقہا گزرے ہیں کسی کے نزدیک تقسیم جائیداد اس طرح نہیں ہوتی۔ نہ تو فقہائے حنفیہ کے یہاں ایسا ہے (یہ تو ہمارا اپنا مذہب ہے جو اتنا واضح ہے جس کے لیے حوالہ جات کی ضرورت نہیں) نہ فقہا مالکیہ اور

نہ فقہا شافعیہ اور نہ فقہا مذہب حنابلہ میں تقسیم وراثت اس طرح سے ہے۔ یہ نیا اجتہاد اجماع امت کے خلاف ہے۔ یہ تقسیم وراثت کا طریقہ شیعہ، سنی اور سنیوں میں حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی یعنی مذاہب اربعہ کے متفقہ فیصلوں کے خلاف ہے۔

مذاہب اربعہ کے حوالہ جات:

حوالہ مذہب امام مالک: اب ہم آپ کے سامنے ان مذاہب سے حوالے پیش کرتے ہیں یہ کتاب جو میرے ہاتھ میں ہے اس کا نام جواہر الاکلیل ہے یہ امام مالک کے مذہب کی مشہور کتاب ہے اس کتاب سے حوالہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے:

وهو ای العاصب بنفسه الابن ثم ابنه ابن الابن وان سفل والا علی یحجب الاسفل.

''تقسیم وراثت میں جدی حق دار صرف بیٹا ہے اس کے بعد اس کا بیٹا یعنی پوتا۔ یعنی اگر بیٹا نہیں ہے تو پوتا ہر اوپر کے درجہ والا نیچے کے درجہ والے کو محروم کر دیتا ہے۔''

(جز الثانی من جواہر الاکلیل شرح مختصر العلامہ الشیخ خلیل۔ ص ۳۳۱)

حوالہ مذہب امام شافعی: دوسری کتاب جو میں پیش کر رہا ہوں، وہ فقہ شافعی کی کتاب ہے اس کا نام ہے ''شرح المنظومة الرحبیہ'' اس میں فقہائے مذہب شافعی کی رو سے تقسیم وراثت کے اصول اس طرح ہیں:

فالابن یحجب ابن الابن و کل ابن ابن یحجبمن تحته من بنی الابن.

''بیٹا پوتے کو محروم کر دیتا ہے یعنی جو درجہ میں قریب ہوگا۔ وہ بعد کو محروم کر دیتا ہے۔''

اسی کتاب کے اسی صفحہ میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے:

فانهم ان کان بعضهم اقرب الی المیت حجب

الاترب الابعد فليس الابعد حظ من الميراث والارث الاقرب.

''اگر وارثوں میں بعض میت کے زیادہ قریب ہوں۔ تو قریبی دور والے کو محروم کر دیتا ہے۔ ابعد کو وراثت میں بالکل حصہ نہیں ملے گا اور وراثت کا حق صرف اقرب کو ہوگا۔''

حوالہ مذہب امام احمد بن حنبل: اس کے بعد یہ امام احمد بن حنبل کی فقہ کی مشہور کتاب المحرر ہے اس کے صفحہ ۳۹۶ میں دیکھیے یہ لکھا ہے:

ولا يرث ولد الابن مع الابن بحال.

''بیٹے کی اولاد بیٹے کی موجودگی میں کسی حال کے اندر بھی وراثت نہیں پائے گی۔'' (المحرر فی الفقہ علی مذہب الامام امام احمد بن حنبل)

مذہب شیعہ کے حوالہ جات: جو لوگ شیعہ مذہب کے مسائل کے ماننے والے ہیں ان کے لیے شیعہ مذہب کی کتابیں بھی میرے پاس ہیں۔ شیعہ مذہب کی جو کتاب اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کا نام ہے الاستبصار اس کتاب کی دوسری جلد کے صفحہ ۱۶۷ پر لکھا ہے۔

ابن الابن اذا لم يكن من صلب الرجل احد قام مقام الابن. (الاستبصار، جلد دوم، صفحہ ۱۶۷)

''بیٹے کا بیٹا (پوتا) جب کہ میت کی حقیقی اولاد میں سے کوئی نہ ہو۔ تو وہ پوتا بیٹے کا قائم مقام ہوتا ہے۔ یعنی پوتا بیٹے کی عدم موجودگی میں وارث قرار پاتا ہے۔''

شیعہ مذہب کی دوسری کتاب جو میرے ہاتھ میں آئی ہے اس کا نام ہے ''من لا یحضرہ الفقیہ'' اس میں لکھا ہے:

وليس لولد الولد مع ولد الصلب شي.

(من لا یحضرہ الفقیہ۔ جلد چہارم، صفحہ ۱۹۰)

''اولاد کی حقیقی اولاد کی موجودگی میں وراثت میں کچھ نہیں ملتا۔''

اس کتاب میں وجہ یہ بیان فرمائی گئی ہے:

لان من تقرب بنفسه كان اولى واحق بالمال ممن تقرب بغيره.

''اس لیے کہ جو میت کا بلاواسطہ قریب ہوتا ہے جیسے (بیٹا) وہ مستحق مال ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو بالواسطہ قریب ہوا ہے جیسے پوتا۔''

اس کے بعد ہم فقہ شیعہ کی کتاب فروع کافی پیش کرتے ہیں اس میں دیکھیے اس صفحہ ۴۶ میں ہے۔

ولا يرث مع الابن ولا مع الابنه احد خلقه الله غير زوج اوزوجته. (فروع الکافی، جلد سوم، صفحہ ۴۶)

''بیٹے اور بیٹی کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کوئی بھی سوائے خاوند اور بیوی کے وارث نہیں ہوتا۔''

یتیم پوتے کی چارہ جوئی کی جائز صورت: اب ہم عرض کریں گے کہ شریعت مقدسہ میں پوتے کے لیے جائز تملیک کی صورت موجود ہے شریعت میں میت کی جائیداد زندوں کی طرف دو طریق سے منتقل ہوتی ہے ایک وراثت، دوسرا وصیت وراثت میں تملیک بالجبر ہوتی ہے۔ یعنی میت کی مرضی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہر طرف وارث کو میت کی جائیداد خود بخود منتقل ہو جاتی ہے۔ اور وصیت میں تملیک بالرضا والاختیار ہوتی ہے یعنی مرنے والا اپنی رضا اور اختیار سے اپنے مال کا کچھ حصہ کسی کے لیے وصیت کر جاتا ہے۔

شریعت نے یہ فرق کر دیا ہے کہ جس کو بطور وراثت کے حق ملتا ہے اس کے لیے مال میں کوئی وصیت نہیں ہو سکتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لا وصيه لوارث'' وارث کے لیے وصیت صحیح نہیں ہے اور جس کے لیے وصیت کی جاتی ہے۔ اس کو وراثت میں کوئی حق نہیں ملتا۔

اب ایسا پوتا جو دادا کا وارث نہیں ہو سکتا اس کے لیے وصیت کا دروازہ کھلا ہوا ہے دادا اس کو ایک تہائی جائیداد کی وصیت کر کے اس کو صاحب جائیداد بنا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں یتیم کا نان نفقہ ضروریات زندگی کی کفالت دادا پر اسلام نے فرض کر دی ہے۔

اس طرح یتیم پوتے کی ضروریات کو اسلام نے دادا کی موجودگی میں پورا کرنے کا اصول وضع فرمایا۔ لیکن عائلی آرڈیننس میں جب تک دادا زندہ ہے اس وقت تک کے لیے یتیم پوتے کی کونسی چارہ جوئی کی گئی ہے مثلاً ایک پوتا جب چھ مہینہ کا ہوتا ہے اس کا باپ مر جاتا ہے اب عائلی قوانین میں اس کی کفالت کس کے ذمہ ڈالی ہوئی ہے؟ جب تک دادا زندہ ہے وہ اپنی جائیداد کا مالک ہے اس کی زندگی میں پوتے کو اس کی جائیداد سے کچھ نہیں دیا جاتا۔ جب تک دادا زندہ ہے چاہے وہ چالیس سال تک زندہ رہے چاہے پچاس سال تک زندہ رہے جب تک وہ زندہ ہے دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے کہ اس کی جائیداد تقسیم کر دے اور پوتے کو کچھ دلا دے اب اس عائلی قوانین میں اس چھوٹے بچے کی ضروریات کا کیا انتظام موجود ہے؟ کیا وہ دادا کے مرنے کی دعائیں کرتا رہے تاکہ اس کے مرنے کے بعد اس کچھ ملے؟

لیکن اسلام نے دادا کی زندگی میں ہی یتیم پوتے کو اس کی جائیداد سے فائدہ اٹھانے اور نان نفقہ وغیرہ ضروریات پوری کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

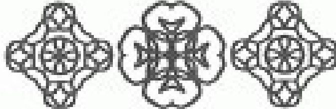
اور دادا کے مرنے کے بعد اگرچہ اسے وراثت میں کچھ نہیں ملتا مگر دادا کو اسلام نے یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں پوتے کے لیے ایک تہائی جائیداد کی وصیت کرے۔ اس طرح پوتے کے لیے جائز تملیک کی صورت نکل آتی ہے۔

ایک خدشہ کا جواب:

اگر یہ خدشہ ظاہر کیا جائے کہ دادا ظالم ہے (جیسے کہ عام طور پر ہوتا ہے) تو وہ پوتے کو کچھ نہیں دے گا اور نہ وصیت کرے گا اور اس طرح پوتا محروم ہو جائے گا تو میں

کہوں گا کہ آپ کا قانون بھی ظالم دادا کے ظلم کو نہیں روک سکتا۔ اگر باپ اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو پہلے ہی اپنی ساری جائیداد منتقل کر دے۔ تو اس طرح عائلی قانون کے ہوتے ہوئے وہ پوتے کو محروم کر سکتا ہے اور یہ قانون بھی دادا کے ظالم ہونے کی صورت میں پوتے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ بہرحال یہ دفعہ اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ مذہب کی روح کے خلاف ہے۔ صرف پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں یہ ظلم روا رکھا جا رہا ہے یہ بہت بڑا ظلم ہے اور مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ مسلمانوں کے جذبات کو شدید مجروح کرتا ہے۔ علاوہ ازیں حضرتؒ کے تبحر اور وسعت علم کے بے شمار واقعات ہیں، جن کا قلم بند کرنا مشکل ہے۔

یہ چند سطور جو میں نے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے متعلق اپنے محسوسات، مشاہدات اور مطالعہ کے تحت لکھی ہیں انھیں حضرت موصوفؒ کے احوال سے وہ نسبت بھی نہیں جو ایک قطرے کو سمندر سے ہو سکتی۔



مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۳

مفتی محمودؒ کی یادیں

مولانا نور محمد صاحب

مہتمم دار العلوم وزیرستان۔ وانا

مفتی محمودؒ اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۳)

''۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۴ء تک بندہ کا حضرت مفتی صاحب سے بہت قریبی تعلق اور وابستگی تھی مجھے یاد نہیں کہ مفتی صاحب کے کسی فتوے کو علمانے کسی سقم یا لغزش کی اساس پر مسترد کر دیا ہو یا آپ کو نظر ثانی کرنے کا مشورہ دیا ہو۔''

۱۹۵۱ء میں بندہ حصول تعلیم دین کے لیے مدرسہ قاسم العلوم کچہری روڈ ملتان میں داخلہ لے چکا تھا اور زہے قسمت کہ اسی سال مدرسہ کے منتظمین نے حضرت مفتی صاحب مرحوم کو مدرسہ میں بحیثیت مدرس متعین کیا تھا چوں کہ پورے مدرسہ میں مفتی صاحب ہی پشتون مدرس تھے اس لیے غیر مادری زبان کے ماحول میں مجھ جیسے نووارد کے لیے مفتی صاحب کی ذات گرامی میں محبوبیت اور جاذبیت کا پیکر بننا فطری امر تھا۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک ملتان میں مفتی محمود صاحب کے ساتھ بلاشبہ ایسا وقت گذرا ہے جیسے اولاد کا باپ کے ساتھ ایک ہی گھر میں گزرتا ہے۔

مجھے آج بھی یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندہ ناچیز کو علم و عقل اور فہم و بصیرت کے سمندر میں سے کچھ رشحات سے اگر نوازا ہے تو یہ حضرت مفتی صاحب کے طفیل ہی ہے۔

ان کی مخمور نگاہوں کا اثر ہو یہ حمید
شیشۂ دل میرا ٹوٹے بھی تو پیمانہ بنے

اگر کسی شخص سے کوئی پوچھے کہ سورج کا رخ کس طرف ہے تو وہ بلا تامل جواب دے گا کہ میری طرف ہے۔

آپ یقین کیجیے کہ میں آج بھی بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ملتان کے پانچ سالہ دور تعلیم میں مفتی صاحب کی شفقت کسی بھی شاگرد پر اتنی نہ تھی جتنی مجھ پر تھی۔ اور شاید آپؒ کا ہر ایک شاگرد ایسا ہی دعویٰ کرے۔

ذہانت:

علم کلام کے فن کی مشکل ترین کتاب ''خیالی'' ہم حضرت مفتی صاحبؒ سے

پڑھتے تھے جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد موسیٰ خان صاحبؒ جیسے ذہین طلبا درس ''خیالی'' میں شریک تھے۔

ایک دن دوران درس مفتی صاحب نے طلبا کے پاس موجود کتابوں کی چھپائی اور طباعت کے بارے میں معلوم کیا کہ قدیم طبع ہے یا جدید۔ اتفاق سے تمام کتابیں قدیم چھپائی کی تھیں۔ تب حضرت مفتی صاحب مسکرا کر فرمانے لگے کہ کل کے سبق میں حاشیہ کے اندر دو غلطیاں ہیں کوشش کریں کہ ان غلطیوں کو معلوم کرسکو اور ان کی اصلاح بھی بتاؤ۔

چناں چہ کل درس میں حاضری کے بعد سب سے پہلے حضرت مفتی صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا:

''بتاؤ کس نے حاشیہ کی غلطیاں ڈھونڈ نکالی ہیں؟''

طلبا نے خاموشی اختیار کرلی۔ بندہ نے خاموشی توڑتے ہوئے عرض کیا کہ ایک غلطی تو میں نے دریافت کی ہے۔ پھر مولانا موسیٰ خان صاحب بولنے لگے کہ ایک غلطی میں نے تلاش کی ہے۔ اتفاق سے ہم دونوں نے الگ الگ غلطیاں محسوس کی تھیں اور حضرت مفتی صاحب نے دونوں کی تصویب کرنے کے بعد فرمایا کہ:

''ہندوستان میں ہم حضرت مولانا عجب نور صاحب ہوتیؒ سے ''خیالی'' پڑھتے تھے اور یہی سوال آپؒ نے شریک درس طلبا سے کیا تھا اور دونوں غلطیاں صرف میں نے بتائی تھیں۔''

مفتی صاحبؒ کا حافظہ:

مذکورہ واقعہ سنانے کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو اتنی بڑی بات نہیں کہ آپ نے دونوں غلطیاں واضح کی تھیں بلکہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اتنی مدت گذرنے کے بعد بھی آپ کو وہ سبق اور صفحہ یاد ہے جہاں استاد نے ایک امتحان لیا تھا اور یقیناً ہر پڑھنے اور پڑھانے والا اس بات میں میری تائید کرے گا۔

مسائل اخذ کرنے اور حل کرنے کی مثالی قوت:

۱۹۵۳ء میں ثبوت رمضان کے لیے بندہ کے والد صاحب مرحوم نے ایک متشرع گواہ کی خبر پر رمضان ہونے کا حکم صادر فرمایا اور عید الفطر کے لیے حکم فرمایا کہ رمضان کے ۳۰ روزے پورے ہونے پر اگر مطلع ابر آلود ہوا تو عید الفطر ہوگی۔

قدرت کی شان دیکھیے کہ مذکورہ خبر کی بنا پر تیسویں روزے کے عصر کے وقت گرد وغبار کا ایسا طوفان آیا کہ سورج بھی مدہم دکھائی دینے لگا۔ عوام الناس نے تو والد صاحب کے فتوی پر کل عید منائی مگر حکومتی سطح پر روزہ تھا اب یہ مسئلہ موضوع بحث بنا کہ فاسق کی خبر پر کیوں کر عید صحیح ہوسکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

تعطیلات کے اختتام پر ملتان پہنچنے پر میں بار بار حضرت مفتی صاحب کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ آپ عید کے مسائل پر کوئی تحقیقی مقالہ تحریر فرماویں۔ کیوں کہ اس سال ملک کے طول وعرض میں روزہ اور عید کی یہی کیفیت تھی جو وانا میں پیش آچکی تھی۔

چناں چہ حضرت مفتی صاحب نے دس بارہ سوالات مرتب کرکے ملک کے چیدہ چیدہ علما کے پاس بھیج دیے اور جوابات آنے پر چوں کہ بعض مسائل میں اختلاف تھا لہٰذا ان علمائے کرام کی حضرت مفتی صاحب نے ۱۶ دسمبر ۱۹۵۴ء کو ملتان میں میٹنگ طلب کی۔

بندہ نے ''روزانہ مجلس علمی میں حضوری کی خاطر اسباق سے رخصت لی اور ہر مجلس میں حاضر رہتا ایک ایک مسئلہ میں علمی اختلافی موشگافیوں کا عجیب پرکیف ماحول ہوتا۔

ایک مسئلہ پر مفتی صاحب کا موقف بالکل الگ تھا مگر مفتی صاحب کے پاس اپنے دعویٰ پر کوئی جزئیہ بطور دلیل موجود نہ تھا بلکہ فقہا کی عبارات سے ضمنی طور پر حضرت مفتی صاحب اپنی بات ثابت کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ دوسرے علما نے آپ سے اتفاق نہیں کیا اور کہنے لگے کہ مفتی صاحب! یہ ضروری نہیں کہ دوسرے علما کی ذہنی

رسائی اس استنباط تک جا پہنچے لہٰذا بغیر کسی صریح جزئیہ کے کوئی فتویٰ دینا مناسب نہ ہوگا۔ چناں چہ حضرت مفتی صاحب نے اس مسئلہ پر بحث دوسری نشست تک ملتوی کردی۔

اب کوئی دیگر مسئلہ زیر بحث رہا جس کی وضاحت کے لیے غالباً حضرت مولانا محمد صادق صاحب ناظم امور مذہبیہ بہاول پور درمختار کی عبارت بڑی تیزی اور فصاحت کے ساتھ پڑھ رہے تھے اور مجلس علما ہمہ تن گوش تھی۔ کہ اچانک حضرت مفتی صاحب نے مولانا محمد صادق صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر فرمایا ”حضرت کتاب مجھے دیجیے۔“ چناں چہ اس نے کتاب مفتی صاحب کے ہاتھ میں تھمادی، مفتی صاحب کتاب دیکھنے لگے اور مجمع خاموش تھا کہ مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے چہرہ کے ساتھ سراٹھاتے ہوئے فرمایا ”لیجیے میرے سابقہ مسئلہ کا جزئیہ تو مل گیا“ جب آپ نے شامی کی عبارت دوبارہ پڑھ کر سنائی تو پورے مجمع نے بلانکیر آپ کی رائے کو تسلیم کرلیا۔

مطالعے کا انداز:

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ اپنے زیر درس کتابوں کا مطالعہ صبح چائے پیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے جیسے کوئی اخبار پڑھتے ہوئے سرسری نگاہ ڈالتا ہے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دل بہلاتے ہیں۔ حال آں کہ آپ مشکل ترین مباحث کی تہہ تک جا پہنچتے تھے۔ گویا کہ بغمزہ مسئلہ آموخت صد مدرس کرو۔ والی بات ہوتی تھی۔

بہرکیف رویت ہلال کے متعلق منعقدہ دوروزہ علمی مجلس میں طے شدہ مسائل کو یک جا کر کے حضرت مفتی صاحب مرحوم نے ایک رسالہ کی شکل میں اس کو شائع کیا جس کا نام ”زبدۃ المقال فی رویت الہلال“ رکھا گیا۔

قائدانہ صلاحیت:

پاکستان بننے کے بعد علمائے حق کی قوت منتشر ہوچکی تھی، عددی کثرت کے

باوجود ان میں معتدبہ جماعتی نظم وضبط کے فقدان کے سبب ملک وملت کی قیادت کی سکت نہ تھی۔ چناں چہ حضرت مفتی صاحب نے انفرادی طور پر ملک کے طول وعرض میں چیدہ چیدہ علمائے کرام کے پاس حاضری دینے کا سلسلہ شروع کیا اور غربت و افلاس کے ہوتے ہوئے اپنی جیب کے خرچہ پر ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس میں سفر کرتے رہتے آخر قاسم العلوم ملتان میں علمائے کرام کو ایک اعلیٰ سطحی اجلاس پر آمادہ کر کے اجلاس بلایا جس میں ”جمعیت علماء اسلام“ کا ڈھانچہ وضع کرنے اور جمعیت کی امارت کے لیے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کو منتخب کرنے میں آپ کامیاب ہوگئے۔ اس عظیم کارنامہ کو سرانجام دینے کے روز حضرت مفتی صاحب کی خوشی دیدنی تھی۔

پاکستان میں جمعیت علماء اسلام کی تشکیل کے لیے حضرت مفتی محمودؒ کی کامیاب کوشش نہ صرف علمائے حق کے سیاسی احیا کی ابتدا تھی بلکہ علما کے وقار، سیاسی بصیرت، جہاں بانی اور قیادت عامہ کی اہلیت رکھنے کے لیے سنگ میل ثابت ہوئی جس کا عروج ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے زوال کے زمانہ میں دنیا نے دیکھ لیا جب پاکستان کی جملہ مذہبی اور سیاسی قوتوں نے حضرت مفتی صاحب کی قیادت کے سامنے سرتسلیم خم کر کے آپ کو پاکستان قومی اتحاد کا صدر منتخب کیا۔ شاید علمائے اسلام کی تاریخ میں اس کی نظیر نہ مل سکے کہ خالص مذہبی عالم دین، قدامت پرست اور بنیاد پرست، صوفی منش شخصیت کی قیادت اور سیاست کے سامنے سیکولر اور لادینی قوتیں بغیر کسی استثنیٰ کے جھکنے پر متفق ہوچکی ہوں۔

یار من ایں دارد و آں نیز ہم

(میرا محبوب جملہ صفات کمال سے موصوف ہے)

مفتی محمودؒ کا تقویٰ:

جیسے ہمیشہ سے مذہبی علوم کے طلبا کا طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کی خدمت اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں حضرت مفتی صاحب کی خدمت کرنے، پاؤں

دبانے اور سر کی مالش کرنے میں طلبا ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش کرتے تھے الحمدللہ کہ بندہ ناچیز کو اس سلسلے میں خصوصی امتیاز حاصل تھا۔ وہ اس طرح کہ عموماً رات کو میں ہی حضرت کا سر مبارک مالش کیا کرتا تھا اور جب میں موجود ہوتا تو کسی دوسرے سے سر مالش نہیں کراتے تھے۔

لطیفہ:

ایک دن صبح کے وقت جلالی لہجہ میں فرمانے لگے کہ رات کو میری ناک سے خون بہنے لگا شاید مالش کرتے ہوئے میرے دماغ کو چوٹ لگا دی اور اس کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے ہمیشہ کے لیے سر کی مالش کرانا چھوڑ دیا۔ قلم کی شوخی دیکھیے کیا لکھنا تھا؟ اور کیا لکھ دیا؟ مگر

حدیث دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دیگر از سر گرفتم قصۂ زلف پریشان را

''موضوع پسندیدہ ہے اور بات بات سے اس کی یاد وابستہ ہے اس لیے زلف پریشان کی کہانی پھر ابتدا سے شروع کردی۔''

حضرت مفتی صاحب کے تقویٰ کی بات ہو رہی تھی۔ تو آپ کسی بھی بے ریش (یعنی امرد) صبیح اور ملیح طالب العلم کو بدن دبانے اور سر مالش کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اگرچہ اس ممانعت کی حکمت اس وقت ہم نہیں سمجھتے تھے۔

مفتی صاحب کی للّٰہیت:

میں نے دارالعلوم وانا کے متعلق چند نام لکھ کر بھیج دیے تاکہ اس میں سے مفتی صاحب ایک نام پسند کرلیں مثلاً نور المدارس، انوار العلوم، نور العلوم۔ مگر مفتی صاحب نے فرمایا کہ دنیا کی نسبتوں سے للّٰہیت کہیں بہتر ہے اور میرے تجویز کردہ نام مسترد کر کے (دارالعلوم وزیرستان وانا) نام رکھ دیا۔ فللّٰہ الحمد

مسنون اعمال کی پابندی:

۱۹۷۰ء کے الیکشن کے زمانہ میں ضلع ٹانک کے مضافات میں بمقام ''پائی'' تقریر کی غرض سے تشریف لا چکے تھے۔ چارپائی پر قبلہ رو دائیں کروٹ مفتی صاحب اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے سر مبارک کو ٹیک دیے ہوئے تھے اور ارد گرد چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے علما اور حاظرین سے ہم کلام تھے۔ اسی اثنا میں پینے کے لیے پانی طلب فرمایا۔ جب پانی لایا گیا۔ تو آپ بڑی دشواری سے اٹھ کر سیدھے بیٹھ گئے (چوں کہ ان دنوں مفتی صاحب کا بدن بہت بھاری بھرکم تھا) اور اپنے دائیں ہاتھ سے مسنون طریقہ پر پانی نوش فرمایا۔

اب میں نے بطور تفنن طبع عرض کیا کہ حضرت مفتی صاحب دائیں ہاتھ سے پینا تو ضروری نہیں کہ آپ نے اتنی تکلیف برداشت کی۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

''پانی یا کھانا خواہ دائیں ہاتھ سے ہو یا بائیں سے تشنگی اور بھوک تو جاتی رہتی ہے اور پیٹ بھی بھر جاتا ہے اور بدن کی غذائیت پوری ہو جاتی ہے مگر بائیں ہاتھ سے کھانے پینے کے نتیجہ میں غذائیت میں نورانیت نہ ہوگی لہٰذا اس غذائیت سے حاصل شدہ قوت جسمانی، عبادت کی راہ میں اعانت نہیں کرے گی اس لیے کہ جو بھی عمل سنت کے خلاف ہوتا ہے وہ نورانیت سے عاری ہوتا ہے۔''

مفتی صاحب کی بات نے جیسے تمام اشکالات حل کردیے کہ برکت اور بے برکت ہونے سے مادی نتائج مراد نہیں بلکہ اس سے مراد نورانیت کا حصول اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے معاون ہونا یا نہ ہونا ہے۔

چہ گوییت کہ چہ خوش آمدی مسیح صفت
بیک نفس ہمہ درد مرا دوا کردی

''میں تجھے کیا بتاؤں! آپ میرے لیے مسیحا ہیں ایک ہی پھونک سے

میرے سارے درد کا مداوا کر دیا۔''

سی ایم ایچ راولپنڈی میں:

چوں کہ ان دنوں بندہ ہری پور سینٹرل جیل میں بھٹو صاحب کے ہاتھوں پابند زنجیر اور دس سالہ قید کے ایام گذار رہا تھا اس لیے آنے والا تحریر شدہ واقعہ میرا چشم دید نہیں بلکہ میرے شاگرد اور معتمد دوست مولانا قاری لعل محمد شہیدؒ کی زبانی ہے۔

قاری صاحب نے مجھے خود سنایا کہ:

''ضیاء دورِ حکومت میں مفتی صاحب قلب کے عارضہ کے پیش نظر سی ایم ایچ راولپنڈی کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں داخل تھے اور میں آپ کی خدمت کے لیے ساتھ تھا۔ ڈاکٹروں نے حضرت مفتی صاحب کے دل کی کیفیات کی نگہداشت کرنے کی خاطر آپ کے جسم اور سینے کے ساتھ مختلف مشینوں کے کنکشن مربوط کر دیے تھے اور الگ کمرے میں ٹی وی کی اسکرین پر ڈاکٹر صاحبان مفتی صاحب کے دل کی حرکات دیکھتے رہتے۔

ڈاکٹروں نے حضرت مفتی صاحب پر انتہائی تاکید کی کہ اٹھنے بیٹھنے اور حرکت کرنے سے قطعی اجتناب فرمائیے نماز عشاء لامحالہ پڑھنی ہے تو تیمم اور لیٹے ہوئے اشارہ سے پڑھیے۔

رات گئے جب حضرت مفتی صاحب کو کچھ افاقہ ہوا تو مجھے فرمایا کہ میرے جسم سے مربوط تمام آلات ہٹالیں میں اٹھ کر وضو کرتا ہوں اور نماز پڑھتا ہوں۔''

میں نے بہت منتیں کیں کہ ایسا نہ کیجیے تو آپ نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ:

''میں ایسی زندگی نہیں چاہتا کہ مجھ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی سکت ہو اور میں لیٹ کر اشارہ سے نماز پڑھوں۔''

جب مفتی صاحب اٹھ کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے تو نگہداشت کرنے والے

ڈاکٹر صاحبان بھاگتے ہوئے مفتی صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جب انھوں نے مفتی صاحب کو دیکھا تو عرض کیا کہ حضرت یہ آپ کیا کر رہے ہیں مگر حضرت صاحب نے وہی جواب دیا جو مجھے دیا تھا اور انھیں بتایا کہ میں ہر حال میں کھڑے ہو کر رکوع اور سجدہ کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔

شیب اور فرخندہ چوں عہد شباب

''اس کا ضعف و بڑھاپا بھی نوجوانی جیسی مبارک اور چاک و چوبند۔''

بے جگری اور قوت ایمانی:

صدر یحییٰ خان کے مارشل لا کے دوران مجھے اطلاع دی کہ میں کوئٹہ براستہ ژوب وانا آؤں گا اور میرا یہ سیاسی دورہ ہے مجھے اندیشہ ہے کہ یحییٰ خان مجھ پر ہاتھ ڈالے گا اس لیے میں حکومت کو قبائل میں اپنی سیاسی قوت دکھانا چاہتا ہوں چناں چہ میں بات سمجھ گیا اور حضرت مفتی صاحب کے استقبال کے لیے وزیرستان بھر کے علمائے کرام کے علاوہ ٹانک، کلاچی اور ڈیرہ اسماعیل خان کے چیدہ چیدہ علمائے کرام کو دعوت دی۔ حضرت مفتی صاحب کا وہ تاریخی استقبال کیا جسے وزیرستان میں چشم فلک نے نہیں دیکھا ہوگا۔

وانا سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر بمقام سپین میں خود بمع علمائے کرام و احباب منتظر تھا۔ حضرت مفتی صاحب اکیلے ایک موٹر کار میں بمع ایک خادم آپہنچے۔ اب حضرت مفتی صاحب کو میں نے اپنی کار میں لے لیا۔ ڈرائیونگ میں خود کر رہا تھا دوران سفر میں نے عرض کیا کہ ایسے پُر خطر راستے پر بغیر کسی حفاظتی گارڈ و اسباب کے سفر کرنا تو بہت بے احتیاطی ہے اس پر آپ نے فرمایا:

''دگور شپه په کور کیدائی نه شی۔''

''یعنی قبر کی رات گھر پر نہیں گذاری جاسکتی۔''

اور پھر فرمایا کہ:

"اگر آپ نے حفاظتی اقدامات کر رکھے ہوں تو دشمن بڑے پیمانہ پر حملہ آور ہونے کا انتظام کرے گا اور اگر حفاظتی تدابیر نہ ہوں تو دشمن معمولی انتظام کرے گا۔"

قضا دیگر نشود گر ہزار نالہ و
بشکر یا بہ شکایت بر آید از دہے

"تقدیر نہیں بدلتی خواہ کوئی بطور شکر یہ قبول کرے یا شکایت کر کے چیخے پکارے سو جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔"

سادگی اور درویشی:

میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب نے زندگی بھر کھانے، پینے، لباس اور رہائش وغیرہ میں کبھی بھی اپنے نفس کو خوش نہیں کیا ہوگا۔ جو کھانا سامنے آیا شوق سے تناول فرمایا جہاں بیٹھنے کو جگہ ملی اپنے کندھے سے رومال اتار کر اس پر بیٹھ گئے خواہ مسند درس پر رونق افروز ہوں یا وزارت اعلیٰ کی کرسی پر تشریف فرما، آپ کی طبعی ساخت میں کسی نے تبدیلی محسوس نہ کی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ دشمن بھی اس کی گواہی دیں گے۔

ایک لطیف نکتہ:

مفتی صاحب مرحوم کے وزارت اعلیٰ کے ایام میں بندہ مع چند مخلص شاگردوں کے آپ کے ہاں چیف منسٹر ہاؤس میں چند دن کے لیے ٹھہرا ہوا تھا رات جب دستر خوان پر کھانا سجایا گیا تو سادہ بے روغن گوشت مونگ کی دال اور چپاتی بمعہ سلاد رکھا گیا اور بس میرے ساتھیوں نے حضرت مفتی صاحب سے نظریں چرا کر ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ کیا یہ کھانا کھایا جاسکتا ہے؟

نگفت و من بشنیدم ہر آنچہ گفتنی داشت
کہ در بیان نگنجش کرد بر زبان قدیم

"زبان سے تو وہ کچھ نہیں بولا مگر جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ میں سمجھا کیوں کہ انھوں نے آنکھوں آنکھوں میں سابقہ انداز سے سب کچھ بیان کیا۔"

(ثانی مصرع میں لفظ "در" زائد ہے)

دوسرے دن میرے رفیقوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم تو آئندہ کھانا ہمیشہ بازار سے کھائیں گے۔ یہ کھانا تو ہم سے نہیں کھایا جاسکتا۔ حضرت مفتی صاحب کو ان کی غیر موجودگی کا سبب جب معلوم ہوا تو ہنسنے لگے اور فرمایا کہ ہمارے ہاں تو یہی کھانا ہوتا ہے۔

علمی برتری اور علو مقام:

چوں کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۴ء تک بندہ کا حضرت مفتی صاحب سے بہت قریبی تعلق اور وابستگی تھی مجھے یاد نہیں کہ مفتی صاحب کے کسی فتوے کو علما نے کسی سقم یا لغزش کی اساس پر مسترد کر دیا ہو یا آپ کو نظر ثانی کرنے کا مشورہ دیا ہو۔

شعر گوئی کا ملکہ:

قاسم العلوم میں زیر تعلیم ہونے کے دوران جمعے کی رات کو چھٹی ہوا کرتی تھی یہ رات مفتی صاحب کی محفل میں گذرتی تھی اور آپ کی کوشش ہوتی کہ تفریح طبع کے ساتھ ساتھ اس مجلس میں ذہنی بالیدگی کا پہلو بھی نکل آئے چناں چہ مشاعرہ کی محفل منعقد ہوتی۔ ہم مجلس حاضرین کے دو گروہ بن جاتے اور مفتی صاحبؒ بھی کسی ایک گروہ میں شامل ہو جاتے لیکن مفتی صاحب پر یہ پابندی لگا دی جاتی کہ وہ اپنی طرف سے شعر نہیں کہیں گے یہ اس لیے کہ محفل شروع ہونے پر اپنی طرف سے برمحل شعر پیش کرنا مفتی صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا گویا حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے اس شعر کے مصداق تھے۔

ولولا الشعر بالعلماء یزری
لکنت الیوم اشعر من لبید

رجم کے بارے میں زریں نکتہ:

جناب حضرت مولانا قاری لعل محمد شہیدؒ نے مجھے خود سنایا کہ حضرت مفتی صاحب کی بیماری کے ایام میں رابطہ عالم اسلامی کے مذہبی امور کے کلیدی عہدہ دار جناب ڈاکٹر دوالبی صاحب مفتی صاحب سے ملنے سی ایم ایچ تشریف لے آئے تو دوالبی صاحب نے مفتی صاحب سے عرض کیا کہ رجم کے بارے میں میری ایک تجویز ہے اور دنیا بھر کے علمائے کرام اور علمی اداروں نے میری تجویز سے نہ صرف اتفاق فرمایا ہے بلکہ تحسین کی ہے جس پر آپ کی رائے معلوم کرنے آیا ہوں وہ یہ کہ:

''میں چاہتا ہوں کہ جب زانی اور زانیہ پر زنا کا ثبوت ہو جائے اور ان کی سزا رجم (سنگ ساری) ہو تو چاہیے کہ انھیں بندوق کی گولی ماری جائے اس لیے کہ رجم سے مقصود تو مجرموں کو سرعام قتل کرنا ہے اور یہ مقصد گولی مارنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے اور اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ رجم کے خلاف یورپ کے پروپیگنڈے کا توڑ ہو جائے گا۔''

حضرت مفتی صاحب نے جواب میں فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب آپ کو اور آپ کی تائید کرنے والوں کو مغالطہ یہاں سے ہوا ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ رجم سے مقصود مجرموں کو قتل کرنا ہے حال آں کہ رجم سے مجرموں کی زندگی بچانا ہے وہ اس طرح کہ آپ جانتے ہیں کہ سنگ ساری کی ابتدا ہی چار گواہ خود کریں گے جن کی گواہی کی اساس پر مجرم کو سنگ سار کیا جا رہا ہے۔ اگر سنگ ساری کا بھیانک منظر دیکھ کر کسی ایک گواہ نے بھی دوران سنگ باری اپنی گواہی سے رجوع کیا تو فوراً موقعہ پر موجود قاضی سنگ ساری روک دے گا اور مجرم کی جان بچ جائے گی نیز اگر مجرم کے اقرار پر سنگ ساری کا حکم جاری ہوا ہے تو جس مرحلے پر مجرم نے اپنے اقرار سے رجوع کا اعلان کیا اسی وقت قاضی صاحب سنگ ساری موقوف کر دے گا اور گولی مارنے سے یہ حکمتیں فوت ہو جائیں

گی۔ رہی یورپ کی بات تو یورپ والوں کو شرعی احکامات کے فلسفے کی کیا خبر؟''

قاری لعل محمد مرحوم کا بیان ہے کہ:

''حضرت مفتی صاحب کا بیان سن کر ڈاکٹر دوالبی صاحب اپنی نشست سے اٹھ کر حضرت مفتی صاحب سے گلے ملے اور آپ کا بوسہ لیا اور عرض کیا کہ یہ راز اور حکمت آج مجھ پر منکشف ہوئی کہ رجم کا مقصد مجرم کی جان لینا نہیں بلکہ جان بچانا ہے۔ لہٰذا میں اپنی تجویز آج سے واپس لیتا ہوں۔''

تا بدانی کہ بچندین صفت آراستہ بود

''چاہیے کہ تو سمجھے کہ وہ کتنے صفات کمال سے آراستہ تھے۔''

وسعت نظر:

ایک مجلس میں حضرت مفتی محمود صاحب نے پاکستان میں نفاذ اسلام کے حوالہ سے فرمایا کہ:

''میں نے ارباب حکومت پر واضح کیا کہ تم لوگ عوام کو گمراہ کرنے کے لیے جو کہتے ہو کہ ہم کس فرقہ اور مسلک والوں کا اسلام نافذ کریں ہم تو اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں مگر یہ مولوی لوگ آپس میں متفق نہیں ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے انھیں بتایا کہ مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے اگر تم درجہ اباحت کی حد تک کوئی قانون بنا دو تو بھی ہمیں قبول ہوگا۔''

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت مفتی صاحب کا یہ بیان اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا۔

اعتدال پسندی:

ملتان میں نوجوان طلبا پر دیوبندی اور بریلوی اختلافات کا بھوت سوار رہتا شاید اس بنا پر کہ کچہری روڈ پر مدرسہ ''قاسم العلوم'' (دیوبندی مسلک) اور مدرسہ ''انوار العلوم'' (بریلوی مسلک) ایک دوسرے سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ مسلم شریف کے درس میں غالباً اس حدیث شریف **''انما انا قاسم واللہ یعطی''** کی تشریح پر طلبا نے بریلوی، دیوبندی اختلاف کی بحث چھیڑ دی حضرت مفتی صاحب نے اچانک بریلوی مسلک کی طرف داری شروع کر دی اب تو طلبا (جو کہ علما ہی تھے) نے اپنے دلائل کی بھرمار شروع کر دی۔

حضرت مفتی صاحب نے نرم لہجے میں طلبا سے چار مقرب فرشتوں جبرائیل، میکائیل، عزرائیل اور اسرافیل علیہم السلام کے فرائض منصبی اور خدمت گذاری کے بارے میں سوال کیا۔ طلبا نے بتا دیا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے فرائض میں وحی لانا، انبیا علیہم السلام اور اولیا اللہ کی مدد کرنا اور اعداء اللہ تعالیٰ کو شکست دینا، ہلاک کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ میکائیل علیہ السلام کے فرائض ہوائیں چلانا، بارش برسانا، نباتات کی پرورش، حیوانات کے ارزاق وغیرہ جیسے انتظامات شامل ہیں۔ عزرائیل علیہ السلام کی ذمہ داریوں میں ارواح قبض کرنا اور اسرافیل علیہ السلام کے فرائض میں صور پھونکنا، اعلان فنا کرنا اور کائنات کا نظم ونسق درہم برہم کرنا شامل ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نے دوسرا سوال کیا کہ: خیر البشر افضل ہے یا خیر الملائکہ افضل ہے؟ یعنی انسانوں میں جو سب سے اولیٰ ہے (مثلاً انبیاء علیہم السلام) ان کا درجہ بلند ہے۔ یا فرشتوں میں جو برگزیدہ اور اعلیٰ ہیں (مثلاً مذکورہ چار مقرب فرشتے) ان کا مرتبہ بلند ہے؟ طلبا نے بیک آواز کہا کہ ''خیر البشر افضل ہے۔''

حضرت مفتی صاحب کا تیسرا سوال: اگر عزرائیل علیہ السلام کو قابض ارواح کہا جا سکتا ہے، جبرائیل علیہ السلام کو ناصر اولیا اللہ تعالیٰ اور ہالک اعداء اللہ کہا جا سکتا ہے، میکائیل علیہ السلام کو منتظم ارزاق وغیرہ کہا جا سکتا ہے اور اسرافیل علیہ السلام کو کائنات

کے فنا کا انچارج کہا جا سکتا ہے اور یہ کہنے سے کوئی شرک لازم نہیں آتا۔ تو بھلا اگر دینے والا اللہ تعالیٰ ہو اور حضور علیہ السلام کو تقسیم کرنے والا کہا جائے تو اس سے کیوں کر شرک لازم آئے۔

اب تو حاضرین درس پر لاجوابی اور خاموشی کا سکتہ طاری ہو گیا اور حضرت مفتی صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ سے گویا کہ دعوت دے رہے تھے **''ھل عندکم من حجۃ فاتوابھا''** اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے فرمایا میں نے قصداً ایسا لہجہ اختیار کیا تاکہ تمھیں اختلافی مسائل میں راہ اعتدال پر گامزن کیا جا سکے ایسا نہ ہو کہ یہاں سے نکل کر اپنے علاقہ میں کافر اور مشرک بنانے کی مشینیں بن کر رہ جاؤ۔

طے شود جادہ صد سالہ بہ آہے گاہے

''کبھی کبھار عمر بھر کی محنت سے حاصل ہونے والے علوم ایک ہی بات سے حاصل ہو جاتے ہیں۔''

تاریخی اعلان:

پاکستان کے سابق صدر ایوب خان اور فاطمہ جناح کے صدارتی انتخاب میں کل پاکستان جمعیت علماء اسلام کی شوریٰ کا سہ روزہ اجلاس مدرسہ قاسم العلوم کچہری روڈ ملتان میں حضرت مفتی صاحب نے بلایا تھا جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے چوٹی کے علمائے کرام نے بھرپور انداز میں شرکت کی تھی اس اجلاس میں بندہ خود موجود تھا علمائے کرام نے بڑی آزادی سے اپنی اپنی رائے کا اظہار فرمایا اصل موضوع یہ تھا کہ جمعیت صدارتی انتخاب میں کس کا ساتھ دے۔ جمعیت کا اجلاس ایسے وقت ہو رہا تھا کہ ملک کی اہم مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے ایوب خان کی آمریت اور بدنام زمانہ عائلی قوانین کے نفاذ کی شکل میں تحریف فی الدین کے خلاف وسیع تر اتحاد قائم کر رکھا تھا۔ صدر ایوب خان کی سیاہ کاریوں کے خلاف عوام کے اندر لاوا پک رہا تھا جمعیت علماء اسلام پر ہر طرف سے زبردست دباؤ تھا کہ وہ صدر ایوب کے خلاف ملک بھر کی

سیاسی پارٹیوں کے اتحاد میں شامل ہو جائے۔

جمعیت کے آخر اور فیصلہ کن اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے جمعیت علماء اسلام کے امیر حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ نے اپنے مخصوص جلالی لہجہ میں فرمایا کہ:

"میں رات بھر استخارہ کرتا رہا اور ہر بار مجھے بتایا گیا۔ "کلا هما في النار" یعنی دونوں امیدوار آگ کی لپیٹ میں ہیں۔ یہ سن کر علما کے عظیم مجمع پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔"

اس کے بعد حضرت مفتی محمود مرحوم بحیثیت جنرل سیکرٹری کل پاکستان جمعیت علماء اسلام کے اجماعی فیصلہ سنانے کے لیے کھڑے ہوگئے آپ نے مختلف اجلاسوں میں تقاریر کرنے والے علما کے بیانات پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد فرمایا کہ:

"صدر ایوب خان میں کوئی بھی خوبی نہیں بجز اس کے کہ وہ مرد ہے اور اس کے مقابلہ میں فاطمہ جناح میں کوئی عیب نہیں بجز اس کے کہ وہ عورت ہے۔

اس لیے جمعیت نے متفقہ فیصلہ صادر کر دیا کہ اس انتخاب میں جمعیت علماء اسلام غیر جانب دار رہے گی اور دونوں امیدواروں میں سے کسی ایک کی بھی حمایت نہیں کرے گی۔"

یہ گویا کہ جمعیت علماء اسلام کا فیصلہ ہی نہ تھا بلکہ علمائے دیو بند کا اجماع تھا۔

یہ انتشار و ابتری یہ خاک بر سر ما
چلو بھی چل کہیں مفتی کو ڈھونڈ کر لائیں

"علمائے اسلام کا موجودہ وقت میں تتر بتر اور خوار و ذلیل ہونا کس سے پوشیدہ ہے اگر اس کا تدارک چاہتے ہو تو چلے آؤ کہ حضرت مفتی کو ڈھونڈ لائیں یعنی اس کی روش اپنائیں۔"

عادت بجمع بودن احباب کردہ ایم
مابو نہ میکنیم گلے را کہ دستہ نیست

"ہم تو علما کے ایک ساتھ چلنے اٹھنے اور بیٹھنے کے عادی ہو چکے ہیں یعنی گل دستہ کی مخلوط خوش بو سونگھنے کی عادت بنی ہے اس لیے اب کسی اکیلے ایک پھول سونگھنے کو جی نہیں چاہتا۔"

زمانہ شناس فراست:

۱۹۷۰ء میں جب کہ چاند پر کمندیں ڈالنے اور مسخر کرنے میں روس، امریکا ایک دوسرے سے سبقت لینے کے لیے کوشاں تھے۔ اسلام ایک نئے چیلنج سے دو چار تھا کہ آیا انسان کے لیے چاند تک رسائی ممکن ہے؟ افلاک کے بارے میں یونان کے قدیم اور مسلّم شدہ علوم کے پیش نظر چاند پر قدم رکھنا کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ چوں کہ علمائے اسلام نے انھیں علوم کو قرآنی آیات کی تفسیر اور تشریح کی حیثیت سے تفاسیر میں اپنایا ہے اس لیے عام طور پر اکثر علما یہی کہتے تھے کہ از روئے اسلام چاند پر انسان کا پہنچنا محال ہے۔

راول پنڈی میں بندہ نے اس مشکل کو حل کرنے میں حضرت مفتی صاحب سے سوال کیا آپ نے فرمایا کہ:

"انسان کا چاند پر قدم رکھنے کا شرعی احکامات اور قرآن وحدیث سے کوئی منافات نہیں ہے بلکہ ایسا ہونا تو قرآن وحدیث کے لیے باعث تائید و تصدیق ہوگا۔"

اس مرحلہ پر قرآنی آیات سے پیش آمدہ بعض اشکالات میں نے پیش کیے جس کی حضرت مفتی صاحبؒ نے بے غبار وضاحت فرما کر مجھے مطمئن فرمایا۔ اب میں نے عرض کیا کہ علما اور عوام الناس کی رہنمائی کے لیے اس بارے میں کوئی بیان شایع کیا جائے اس لیے کہ عام طور پر واعظان اور آئمہ صاحبان دین اسلام کے حوالہ سے چاند پر رسائی کو ناممکن قرار دیتے ہیں حال آں کہ ہر جاننے والا جانتا ہے کہ عن قریب یہ طاغوتی قوتیں (روس، امریکا) چاند پر قدم رکھنے والی ہیں خدانخواستہ علمائے اسلام کی

روش باعث تکذیب اسلام نہ بنے۔

میرے سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ:

"آج اگر قبل از وقت ہم یہ وضاحت کرلیں تو یہی واعظان اور آئمہ صاحبان ہمیں بھی کافر بنادیں گے مگر جب دنیا دیکھ لے گی کہ انسان نے چاند پر قدم رکھ دیا اس وقت اگر ہم یہی وضاحت اخبارات میں شائع کردیں تو یہی واعظان اور ائمہ صاحبان ہمیں بطور ہیرو پیش کریں گے۔"

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

"من لم یعرف اهل زمانه فهو جاهل."

آخری ملاقات:

ہری پور سینٹرل جیل کے حکام نے اطلاع دی کہ مغرب کے بعد حضرت مفتی صاحب ملاقات کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ طویل جدائی کے بعد پس سلاخ زندان محبوب سے ملنے کی بشارت کی قدر و قیمت وہی جانتا ہے جسے کوچہ محبت سے گذرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہو۔ حضرت مفتی صاحب ہزارہ ڈویژن کے اکابرین کے ساتھ جیل کے اندر تشریف لائے جیل حکام نے چائے کا انتظام کیا تھا طویل گفتگو کے بعد فرمایا "میں آپ کی رہائی میں بالکل ناکام ہوا" میں نے اطمینان اور خندہ پیشانی سے عرض کیا حضرت اب تو میری اسیری کے بہت تھوڑے ایام رہ گئے ہیں ان شاءاللہ تعالیٰ۔ اس لیے فکرمندی کی کوئی بات نہیں۔ الوداع کرتے ہوئے میں نے حضرت کے ہاتھ میں دوسو روپے تھما کر عرض کیا کہ یہ احباب کی چائے ہے مگر مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے رقم واپس کردی اور فرمایا کہ "انھیں کیوں شرمندہ کرتے ہو" تاہم ناکامی کے یہ الفاظ کہ "میں آپ کی رہائی میں بالکل ناکام ہوا" شاید حضرت کی زبان سے پہلی بار نکلے ہوں۔

رہائی کے بعد جب میں ڈیرہ اسماعیل خان کے ڈویژنل کمشنر جہاں زیب خان

سے ان کے دفتر میں ملا تو دوران گفتگو انھوں نے کہا کہ:

"حضرت مفتی صاحب اگر اپنے ساتھ قبر میں کوئی تمنا لے گئے ہوں تو وہ آپ کی رہائی کی تمنا ہوگی۔ کیوں کہ جب بھی حضرت مفتی صاحب سے ملا ہوں تو آپ کی رہائی کی بات فرماتے تھے۔"

وفات کی خبر اور جیل:

جیل میں ریڈیو پر اپنے مشفق استاد کی وفات کی خبر سن کر پس دیوار زنداں اپنے آپ کو انتہائی بے کس، بے آسرا اور یتیم محسوس کیا کہ اس جیسے تجربہ سے پہلی مرتبہ گذرا اور جی بھر کر اتنا رویا کہ آنسو اور سسکیاں روکنا میری بس کی بات نہ رہی۔

آں کہ دل از فکر آں می سوخت بیم ہجر بود
آخر از بے مہریٔ گردوں بہ آں آموختیم

ایسا کہاں سے لاؤں؟

صدر ضیاء الحق مرحوم کی حکومت میں جمعیت علماء کی طرف سے نامزد وزیر امور قبائل حاجی فقیر محمد خان صاحب اگرچہ بعض مسائل پر تبادلۂ خیال کے لیے دوران وزارت جیل تشریف لے آئے تھے مگر وہ موضوع سے خارج مسائل تھے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم کی وفات اور وزارت کے بعد موصوف دوبارہ جیل تشریف لائے اور جن مسائل پر مجھ سے مشورہ طلب کیا ان میں سے اہم مسئلہ حضرت مفتی صاحب کے بعد خلا پر کرنے کا تھا۔

میں نے عرض کیا کہ اگر آپ صاحبان سمجھتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب کا خلا کسی ایک شخص سے پر کیا جا سکے گا تو میرے خیال میں یہ قطعاً ناممکن ہے۔ چاہیے کہ چاروں صوبوں میں سے چار رکنی بورڈ کو منتخب کیا جائے اور پھر اس بورڈ کا ایک اعزازی کنوینر ہو یہ بورڈ حضرت مفتی صاحب مرحوم کا قائم مقام ہو تو عین ممکن ہے کہ کسی حد

تک یہ خلا پُر ہو سکے ورنہ مفتی صاحب کا خلا پُر کرنا تب ممکن ہوتا اگر قدرت مفتی محمودؒ جیسی جامع کمالات شخصیات پیدا کرنے میں صدیوں بلکہ ہزاروں سال کے وقفہ سے کام نہ لیتی۔

تا صد ہزار خار نمی روید از زمین
از گلبن گلے بگلستان نمی رسد
یعقوب را دو دیدہ ز حسرت سفید شد
آوازہ ز مصر بکنعان نمی رسد

"تا وقتیکہ ہزاروں کانٹے زمین سے نہ نکلیں اس وقت تک باغ سے کسی کے ہاتھ پھول نہیں آئے گا۔

دیدار یوسف علیہ السلام کے لیے یعقوب علیہ السلام کی بینائی چلی گئی پھر بھی مصر سے کوئی خوش خبری نہیں آتی۔"

نوٹ: ان اشعار کا مطلب بعینہٖ وہی ہے جو علامہ اقبال کے شعر "ہزاروں سال نرگس" کا ہے کثرت استعمال کی بنا پر وہ میں نے چھوڑ دیا۔

مزارِ پُر انوار پر:

رہائی کے بعد اپنے مشفق مربی کی زیارت کے لیے میں ایسے موقعہ کے تلاش میں تھا کہ بالکل اکیلے میں زیارت پر حاضری دوں تا کہ دل کی بھڑاس اچھی طرح نکالنے کا موقعہ میسر آ سکے کیوں کہ میں اپنے قلب وجگر کی کمزوری سمجھ رہا تھا۔

نالہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست
سر بہ صحرا می زنم فریاد خاطر خواہ نیست

"آبادی کے اندر آہستگی سے رونے سے دل کی بھڑاس نہیں نکلتی اس لیے ویرانے کا رخ کرتا ہوں تا کہ خوب چیخ وپکار کر روؤں۔"

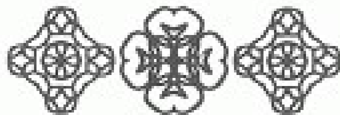
خواہش کے باوجود ایسا موقعہ حاصل نہ کر سکا۔ آخر کار جب آپ کے مزار پر

حاضری نصیب ہوئی تو بخدا ایسی کیفیت طاری ہوئی جیسے میں حضرت مفتی صاحب کے کمالات دیکھ رہا ہوں جو تمام فضا پر چھا جانے کے باوجود زمین کے چند فٹ گڑھے میں ہمیشہ کے لیے قدرت نے دفن کر دیئے اور غیر ارادی طور پر ہی دل میں یہ ورد جاری ہوا۔

(اے صمد تیری صمدیت کو سلام)

بحرفے میتوان گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

"ایک ہی لفظ سے دنیا کی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ مگر میں نے ہم کلامی اور وصال (ذہنی) سے لطف اندوز ہونے کی خاطر بات کو طول دے دی۔"



حسنِ سیاست

مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۴

سیاسی جدوجہد پر ایک نظر

ابو معاویہ خواجہ محمد زاہدؔ

مرکزی نائب امیر جمعیت علماء اسلام

پاکستان

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۴)

''ایوب خان کا دور جبر و استبداد کا مرقع تھا۔ اس دور میں حزب اختلاف کی حیثیت سے کردار ادا کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ ہر رکن کی خفیہ پولیس والے نگرانی کرتے تھے۔ اور حکومت لوگوں کو دباؤ میں رکھتی تھی۔ لیکن تمام تر مشکلات کے باوجود حضرت مفتی صاحب نے اسلام اور آزادی اظہار کا چراغ جرأت و بہادری اور تدبر سے روشن رکھا۔''

مفتی صاحب، چودھویں صدی کا تتمہ اور پندرھویں صدی کی تمہید تھے۔ جن کا ہر قدم تاریخ کے ابواب کا عنوان تھا۔ یہ وہ بوریا نشین تھا۔ جس کی للکار اقتدار کے ایوانوں میں لرزہ پیدا کر دیتی تھی۔ یہ وہ رہنما تھا جو قوم کے دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔ یہ وہ مسجد کا مولوی تھا جس کے سامنے بہت بڑا آمر اپنے تمام تر ہتھکنڈوں کے باوجود بھی نہ ٹھہر سکا تھا۔ ایسی عظیم ہستی کی سیاست پر لکھنا میرے جیسے ناکارہ انسان کے بس کی بات نہیں لیکن حضرت مفتی صاحب مرحوم سے جو تعلق خاطر اس ناچیز کو رہا ہے اس نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اللہ تعالیٰ سے نصرت و مدد کی امید پر آگے بڑھتا ہوں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کے اپنے الفاظ میں ان کی زندگی کے واقعات سے اپنے مقالہ کی ابتدا کرتا ہوں۔ انھوں نے خود اپنی زندگی کا مختصر حال یوں بیان فرمایا۔

''میں ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک چھوٹے سے گاؤں پنیالہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم میں نے اپنے گاؤں ہی کے ہائی اسکول میں پائی۔ جہاں میں ہر جماعت میں اول درجہ میں کامیابی حاصل کرتا رہا۔ میرے والد نامور مذہبی عالم، شیخ طریقت اور چاروں سلسلوں میں مجاز تھے۔ گاؤں میں ہمارا ایک کچا مکان تھا جو آج بھی ہے۔ آبائی پیشہ زمین داری تھا۔ جو اس وقت چھوٹے بھائی مولانا محمد ڈیروی کے سپرد ہے۔ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں ہندوستان چلا گیا، جہاں دیوبند، سہارن پور اور مراد آباد کے مدارس میں میں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ زمانہ طالب علمی میں مجھے مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا سید فخر الدین رحمہم اللہ

جیسے بزرگوں سے شرف نیاز حاصل رہا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جن سے میں متاثر ہوا۔ میری سیاسی تربیت اور میرا سیاسی شعور انہی بزرگوں کا مرہون منت ہے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں میں نے طالب علم کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب پورے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بائی کاٹ کی مہم چلائی گئی۔ تو ہم نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا میں اس وقت جمعیت علمائے ہند کی آل انڈیا کونسل کا رکن اور سرحد کی جمعیت علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا۔'' (قومی ڈائجسٹ۔ صفحہ ۲۳۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا ۱۹۳۷ء میں ۱۸ سال کی عمر میں جمعیت علمائے ہند کی حمایت میں انتخابات میں حصہ لے کر کی۔ اس انتخابی مہم میں آپ نے مرادآباد کے دور دراز علاقوں کا دورہ کیا اور تعلیم سے فراغت کے بعد باقاعدہ جمعیت علمائے ہند سے وابستہ ہوگئے جیسا کہ آپ نے خود اس کی تصریح فرمائی کہ ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا جمعیت علمائے ہند کی جنرل کونسل اور سرحد جمعیت کی ورکنگ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے برطانوی سامراج کے بائی کاٹ کی مہم میں قائدانہ حصہ لیا، درس وتدریس کے ساتھ تحریک آزادی میں برابر حصہ لیتے رہے۔

۱۹۴۶ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا۔ تو آپ بھی جنوبی اضلاع میں ان کے ساتھ رہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر اپنے رفقا (مولانا محمد نعیم لدھیانوی، مولانا عبدالحنان ہزاروی) سمیت جمعیت علما اسلام میں شمولیت اختیار کرلی۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں اور ان کے بعد جمعیت علما اسلام کے جتنے مرکزی اجلاس ہوئے ان میں شریک ہوتے رہے۔ (مولانا محمد عبداللہ قومی ڈائجسٹ لاہور)

حضرت مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ قیام پاکستان کے بعد کا زمانہ جمعیت علما اسلام کے راہ نماؤں کے لیے بہت سخت تھا۔ خاص طور پر صوبہ سرحد میں ان کے لیے رہنا دوبھر ہوگیا تھا۔ اس زمانہ میں چوبیس گھنٹے ہماری نگرانی کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ چلنا پھرنا اور رہنا سہنا ہر کام نگرانی میں ہوا کرتا تھا۔ حکومت کی ان سختیوں کی وجہ سے جمعیت علما اسلام پورے سات سال تک منظم نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ صرف تقسیم ہند کی مخالفت تھی۔ حال آں کہ پاکستان ایک جمہوری عمل کی وجہ سے معرض وجود میں آیا تھا۔ لیکن پاکستان بنانے کے حامی دوسروں کے اس جمہوری حق کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اور اب تک وہ اسی مرض میں مبتلا چلے آرہے ہیں۔

متحدہ ہندوستان کے نظریہ کی وضاحت:

متحدہ ہندوستان کے بارے میں اپنے نظریات کے بارے میں حضرت مفتی صاحب نے یوں وضاحت فرمائی:

''ہم تقسیم ہند کے حامی نہیں تھے۔ تاہم جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تقسیم ہند کی مخالفت کرنے والوں کا پاکستان بنانے میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل درست بات نہیں۔ اس لیے کہ پاکستان جنگ آزادی کی کامیابی کا نتیجہ تھا۔ اور ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے آزادی کی جنگ لڑ کر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے پاکستان کا راستہ ہموار کیا۔ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں ہماری ایک مستقل رائے تھی۔ جمعیت علما ہند کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان ایک رہے، جب کہ اس کے تمام صوبوں کو مکمل خودمختاری حاصل رہے۔ مرکز کے پاس صرف دفاع، کرنسی اور امور خارجہ کے محکمے رہیں۔ بقیہ تمام امور میں سب صوبے مکمل خودمختاری کے حامل ہوں اس وقت ہندوستان کے (۱۳) تیرہ صوبے تھے۔ ان میں سے چھ صوبوں میں مسلمان اور سات صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ہم سمجھتے تھے اس طرح پورے بنگال، پورے آسام، متحدہ پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان میں مسلمان حکومتیں بنیں گی

اوران صوبوں میں کم از کم مسلمان بالکل محفوظ ہوں گے۔''

آپ نے آگے بات بڑھاتے ہوئے فرمایا:

مرکزی حکومت سے متعلق بھی جمعیت علمائے ہند کا ایک فارمولہ تھا۔ جس کے مطابق ہمارا مطالبہ تھا کہ مرکزی حکومت میں ہندو اور مسلمانوں کو دو بڑی اکثریتیں تسلیم کیا جائے اور دونوں کو ۴۵، ۴۵ فیصد نمائندگی دی جائے۔ جب کہ بقیہ دوسری اقلیتوں کو حاصل ہو۔ اس طرح ہم سمجھتے تھے کہ ہندو کی عددی اکثریت بھی قابو میں آجائے گی اور مرکز میں بھی مسلمانوں کے حقوق غصب ہونے کے راستے مسدود ہوجائیں گے، کانگریس نے جمعیت علمائے ہند کے اس فارمولے کو تسلیم کرلیا تھا۔ ہم متحدہ ہندوستان میں صوبائی خودمختاری کے ساتھ رہنے کے لیے اس لیے بھی حامی تھے کہ اس طرح ہم غیر ملکی طاقتوں کی سازشوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ بہرحال یہ دیانت داری کے ساتھ رائے کا اختلاف تھا اور جب مسلمانوں کی اکثریت نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا تو ہم نے بھی خوشی کے ساتھ اسے تسلیم کرلیا اور ۱۹۴۷ء میں ہم نے حکومت پاکستان کو یہ یقین دلادیا کہ پاکستان کی ترقی اور اس میں اسلامی نظام کی ترویج کے لیے ہم غیر مشروط طور پر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔''

اور اسی طرح آپ نے بتایا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کا واضح ارشاد تھا کہ:

''جب پاکستان نہیں تھا تو پاکستان بنانے یا نہ بنانے کا اختلاف، رائے کا اختلاف تھا۔ اب جب پاکستان بن گیا ہے تو ہم سب پاکستان کے وفادار ہیں۔ اور مل جل کر اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔

(قومی ڈائجسٹ، صفحہ: ۲۴۰)

احیاجمعیت:

پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان میں احیائے جمعیت کے بارے میں

حضرت مفتی صاحب خود فرماتے ہیں:

''گو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ملتان میں علمائے کرام کا ایک اجلاس طلب کر کے جمعیت کی داغ بیل ڈالی تھی لیکن جماعت کا باقاعدہ کنونشن دو برس بعد ہو سکا، یہ کنونشن مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر قیادت ۱۹۴۹ء میں طلب کیا گیا۔ لیکن جمعیت کی تنظیم ممکن نہ ہوسکی۔ آخر دسمبر ۱۹۵۲ء میں ہم نے جمعیت کا ایک کنونشن ملتان میں طلب کیا جس میں سارے پاکستان سے علمائے دین اکٹھے ہوئے، اس میں جمعیت کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ مولانا احمد علی لاہوری جمعیت کے صدر اور مولانا احتشام الحق تھانوی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ لیکن اس کے محض دو ماہ بعد جب فروری ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی۔ تو جمعیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مجھے تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں ایک سال کی سزا ہوئی اور جب ہم جیلوں سے واپس آئے تو پوری جماعت مضمحل ہوچکی تھی اور مولانا احتشام الحق تھانوی صاحبؒ تحریک ختم نبوت سے اختلاف کی بناپر ہم سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ آخر دو سال کی تگ و دو کے بعد جب ہم نے ۱۹۵۴ء میں خود کو دوبارہ منظم کیا تو مفتی محمد حسن صاحبؒ کو جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا۔ مفتی صاحب بیمار اور معذور تھے اس لیے انھوں نے مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو قائم مقام صدر نامزد کردیا۔ لیکن قیادت کی کمزوری کی وجہ سے ہم لوگ جو آگے بڑھ کر کام کرنا چاہتے تھے، ایسا نہ کرسکے۔ چناں چہ دو سال بعد اکتوبر ۱۹۵۶ء میں دوبارہ کنونشن ہوا۔ تو مولانا احمد علی لاہوریؒ کو صدر منتخب کیا گیا۔ اور مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے، اس کنونشن میں ہم نے مولانا احتشام الحق تھانویؒ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ لیکن یہ دونوں حضرات شریک نہ ہوئے۔ تاہم اب ہماری یہ تنظیم ایک فعال جماعت بن چکی تھی۔ مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی

کی پر جوش سرگرمیوں کی بدولت مغربی پاکستان میں جمعیت کے دو ہزار مدرسے اور اتنی ہی شاخیں قائم ہوئیں۔'' (قومی ڈائجسٹ، صفحہ: ۲۴۰)

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کی مساعی اور کردار:

اس بارے میں مولانا محمد عبداللہ صاحب بھکر لکھتے ہیں:

''۱۹۵۶ء میں علما کنونشن بلانے کا فیصلہ ہوا، مجلس استقبالیہ کی تشکیل ہوئی، جس کی صدارت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے منظور فرمائی۔ اور نظامت کی ذمہ داری آپ کو (حضرت مفتی صاحبؒ) کو سونپی گئی۔ حضرت لاہوریؒ اور آپؒ کی طرف سے دعوت نامہ جاری ہوا، ۷، ۸، اور ۹ / اکتوبر ۱۹۵۶ء (۲، ۳ اور ۴ / ربیع الاول ۱۳۷۶ھ) کو ملتان میں کنونشن ہوا۔ جس میں مغربی پاکستان کے تقریباً پانچ سو علما نے شرکت کی۔ اور اسی کنونشن میں جمعیت علمائے اسلام کی از سر نو تشکیل ہوئی۔ امیر حضرت لاہوریؒ نائب امیر آپؒ (حضرت مفتی صاحبؒ) اور ناظم اعلیٰ مولانا غلام غوث ہزاروی منتخب ہوئے۔ اسی انتخاب سے جمعیت علما اسلام کا دور جدید شروع ہوا اور یہ ایک فعال دینی، سیاسی جماعت کی حیثیت سے ابھری۔'' (قومی ڈائجسٹ، صفحہ ۷۸)

جماعت کی تشکیل نو کے سلسلے میں ابتدائی مساعی اور کردار کے متعلق مولانا محمد ایوب جان بنوری مدظلہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''میرا نام محمود ہے، مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مدرس ہوں، افتاء کا کام بھی میرے ذمہ ہے۔ آج کل بزرگوں نے جمعیت کی تنظیم نو کے سلسلے میں مجھے احباب سے ملاقات پر مامور کیا ہے۔ تاکہ انھیں دینی اور قومی کاموں کی انجام دہی کے لیے آمادہ کروں، شاید میں سب سے پہلے آپ

کے پاس آیا ہوں۔ اس کے بعد چارسدہ جاؤں گا۔ بعد ازاں دوسرے مدارس کا رخ کروں گا۔ آج عشاء کے بعد آپ کے مدرسے کے طلبا سے خطاب کا ارادہ ہے۔ کل دوسرے مقامات کا پروگرام ترتیب دوں گا۔ اور ان تمام کاموں میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں:

''اس پہلی ملاقات کے بعد وہ صوبہ سرحد میں اکثر آتے جاتے رہے۔ پہلے پہل ہم تنہا ان کا استقبال کیا کرتے تھے۔ پھر وہ وقت آیا کہ ان کے استقبال کے لیے انسانوں کا سیلاب امڈ آتا تھا نہ معلوم اتنے لوگ کہاں سے آتے تھے اور کیسے آتے تھے۔'' (قومی ڈائجسٹ، صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

مولانا عبیداللہ انور صاحب اس دور کی تاریخ یوں بیان فرماتے ہیں:

''یہ اس دور کی بات ہے۔ جب شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کے باعث جمعیت کی اہمیت ختم ہو چکی تھی اور اکثر میٹنگوں میں اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے مختلف تجاویز زیر بحث آتی رہیں۔ ملک کے علما کی نظریں حضرت لاہوری کی طرف اٹھتی تھیں۔ کیوں کہ وہی ایک بزرگ اتنے قد آور اور علم وتقویٰ میں نمونہ تھے۔ ان کی آواز پر تمام علما کو اکٹھا کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ان کا حلقہ ذکر وفکر، درس و وعظ، اہل حلقہ کی اصلاح قلبی اور ''خدام الدین'' کی ترتیب واشاعت ایسے کام تھے، جن کی موجودگی میں ان کے لیے ملک میں مسلسل جماعتی دورے کرنا ممکن نہیں تھا اور مسلسل دوروں کے بغیر جمعیت کو زندہ کرنے کا سوال خارج از بحث تھا۔ عملی سیاست میں حصہ لینا اور کسی جماعت کو منظم کرنا، اس کی قیادت سنبھالنا بالکل الگ چیزیں ہیں، چناں چہ حضرت نے اس سلسلے میں متحرک لوگوں کو جن میں حضرت مفتی صاحب اور مولانا غلام غوث ہزاروی بھی شامل تھے، فرمایا! آپ نوجوان لوگ کام کریں میں آپ کے

لیے تعاون اور دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھوں گا۔ مفتی صاحب اس بات پر مصر تھے کہ حضرت لاہوری جماعت کی قیادت سنبھالیں، ہم سے کام لیں۔ انھوں نے کہا! حضرت ہم لوگ کیا کام کرسکتے ہیں اور کیسے کرسکتے ہیں جب کہ ملک میں ہمارا جاننے والا کوئی نہیں۔ جب تک ہم لوگوں سے متعارف نہ ہوجائیں، کوئی ہماری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ آپ ایک بار پورے ملک میں ہمارا تعارف کرادیں۔ اس کے بعد ہم جانے اور جماعت! ہم ان شاء اللہ جماعت کو سنبھال لیں گے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ آپ ہماری سرپرستی قبول کرکے ہمارا تعارف کرائیں! حضرت لاہوری نے جب ان کا عزم دیکھا تو آمادہ ہوکر کہا! اچھا اگر آپ جمعیت کو سنبھالنے کا عزم کرہی چکے ہیں۔ تو میں ضرور تعاون کروں گا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے تجویز کیا کہ حضرت لاہوری جماعت کے امیر کی ذمہ داریاں قبول کریں۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ امیر کو ہمہ وقت رہنا چاہیے۔ میرے دوسرے اشغال کی موجودگی میں ممکن نہیں کہ تمام جماعتی کام انجام دے سکوں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ آپ ناظم اعلیٰ کے طور پر کام کریں، تو میں بطور امیر کام کرسکوں گا۔ لیکن اس صورت میں آپ کو دن رات میری ہدایات کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ یہ ایک طویل بات ہے کہ جمعیت کے انتخابات کیسے ہوئے، کون کون سے عہدے دار بنے۔ لیکن جمعیت کی تنظیم نو کا آغاز یہیں سے ہوا۔ حضرت لاہوری جیسے آدمی کو جمعیت کی امارت قبول کرنے پر مفتی محمود صاحب ہی نے آمادہ کیا تھا اس طرح تنظیم کا یہ سہرا بھی انھیں کے سر پر بجتا ہے، کیوں کہ وہ کوشش کرکے حضرت کو آمادہ نہ کرتے، تو جمعیت کی تنظیم نو ہوتی اور نہ جمعیت کا کام آگے بڑھتا۔" (قومی ڈائجسٹ، صفحہ ۱۱۸)

میری ان معروضات سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعیت علما اسلام کی پاکستان میں

نئی تشکیل و تنظیم کے لیے بنیادی کردار حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مرحوم نے ادا کیا۔ مفتی صاحب کے استاذ زادہ اور جمعیت علما اسلام کے سابق مرحوم امیر حضرت مولانا حامد میاں صاحب جمعیت علما ہند کے بزرگوں کے اجمالی اوصاف کا تذکرہ کرنے کے بعد احیائے جمعیت کے عنوان سے اس کی یوں تائید فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کا تعلق اکابرین جمعیت علمائے ہند سے تھا۔ وہ سب حضرات مذکورہ بالا اوصاف کے حامل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جماعت سے تعلق رکھنے والے بزرگ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ مغربی پاکستان کے قلب لاہور میں تشریف فرما تھے۔ مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی، مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی اس جمعیت کے پرانے ارکان و عہدہ دار رہ چکے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے ان سب حضرات کو ملتان میں جمع کیا اور ان کے ساتھ پورے ملک کے چیدہ چیدہ علما کو مدعو کیا یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ میں خود بھی اس میں شریک تھا۔ یہ اجلاس حاجی باران کی زیر تعمیر کوٹھی میں ہوا۔ حضرت مولانا احمد علی کو امیر منتخب کیا گیا اور دیگر عہدہ داروں کا بھی انتخاب ہوا۔ اجلاس میں شریک مولانا غلام غوث ہزاروی کو ناظم منتخب کیا گیا، یہ سب کارروائی مولانا مفتی محمود صاحب نے کی تھی۔ جو وقت اور ضرورت کے عین مطابق تھی۔ کام کرنے والے سب علما مجتمع ہوگئے اور جمعیت کا احیا ہوگیا۔ خداوند کریم نے مفتی صاحب کی اس کوشش کو بارآور کیا۔ تمام علما ان حضرات کی سرکردگی میں دینی اور سیاسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مفتی صاحب کی اپنی جماعت یہی تھی اور ہے۔ اور ان شاء اللہ رہے گی۔ یہ جماعت ان کے باقیات صالحات میں سے ہے۔ اور ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔"

(قومی ڈائجسٹ، صفحہ ۶۸۔ ترجمان اسلام لاہور مفتی محمود نمبر، ص ۸۷)

جماعت کے احیا کے فکر میں حضرت مولانا مفتی محمود تنہا نہیں تھے بلکہ ان کی راہ

نمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں فکر ولی اللہ کے امانت داروں کی راہ نمائی، توجہات اور رفاقت سے نوازا۔ عنایات ربانی نے انھیں حضرت لاہوری کے علاوہ مولانا محمد عبداللہ درخواستی، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھوی، مولانا محمد عبداللہ صاحب خانقاہ سراجیہ، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور ملک کی مشہور مرجع خلائق خانقاہوں مثلاً خانقاہ سراجیہ موسیٰ زئی شریف، دین پور شریف، امروٹ شریف، ہالیجی شریف کے بزرگوں کی توجہات ظاہری و باطنی کا مرکز بنایا۔ حضرت مفتی صاحب بڑے فخر سے فرماتے تھے کہ ہمیں اپنے بزرگوں کی توجہات اور دعائیں حاصل ہیں۔ اور رفاقت کے لیے مولانا سید گل بادشاہ، مولانا عبدالحق، مولانا عبدالقیوم پوپلزئی، مولانا محمد ایوب جان بنوری، صاحب زادہ عبدالباری جان، مولانا قاضی عبدالکریم، مولانا عبیداللہ انور، مولانا قاری عبدالسمیع جیسے رفقا عنایت فرمائے۔ جنھوں نے ہر فکری، علمی، عملی میدان میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

(قاضی عبداللطیف، ترجمان اسلام لاہور مفتی محمود نمبر، صفحہ ۲۹)

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اشاعت اسلام اور جمعیت علمائے اسلام کے افکار کو اپنا نصب العین بنا کر اس مشن کی تکمیل کے لیے ہمہ تن مشغول و مصروف رہے۔ یہاں تک کہ اپنے رفیق جماعت حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کے ساتھ مل کر جماعت کی تنظیم اور نئے مدارس کے قیام کی جدوجہد کی۔ اور ۲ سال کے قلیل عرصہ میں مغربی پاکستان کے اندر ۲ ہزار مدارس اور اتنی ہی شاخیں قائم کرنے میں کام یاب ہوئے۔

۱۹۵۶ء کا دستور اور جمعیت علمائے اسلام کا موقف:

۱۹۵۶ء میں ملک میں ایک نیا دستور نافذ کیا گیا۔ جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے نام نہاد ''راہ نمایان قوم'' کس طرح اسلام کے نام پر عوام کو دھوکا دیتے رہے۔ اس دستور میں بنیادی حقوق کے ضمن میں صاف طور پر کہا گیا تھا کہ:

(۱) ملک کا ہر باشندہ جو بھی عقیدہ اختیار کرے کر سکتا ہے۔ حال آں کہ اسلام کا قطعی فیصلہ ہے کہ اسلامی مملکت میں کسی کو ارتداد کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

(۲) ملک کا ہر باشندہ بلا امتیاز مذہب حکومت کے ہر عہدہ بہ استثناء صدارت مملکت پر فائز ہو سکے گا۔

(۳) ملک میں ہر قسم کی غلامی ممنوع ہوگی۔

امیر جمعیت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے اس پر غور کرنے کے لیے ۲، ۳ ردسمبر ۱۹۵۶ء جمعیت کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا۔ جس میں واشگاف طریقہ سے یہ اعلان کر دیا کہ:

''مجلس عاملہ بغیر کسی جھجک اور بلا خوف لومۃ لائم اس عقیدہ کا اعلان کر دینا چاہتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست جو اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظریہ حیات، اسلامک آئیڈیالوجی پر مبنی ہو۔ اس میں رائے ''ووٹ'' کا حق قانون سازی کا حق ہیئۃ حاکمہ مجلس وزراء کی رکنیت کا حق صرف انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جو اسلامی نظریہ حیات کا عقیدہ رکھتے ہوں (مسلمان ہوں) اور اس کے مطابق نظام حکومت چلانے کا جذبہ صادق رکھتے ہوں۔''

اس اعلان کے علاوہ اس اجلاس میں اس دستور سے خلاف اسلامی دفعات کو تبدیل کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس کے سربراہ مولانا مفتی محمود صاحب تھے۔ دوسرے اراکین حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی اور غالباً علامہ خالد محمود تھے جب کہ شیخ حسام الدین صاحب قانونی مشیر مقرر کیے گئے۔ چناں چہ اس کمیٹی کا اجلاس مردان میں ہوا اور ایک مفصل تبصرہ اس پر شائع ہوا لیکن بہت جلد مارشل لا نے اس آئین ہی کا خاتمہ کر دیا۔ اس لیے اس تبصرہ کی عام اشاعت نہ ہو سکی۔

(جمعیت علمائے اسلام کا مختصر تعارف، مرتبہ مولانا قاضی عبدالکریم کلاچی شائع کردہ جمعیت علمائے اسلام ضلع ڈیرہ اسماعیل خان، دسمبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۲-۱۳)

بہر حال کمیٹی نے دستور میں اسلامی، معاشی اور اقتصادی خامیوں کی نشان دہی کی اور اس پر اپنی تجاویز دیں۔ حضرت مفتی صاحب نے اس رپورٹ کی ترتیب اور تدوین میں سب سے زیادہ کام کیا تھا لہٰذا علمی حلقوں میں ان کی علمی، فکری اور سیاسی صلاحیتوں کا ایک اور مظاہرہ ہوا۔

جماعت نے اپنے تاسیسی اجلاس میں اس بات پر غور کر لیا تھا خود علمائے کرام اسمبلیوں میں جا کر دین پہنچائیں اور دینی اقدار کے دفاع کا فریضہ انجام دیں ملک گیر مہم اور جماعتی شاخوں کا قیام اور رائے عامہ کو ہموار کرنا اس سلسلہ کی کڑی تھا اور سب سے آخر لاہور میں ایک ملک گیر کانفرنس کا اہتمام کر لیا گیا۔

حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب رقم طراز ہیں:

تنظیم نو کے کام کو مفتی صاحب نے آگے بڑھانے اور کارکنوں کی نفری میں اضافہ کرنے کے لیے شب و روز ایک کر دیے۔ ملک کے اکثر بڑے شہروں میں جلسے ہونے لگے، یہاں تک کہ سب سے آخر میں لاہور میں ایک ملک گیر کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اس سال حضرت مولانا احمد علی لاہوری پہلی بار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ جاتے وقت انھوں نے مفتی محمود صاحب کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ مفتی صاحب کی قائم مقام کے طور پر تقرری گویا ان کی کارکردگی کی سند اور خدمات کا اعتراف تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت بہت بڑے صاحب کشف بزرگ تھے۔ وہ آدمی کے ظاہر کو کم ہی دیکھتے تھے۔ ان کی توجہ کا اصل مرکز باطن تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کس انسان میں کتنی صلاحیت ہے اور وہ مستقبل میں کتنا بہتر طور پر کام کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مفتی صاحب کا علمی مقام بھی اس کا متقاضی تھا کہ انھیں اتنی بڑی ذمہ داری کا اہل قرار دیا جاتا۔ بہر حال جب حضرت جانے لگے تو مفتی صاحب نے انھیں بتایا کہ کانفرنس کے انعقاد میں صرف پندرہ روز باقی رہ گئے ہیں اور اگر آپ فریضہ حج کی ادائیگی کے فوراً بعد واپس تشریف لے آئیں تو کانفرنس ہو سکے گی۔ ورنہ اس کانفرنس کو سنبھالنا ہمارے

لیے مشکل ہوگا۔ حضرت نے فرمایا میں تو آ جاؤں گا۔ لیکن کانفرنس کا انعقاد مشکل نظر آتا ہے۔ چناں چہ حضرت ابھی حرم پاک ہی میں تھے کہ انھیں ملک میں مارشل لا کے نفاذ کی خبر مل گئی۔ اب انھیں یقین تھا کہ کانفرنس نہیں ہو سکے گی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے وعدے کے مطابق پاکستان واپس پہنچ گئے۔ ان کے اس ایفائے عہد پر سب حیران تھے کہ اس یقین کے باوجود بھی انھوں نے حسب وعدہ آنا ضروری سمجھا کہ کانفرنس نہیں ہو سکے گی۔ ایوب حکومت کو یقین تھا کہ ملک بھر میں علما کا ایک متحرک طبقہ موجود ہے۔ اور اس متحرک طبقہ پر گرفت کرنا ضروری ہے۔ اس لیے مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ ہی مولانا غلام غوث ہزاروی کو چھ ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا، اور جب یہی احکامات حضرت لاہوریؒ کے پاس پہنچے تو انھوں نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ اس طرح نئی انتظامیہ ملک کے تمام علما کو نظر بند کرنے میں کامیاب ہو جائے گی کیوں کہ میرا نظر بندی کے احکامات قبول کرنا دوسرے علما کو نظر بندی قبول کرنے کی دعوت دینے کے مترادف ہوگا، اس لیے میں ان احکامات پر عمل درآمد سے انکار کرتا ہوں۔

حضرت مولانا عبید اللہ انور بات کو یوں آگے بڑھاتے ہیں:

”مفتی صاحب چوں کہ حضرت کے قائم مقام مقرر ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے بھی نظر بندی کے احکام کو قبول کرنا حضرت لاہوری کی اہانت تصور کیا اور ان احکامات کی تعمیل نہ کی تاہم حکومت نے بھی جنگ کی بجائے صلح کا راستہ اختیار کرتے ہوئے۔ ان پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ یہی وہ تاریخ ساز لمحہ تھا جب مفتی صاحب نے حضرت لاہوریؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جرأت و استقامت کا مظاہرہ کر کے پورے ملک کے علما میں اپنے لیے ایک باوقار اور اہمیت کا حامل مقام حاصل کر لیا۔“

(قومی ڈائجسٹ، صفحہ ۱۲۰)

وفاق المدارس عربیہ کا قیام:

انگریز نے علمائے کرام کا وقار ختم کرنے، ملک سے اسلامی تعلیمات کو مٹانے کے لیے پہلے ہی دن سے کوششیں شروع کردی تھیں۔ دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل ہے کہ علمائے حق کی قربانیوں اور کوششوں سے اب بھی ملک میں لاکھوں مساجد اور ہزاروں مدرسے موجود ہیں۔ مگر مدارس دینیہ کے نصاب و نظام تعلیم میں جو ضعف اور انحطاط پیدا ہو چکا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کو محسوس کرتے ہوئے اس کا بھی مقابلہ کیا۔ ۱۹۵۸ء میں مغربی پاکستان کے تمام مدارس دینیہ کے سربراہوں کا اجلاس ملتان میں بلایا جن کا فکری تعلق مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے تھا اور ان علمائے کرام نے ''وفاق المدارس العربیہ'' کے نام سے یونی ورسٹی کے طور پر ایک تنظیم بنائی۔ اور حضرت مفتی صاحب کو اس کا ناظم اعلیٰ بنایا گیا۔ وفاق المدارس عربیہ نے ۱۹۶۰ء میں درس نظامی کی سند کا باقاعدہ اجرا کیا۔

جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورِ اقتدار میں دینی مدارس پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تو مولانا مفتی محمود صاحب نے اس کی زبردست مزاحمت کی۔ تب ''وفاق المدارس العربیہ'' کی اہمیت اور افادیت سامنے آئی۔

(ماخوذ۔ مولانا مفتی محمود نعیم آسی، صفحہ ۶۵-۶۶)

مفتی صاحب اسمبلی کے ایوان میں:

جنرل محمد ایوب خان نے مارشل لا کی مدت کو بہت زیادہ دراز کیا تو لوگوں میں شور مچا لیکن اس نے بنیادی جمہوریت کا نظام رائج کر کے قوم پر آمریت کی کاٹھی ڈال دی۔ اور اپریل ۱۹۶۲ء میں اس نظام کے تحت قومی اسمبلی کے پہلے انتخابات کرائے۔ حضرت مفتی صاحب نے ان انتخابات میں انفرادی حیثیت سے حصہ لیا۔ کیوں کہ سیاسی جماعتوں پر پابندی تھی۔ مفتی صاحب کے تمام مخالف امیدواروں میں سے صرف ایک امیدوار نواب زادہ فتح اللہ خان اپنی ضمانت بچانے میں کام یاب ہوئے

جب کہ ان کے کل ووٹ مفتی صاحب کے ووٹوں کے نصف کے برابر تھے۔ ملک بھر میں یہ خبر نہایت حیرت اور خوشی سے سنی گئی۔ (مولانا مفتی محمود، صفحہ ۶۷)

ایوب خان کا دور جبر و استبداد کا مرقع تھا۔ اس دور میں حزب اختلاف کی حیثیت سے کردار ادا کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ ہر رکن کی خفیہ پولیس والے نگرانی کرتے تھے۔ اور حکومت لوگوں کو دباؤ میں رکھتی تھی۔ لیکن تمام تر مشکلات کے باوجود حضرت مفتی صاحب نے اسلام اور آزادیٔ اظہار کا چراغ جرأت و بہادری اور تدبر سے روشن رکھا۔

مولانا ظفر احمد قاسم لکھتے ہیں:

> ''۱۹۶۲ء کے انتخابات میں مفتی صاحب کی کامیابی اس لحاظ سے پاکستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی کہ اس سے ایک طرف تو ہمدردانِ اسلام کے حوصلے بلند ہوئے۔ دوسرے ایک فقیہ، محدث اور صاحب بصیرت سیاست دان کے ذریعے ملک کی سیاسی زندگی سے کٹے ہوئے علما کی اسمبلی میں نمائندگی ہونے لگی۔''
>
> (ترجمان اسلام مفتی محمود نمبر صفحہ ۲۰۵)

آمریت کے خلاف پہلا چیلنج:

حضرت مفتی صاحب نے قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں حلف وفاداری کے موقع پر ہی ایوب خان کے غیر اسلامی، غیر جمہوری اور آمرانہ دستور کے خلاف بغاوت کردی۔ انھوں نے حلف نامے کے اس جملہ کے بعد کہ ''دستور کو باقی اور قائم رکھوں گا'' اپنی طرف سے ان الفاظ کا اضافہ کیا:

> ''اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس کو جوں کا توں رکھیں گے بلکہ دستور کے دیے ہوئے اختیارات کو بروئے کار لا کر ان جملہ خرابیوں اور خامیوں کی جو کتاب و سنت یا جمہوری لحاظ سے اس میں ہوں گی، ان میں ترمیم و تنسیخ

کریں گے۔"

حضرت مفتی صاحب کے یہ الفاظ حلف کی کارروائی میں باقاعدہ درج ہوئے۔ اوران کی نکتہ آفرینی، سیاسی بصیرت اور حق گوئی و بے باکی کے ہمیشہ گواہ بن گئے۔

(مولانا ظفر احمد قاسم ترجمان اسلام، ۲۰۵)

بہر حال حضرت مفتی صاحب جو پہلی مرتبہ پارلیمنٹ میں گئے تھے انھوں نے پہلے ہی روز اعلان حق کر کے باطل کو للکارا اور ساری زندگی اپنے مشن کی تکمیل کے لیے وقف کردی۔ قومی اسمبلی میں ان کی معرکۃ الآراء تقاریر پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کی تاریخ میں علم و تحقیق کی شاہکار ہیں خاص طور پر ۱۹۶۳ء میں عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی اور غیر اسلامی طرز پر ملکی بجٹ کے خلاف ان کی تقاریر آج بھی گونج رہی ہیں۔ عائلی قوانین کو ایوب خان نے اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنالیا تھا۔ لیکن مفتی صاحب نے اس آرڈیننس پر ڈیڑھ گھنٹے تقریر فرمائی۔ اور اسمبلی میں اسلام کے عائلی نظام کے ہر گوشہ کو اجاگر کیا۔ اور تمام ایوان کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کردیا کہ مذکورہ قوانین اسلام کے خلاف ہیں ایوان میں حکومت کی شکست تو یقینی تھی۔ لیکن ڈپٹی اسپیکر نے رائے شماری اگلے وقت پر ڈال دی اور حکومت کو شکست سے بچالیا۔ حکومت ضمیر فروش نمائندگان قوم کو خریدنے اور اس آرڈیننس کو باقی رکھنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن ایوب خان ملک میں اپنی ساکھ نہ بچاسکا۔ اور بالآخر ایوب حکومت کے اضمحلال کی بنیاد پڑگئی۔

۱۹۶۴ء میں حضرت مفتی صاحب نے اسلامی ترمیمات کے کئی بل پیش کیے۔

اس دوران حکومت نے آئین میں ترمیم کا بل پیش کیا۔ مفتی صاحب نے اس ترمیم کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کیا جس کو بنیاد بنا کر نام نہاد اسلام پسندوں نے ان کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کردیا اور خدا جانے کتنے بہتان ان کی شخصیت پر لگائے گئے کہا گیا کہ مفتی صاحب بک گئے۔ نیز کہا گیا کہ مفتی صاحب نے اس ترمیم میں ووٹ دینے کے عوض ٹیوب ویل لگوائے۔

ترمیم کے حق میں ووٹ کی حقیقت:

اپنے ایک انٹرویو میں حضرت مفتی صاحب نے اخبار نویس کو اس کی حقیقت یوں بتائی:

۱۹۶۲ء کے دستور میں یہ دفعہ شامل تھی کہ پانچ سال کے بعد صدارتی انتخاب ہوگا اور اگر موجودہ صدر انتخابات میں حصہ لینا چاہیں تو انھیں انتخابات سے چار ماہ قبل صدارت سے مستعفی ہوکر قومی اسمبلی کے اسپیکر کو صدر کا عہدہ سونپنا ہوگا اور انتخابات کے عبوری دور میں اسپیکر ہی ملک کے اعلیٰ منصب پر فائز رہے گا۔ اب آئین میں یہ ترمیم کرنی تھی کہ ایوب خان ملک کے بدستور صدر رہیں اور چار ماہ کے لیے اسپیکر کو قائم مقام صدر نامزد نہ کریں۔ اپوزیشن پارٹیوں کا موقف یہ تھا کہ ایوب خان عبوری دور میں صدر رہے۔ تو سرکاری مشینری کو استعمال کر کے ووٹروں پر اثر انداز ہوں گے اور الیکشن غیر جانب دارانہ نہیں ہوسکیں گے۔ مجھے قومی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے اس ترمیمی بل کے حق یا مخالفت میں ووٹ دینا تھا۔ میں نے جماعت کا اجلاس طلب کیا۔ اور ذمہ دار عہدہ داروں کو بل کے مندرجات پر غور کرنے کے لیے کہا۔ جماعت نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ بل کے حق میں ووٹ دیا جائے۔ اس فیصلہ کی دو بنیادی وجوہات تھیں ایک مذہبی اور دوسری سیاسی دستور میں صدر کی طرح اسپیکر کے لیے مسلمان ہونے کی کوئی شرط نہیں تھی۔ اس طرح دستور کی متذکرہ بالا دفعہ کے تحت غیر مسلم اسپیکر عبوری طور پر پاکستان کا صدر بن سکتا تھا۔ جو ہمارے نزدیک مذہبی اعتبار سے مناسب نہیں تھا۔ اس فیصلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ جب ہم دس ہزار بی ڈی ممبروں کے منتخب نمائندے کو ملک کا جائز صدر تسلیم نہیں کرتے۔ تو قومی اسمبلی کے ڈیڑھ سو ممبروں کے منتخب اسپیکر کو یہ حق کیسے دے سکتے ہیں کہ وہ عبوری دور کے لیے ہی سہی کرسی صدارت پر متمکن ہوجائے اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دستور میں کہیں شرط نہیں تھی کہ اسپیکر قائم مقام صدر ہونے کے بعد صدارتی انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتا۔ ظاہر ہے کوئی اسپیکر جسے چار ماہ کے لیے نامزد کیا گیا ہو، اگر وہ صدارتی

انتخابات لڑنا چاہے تو قائم مقام صدر کی حیثیت سے سرکاری مشینری کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا تھا۔ ان حالات میں موجودہ صدر کے لیے آیندہ صدارتی الیکشن کے پیش نظر چار ماہ قبل مستعفی ہو جانا، محض تکلف تھا۔ لہٰذا میں نے ترمیم کے حق میں ووٹ دے دیا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو یقیناً کوئی گناہ نہیں کیا۔ میرے اس اقدام سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میں نے ایوب خان کی آمریت کو سنبھالا دیا تھا۔

(قومی ڈائجسٹ، صفحہ ۲۳۷-۲۳۸، بحوالہ روزنامہ مشرق لاہور ۱۵/مارچ ۱۹۷۰ء)

حضرت مفتی صاحب مصر میں:

۱۹۶۴ء میں ''جامع الازہر'' مصر کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر حکومت مصر نے دنیا بھر کے جید علمائے کرام کو مصر آ کر جشن میں شمولیت کی دعوت دی۔ پاکستان کا سہ رکنی وفد حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کی قیادت میں اس تقریب میں شریک ہوا۔ مولانا مفتی محمود صاحب اور مولانا غلام غوث ہزاروی اس وفد میں شریک تھے۔ اس اجتماع میں مختلف موضوعات ومباحث پر تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔ مفتی صاحب نے فتنہ الحاد کا نوٹس لیا۔ جس میں بعض ملحد جو بنکوں کے سود کو جائز اور حلال مانتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ نے حرام نہیں کیا یہی لوگ شراب کی بعض قسموں کو بھی حلال کہتے تھے۔ زکوٰۃ کو عبادت نہیں جانتے تھے بلکہ اس کو ایک مالی ٹیکس کی حیثیت دیتے تھے۔ ایسے فتنہ پردازوں کا علمی اور تحقیقی جواب دیا۔ مغربی استعمار کے اندوہناک فساد، جس میں ملت اسلامیہ کی تقسیم در تقسیم کی سازشوں اور مسلمانوں پر مظالم کے خلاف اس بین الاقوامی فورم میں قرار دادیں منظور کرائیں۔ مسئلہ کشمیر پر سیر حاصل بحث کی اور اس کے پس منظر اور پیش منظر کو عالم اسلام کے نمائندوں کے سامنے ایسے مؤثر انداز میں بیان کیا کہ وہ مسلمانان کشمیر کو ظالم ہندوؤں کے پنجہ استبداد سے آزاد کرانے کے لیے پاکستان کے حق میں قرار داد منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ جس سے بھارتی حکومت بوکھلا گئی۔

مصر کے صدر جمال عبدالناصر مغربی استعمار کی دشمنی میں بہت آگے تھے۔ اس وجہ سے سامراجی ایجنٹ پاکستان میں ان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ کرتے تھے اور انہیں۔ اسلام دشمن، مسلم اتحاد دشمن کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ جمعیت علمائے اسلام کے راہ نما مولانا مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی نے نہایت دیدہ وری اور جرأت کے ساتھ جمال عبدالناصر اور مصر کی حمایت کا پرچم بلند کیا، اور دنیائے عرب پر یہ ظاہر کر دیا کہ پاکستان کے عوام ان کے دوست ہیں۔ اس طرح مصر کے ساتھ ایوب حکومت کے تعلقات کچھ بہتر ہو گئے۔

۱۹۶۵ء کا صدارتی الیکشن:

ایوب خان نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے ملک میں بنیادی جمہوریت کا نظام وضع کیا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں اس نے صدارتی الیکشن کرا کر اس کا ثبوت مہیا کیا۔ اپوزیشن نے ایوب خان کا مقابلہ کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز (C.O.P) کے نام سے متحدہ محاذ بنا کر کیا اور اس کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کو اپنا متفقہ صدارتی امیدوار نامزد کر دیا۔ ایوب خان کا صدارتی انتخاب جمعیت علمائے اسلام کے عقیدوں اور اصولوں کے لیے چیلنج بن گیا۔ ایک طرف ایوب خان کے آمرانہ دور کے مظالم اور دوسری طرف اپوزیشن کا خلاف اسلام طرز عمل کہ اس نے اپنا امیدوار عورت کو نامزد کر دیا اگر چہ پاکستان میں جدید خیال کے لوگ اسے فرسودہ خیالی اور پرانے وقتوں کے ایمان اور عقیدہ کی بات کہتے تھے۔ لیکن جمعیت علمائے اسلام اپنے اور اپنے پیروکاروں کے عقیدہ کو بچانے میں کامیاب ہو گئی کہ اس نے صدارتی الیکشن کے لیے حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحب کا نام بطور امیدوار پیش کر دیا۔ اور اس طرح جمعیت کے اکابر نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ ہمارا مذہب الیکشن نہیں۔ دین کا ایک جز بھی مصلحتاً قربان نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اپنی انفرادیت منوا کر مستقبل کے سیاسی میدان میں غیر معمولی کامیابی کی راہ ہموار کی۔ (تلخیص مولانا مفتی محمود۔ نعیم آسی، صفحہ ۸۰-۸۲)

۱۹۶۵ء کے الیکشن میں مفتی صاحب کی شکست:

ایوب خان عائلی قوانین کے آرڈیننس اور خاندانی منصوبہ بندی کے مسئلہ پر مفتی صاحب کے لگائے ہوئے زخموں کو بھولا نہیں تھا۔ چناں چہ ۱۹۶۵ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں انہیں اس کی سزا بھگتنی پڑی۔ ان کا انتخابی حلقہ جوان کا ایک فولادی قلعہ تھا، حکومت کی دسترس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں مفتی صاحب کو ناکام بنانے کے لیے متعلقہ حکام کو خاص ہدایات دی گئیں۔ مفتی صاحب کہتے تھے:

> ''اس زمانے میں جہاں ہم لوگ ووٹ مانگنے جاتے تھے۔ وہاں ہم سے پہلے پولیس موجود ہوتی تھی۔ حلقہ کے بی ڈی ممبران کو متعلقہ تھانوں میں طلب کیا جاتا تھا اور انہیں خوف دلایا جاتا تھا کہ اگر مفتی محمود صاحب ان کے علاقے سے کامیاب ہوئے۔ تو اس کی سزا انہیں بھگتنا ہوگی۔''

اس کے باوجود مفتی صاحب نے الیکشن لڑا اور ثابت کر دیا کہ

فتح و شکست قسمت سے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اگر چہ مفتی صاحب بظاہر الیکشن ہار گئے مگر واقعہ میں یہ ہار بھی ان کی جیت تھی۔

(نعیم آسی، صفحہ ۸۳)

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس:

ایوب خان حکومت کی اسلام دوستی اور دین کے ساتھ محبت ظاہر کرنے کے لیے ''ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ'' کے زیرِ اہتمام فروری ۱۹۶۸ء میں ایک ''عظیم الشان'' بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد کی گئی۔ راولپنڈی کا ہوٹل ''انٹر کانٹی نینٹل'' اس مقصد کے لیے استعمال ہوا۔ مفتی اعظم فلسطین، تاشقند، شام، تیونس، ترکی اور لبنان تک سے وفود آئے۔ اس کانفرنس میں جناب مسعود صاحب نے انفرادی ملکیت کے خلاف قرآن کریم اور احادیث سے استدلال پیش کیا اور چیلنج دے دیا کہ اس کا جواب دیا

جائے، مفتی صاحب نے کھڑے ہو کر صدرِ محفل سے جواب کے لیے وقت مانگا وقت کی تنگی کا عذر کر کے جواب کے لیے وقت نہ دیا گیا۔ جس پر سامعین نے احتجاج کیا اور پھر یہ احتجاج اشتعال میں تبدیل ہو گیا۔ بالآخر مجبور ہو کر صدرِ اجلاس باقوری صاحب مصری الازہری نے مولانا مفتی محمود صاحب کو تنقید کی اجازت دے دی۔ جب مفتی صاحب ڈائس پر نظر آئے تو ہال ایک منٹ تک تالیوں سے گونجتا رہا۔ مفتی صاحب نے سنجیدہ اور متین انداز میں مسعود صاحب کے مقالہ پر تبصرہ کیا۔

آپ نے فرمایا۔ مسعود صاحب نے جن آیات و احادیث کے حوالے دیئے ہیں خود انہیں میں مسعود صاحب کے خیالات کی تردید موجود ہے۔ مثلاً انھوں نے اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ سے انفرادی ملکیت کے خلاف استدلال کیا۔ لیکن اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ اس کے آگے یہ جملہ بھی موجود ہے۔

یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ. حضرت رافع کی جو حدیث انھوں نے پیش کی ہے۔ خود اس میں زمین عطیہ کے طور پر کسی مسلمان بھائی کو دے دینے کا حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ عطیہ اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب کہ عطیہ دینے والا اس کا مالک رہا ہو۔ آپ نے فرمایا اسلام میں انفرادی ملکیت پر مجھ سے پہلے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ اپنے مقالہ میں بیان فرما چکے ہیں۔ لیکن یہ موٹی سی بات تو ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر انفرادی ملکیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو زکوٰۃ، عشر، خراج، اور انفاق فی سبیل اللہ کے ان تمام احکام کا مطلب کیا رہ جاتا ہے۔ جس سے قرآن و حدیث بھرے پڑے ہیں۔ مفتی صاحب کے جملہ جملہ پر لوگ مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ کی تقریر کے بعد مفتی صاحب تحسین و آفرین کی صداؤں میں رخصت ہوئے۔

(مفتی محمود۔ نعیم آسی، بحوالہ ماہنامہ البلاغ کراچی محرم ۱۳۸۸ھ)

ڈاکٹر فضل الرحمان کی برطرفی:

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے اصل محرک ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ کے

ڈائریکٹر پاکستان میں الحاد کے علم بردار ڈاکٹر فضل الرحمان جنھوں نے انگریزی میں اسلام (Islam) نامی کتاب لکھ کر بے دین حلقوں سے داد تحسین وصول کی تھی اور حکومتی سطح پر الحاد کی بنیاد رکھی تھی۔ جمعیت علمائے اسلام نے تحریف و الحاد کے اس فتنہ کے خلاف مشرقی و مغربی پاکستان میں محاسبہ و مقابلہ کیا۔ حضرت مفتی صاحب نے موتمر عالم اسلامی میں بھی اسی مسئلہ کو اٹھایا۔ حکومت کو ڈاکٹر فضل الرحمان کو برطرف کر کے دس سالوں میں پہلی بار اسلامیان پاکستان کے سامنے جھکنا پڑا۔

(ایضاً صفحہ ۸۷-۸۸)

جمعیت علمائے اسلام کی تاریخی کانفرنس:

۱۹۶۸ء ایوب خان کے اقتدار کا دسواں سال تھا۔ اپنے مارشل لا کی طاقت کے نشہ میں اس نے اسلام اور عوام دشمن ہتھکنڈوں سے سمجھ لیا تھا کہ اب اس ملک میں اسے چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ملک کے سیاست دان بند کمروں میں سیاست کر رہے تھے کہ اتنے میں ایوب خان نے اپنی نام نہاد کامیابیوں پر دس سالہ جشن منانے کا اعلان کیا۔ عین اس وقت جمعیت علمائے اسلام نے اپنی قوت کے مظاہرہ کا فیصلہ کیا۔ لاہور میں کل پاکستان سطح پر عظیم الشان کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا جو ۳، ۴ اور ۵ رمئی مطابق ۴، ۵ اور ۶ رصفر المظفر ۱۳۸۸ھ بروز جمعہ، ہفتہ اور اتوار باغ بیرون موچی دروازہ لاہور "تاریخی کانفرنس" کے نام سے منعقد ہوئی۔

کانفرنس کے انعقاد سے دو دن قبل مرکزی سطح پر کل پاکستان جمعیت علمائے اسلام کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ جس میں مشرقی و مغربی پاکستان کے نمائندوں نے بھرپور شرکت کی، عہدے داروں کے نام یہ ہیں:

امیر حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی صاحب،

نائب امیر (۱) حضرت مولانا شیخ شبیر احمد صاحب خلیفہ حضرت مدنیؒ (مشرقی پاکستان)

نائب امیر (۲) حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحب (مغربی پاکستان)

ناظم عمومی مولانا مفتی محمود صاحب (مغربی پاکستان)

ناظم (۱) مولانا عارف ربانی صاحب میمن شاہی (مشرقی پاکستان)

ناظم (۲) حضرت مولانا عبدالواحد صاحب گوجرانوالہ (مغربی پاکستان)

خازن حافظ نصر اللہ صاحب خاکوانی بہاولنگر (مغربی پاکستان)

۳ رمئی باغ بیرون موچی دروازہ میں تاریخی کانفرنس ایک بجے امیر محترم حافظ الحدیث والقرآن حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ صاحب کی صدارت میں ان کی تقریر سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد خطبہ اور نماز جمعہ آپ نے پڑھائی۔ نماز جمعہ کے بعد خطبہ استقبالیہ مولانا محمد اکرم صاحب صدر استقبالیہ اور ناظم جمعیت علمائے اسلام مغربی پاکستان اور خطبہ صدارت امیر محترم مرکزیہ کی طرف سے قائد جمعیت حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے پڑھا۔

دوسری نشست عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوئی۔ آدھی رات تک جاری رہی۔

کانفرنس کے دوسرے دن صبح ۹ بجے تا ۱۲:۳۰ بجے تربیتی اجلاس ہوا جس میں جمعیت علمائے اسلام کی تاریخ مقصد اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل سے علمائے کرام و نمائندگان اور کارکنوں کو آگاہ کیا گیا۔

۳ بجے ظہر برکت علی محمڈن ہال میں مرکزی مجلس عمومی کے اراکین کے سامنے مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے فیصلوں کی تفصیل رکھی گئی جس پر اراکین نے اپنی اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا بعض فیصلوں کی توثیق اور بعض میں ترامیم کر لی گئیں اسی طرح یہ اجلاس عصر کی نماز تک رہا۔ عصر کی نماز کے بعد مخصوص اراکین کا اجلاس ہوا۔ جس میں مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں منظور کردہ قراردادوں پر بحث ہوئی۔ ہر شخص کو آزادی تھی کہ ان کے بارے میں اپنا مشورہ پیش کرے مغرب کی نماز کے وقت اجلاس ختم ہوا۔

عشاء کی نماز کے فوراً بعد جلسہ شروع ہوا جو رات گئے اختتام پذیر ہوا۔

۵ رمئی صبح تقریباً ۹:۳۰ بجے جلسہ عام شروع ہوا ۱۲:۳۰ بجے اعلان ہوا کہ ظہر کی نماز کے بعد ۳ بجے جلسہ گاہ سے اپنے مطالبات منوانے کے سلسلہ میں ایک پر امن

جلوس نکالا جائے گا ہر شخص اس میں شریک ہو ابتدا میں ۴-۴ افراد کی قطار میں جلوس روانہ کرنے کا اعلان کیا گیا۔ امیر محترم نے مخصوص انداز میں دعا فرمائی اور ارشاد فرمایا: اللہ وتر یحب الوتر۔ لہٰذا ۳-۳ نفری قطار بنا کر جلوس چلے فوری طور پر ارشاد کی تعمیل کی گئی ۳:۲۰ بجے جلوس روانہ ہوا۔ ریلوے روڈ، میکلوڈ روڈ، نسبت روڈ، ہسپتال روڈ، لوہاری دروازہ، شاہ عالم مارکیٹ سے ہوتا ہوا دہلی دروازہ کے راستہ سے ۵:۳۰ بجے جلوس جلسہ گاہ پہنچا جلوس کی تنظیم قابل دید تھی۔ دلوں پر اس کا عجیب اثر تھا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ اس جلوس میں محدثین، مفسرین، مفتیان کرام، علماء عظام، وکلاء، دانشور، اساتذہ، طلبا، مخلصین نے صرف اور صرف اسلام کی بالادستی اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کیا تھا۔

لاہور کی اس تاریخی کانفرنس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے تمام علاقوں سے آئے ہوئے پانچ ہزار علمائے کرام اور نمائندہ گان شریک ہوئے۔ رات کے اجلاسوں میں حاضری تقریباً ۲-۳ لاکھ تک پہنچتی رہی کانفرنس کے آخری روز عظیم الشان جلوس ایوب خان کے ایوان اقتدار کے لیے زلزلہ ثابت ہوا۔ ایوان میں دراڑیں پڑ گئیں۔ دیواریں گرنے لگیں۔ بالآخر اس کا اقتدار ختم ہو کر رہا البتہ ملکی اخبارات اور سیاسیات میں علما کی طاقت کو مان لیا گیا اور آئندہ آنے والے دور میں اس کے شواہد موجود ہیں۔

یوم نظام اسلام:

اس کے بعد جمعیت علمائے اسلام نے پورے ملک میں ۲۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء جمعۃ الوداع ۲۹ر رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ یوم نظام اسلام منانے کا فیصلہ کیا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے ہر ضلع اور قابل ذکر شہر میں یوم نظام اسلام کے موقع پر جلوس نکالے گئے۔

لاہور میں مولانا عبیداللہ انور صاحب کی زیر قیادت جلوس کا پروگرام تھا۔ نماز جمعہ کے بعد جلوس کی صفیں ابھی ٹھیک طور پر مرتب نہ ہوئی تھیں کہ عقل کی اندھی پولیس

لٹھ لے کر لوگوں کو بے تحاشا پیٹنے لگی اور بد بخت ڈی ایس پی چیمہ نے اپنے ہاتھوں سے (اور جہاں تک مجھے یاد ہے لاتوں اور بوٹوں کی ضربوں سے) مولانا عبیداللہ انور کو زد وکوب کیا۔ اس ظالم نے مولانا کو اس بری طرح مارا کہ مولانا عبیداللہ انور "البرٹ وکٹری ہسپتال میں تین روز تک بے ہوش رہے۔ حتیٰ کہ عیدالفطر کی نماز بھی بے ہوشی کی وجہ سے ادا نہ کر سکے۔ کئی روز تک پیشاب، پاخانہ اور قے میں خون آتا رہا۔ ملک بھر میں شور مچ گیا۔ اور ایوب حکومت کو لینے کے دینے پڑ گئے اور فی الحقیقت یہ بہیمانہ تشدد ایوب حکومت کے تابوت میں آخری میخ ثابت ہوا۔ (مولانا مفتی محمود از نعیم آسی صفحہ ۸۸)

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اس وقت اپنے گاؤں عبدالخیل میں تھے۔ جب اس بہیمانہ تشدد کی خبر انھیں ملی۔ انھوں نے ۳۰ر رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۱ر دسمبر ۱۹۶۸ء ڈیرہ اسماعیل خان آکر ڈیرہ کے ذمہ دار حضرات مولانا قاضی عبدالکریم، مولانا قاضی عبداللطیف کلاچی، مولانا عبدالحق، مولانا قاضی عطاء اللہ ٹانک، مولانا علاؤ الدین صاحب، مولانا عبدالقدوس، مولانا عبدالسلام، مولانا غلام اکبر سلیمانی اور راقم الحروف کے علاوہ چند اور احباب سے مشورہ کیا۔ کہ فوری طور پر جماعت کی طرف سے کیا ردعمل ظاہر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ڈیرہ سے امیر جماعت حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی صاحب، مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب اور دیگر راہنماؤں سے بذریعہ فون رابطہ کیا اور بالآخر اگلے جمعہ ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۸ء مطابق ۶ر شوال ۱۳۸۸ھ لاہور کے اسی میدان سے دوبارہ جلوس نکالنے کا اعلان کر دیا اور صوبائی مجلس شوریٰ کے اراکین کو لاہور پہنچنے کی ہدایت کی اور حکومت کو چیلنج کر دیا کہ وہ اس جلوس کو روک کر دیکھے۔ اگلے جمعہ لاہور میں جلوس نکلا، اور اس شان سے نکلا کہ حکومت کا کوئی فرد ان کے سامنے نہ آیا، جلوس شیرانوالہ باغ سے شروع ہو کر مستی گیٹ تھانہ کے سامنے سے گذر کر پانی والے تالاب کے راستے شاہ عالم مارکیٹ میں داخل ہوا اور اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ کر پر امن طریقہ سے منتشر ہو گیا۔ اس دوسرے جلوس کے ردعمل سے متاثر ہو کر ایوب خان نے ایک نشری تقریر

میں علمائے کرام سے عموماً اور مولانا عبیداللہ انور سے خصوصاً معذرت کی۔

مولانا عبیداللہ انور پر بہیمانہ تشدد پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد نعیم آسی صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا عبیداللہ انور پر تشدد اور اس کے ردعمل سے صدر ایوب کے اقتدار کا سنگھاسن ڈولنے لگا تو دسمبر ۱۹۶۸ء کے آخری دنوں وہ خود لاہور آیا۔ یہ اندازہ کر کے کہ نفاذ شریعت کا مطالبہ اٹھانے کے باعث علمائے کرام کو عوام میں سیاسی رسوخ حاصل ہو رہا ہے۔ اس نے اس کا توڑ سوچنا شروع کیا چناں چہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو اس نے گورنر ہاؤس لاہور میں اپنے جماعتی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے ایک شاطرانہ چال چلی اور اعلان کیا:

''میرا ایمان ہے کہ پاکستان میں شرعی قوانین نافذ ہونے چاہئیں، میں علما سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مل جل کر بیٹھیں اور اسلامی ضابطہ کا ایک ایسا جامع مسودہ تیار کریں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لیے قابل قبول ہو اور جو قومی اسمبلی کی منظوری کے بعد ملک میں نافذ کیا جائے۔ ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ یہ محض جذبات سے حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بہت سے نازک پہلو ہیں۔ مسلمانوں کے بہت سے طبقے ہیں۔ جن کے مختلف عقائد اور خیالات ہیں اس لیے ان معاملات پر یکساں قوانین کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک علما کسی ایک بات پر متفق نہ ہو جائیں۔''

(مفتی محمود۔ صفحہ ۸۹، بحوالہ روزنامہ جنگ کراچی یکم جنوری ۱۹۶۹ء)

ایوب خان کا خیال تھا کہ اس طرح علما آپس میں دست و گریبان ہو جائیں گے لیکن علمائے کرام نے یک زبان ہو کر ایوب خان کے بیان کو مسترد کر دیا اور حضرت مفتی صاحب نے اس کے جواب میں کہا:

''مجھے تعجب ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کے خلاف سازشی گروہ نے

پاکستان کے یوم تاسیس سے لے کر آج تک جس بوگس دلیل کا سہارا لیا تھا۔ آج صدر ایوب خان نے بھی اس کا اعادہ کیا ہے میں صدر ایوب سے پوچھتا ہوں کہ مختلف اسلامی فرقوں کے ۳۱ علمائے کرام نے آئین کے متعلق جن ۲۲ اصولوں کو اتفاق رائے سے طے کیا تھا۔ کیا صدر ایوب خان نے انھیں اپنے دستور کا حصہ بنا لیا ہے؟ عائلی قوانین میں ترمیم کے سلسلہ میں قومی اسمبلی کی سب کمیٹی (جس میں تین خواتین بھی شامل تھیں) جو ترمیمی رپورٹ اتفاق رائے سے پیش کی تھی کیا اسے اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کر دیا گیا تھا؟ گذشتہ عام انتخابات کے دوران بھی صدر ایوب خان نے اسلامی قوانین کے بارے میں سفید کاغذ پر دستخط کرنے کا اعلان کر کے قوم کو ''سیاہ باغ'' دکھائے تھے۔ لیکن آج قوم کا شعور بیدار ہو چکا ہے۔ وہ اس قسم کی باتوں سے گمراہ نہیں ہو سکتی۔ اسلام میں ہر فرقہ کے شخصی قوانین کو اس کے عقیدہ کے مطابق تحفظ حاصل ہے۔ اس لیے مختلف فرقوں کی موجودگی اسلامی قوانین کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ مسلم قوم اب بیدار ہو چکی ہے۔ اور اس طرح کی بوگس اور بوسیدہ باتوں سے اسے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔''

ایوب خان ان باتوں کا کیا جواب دیتے۔ ان کا تو مقصد ہی کچھ اور تھا۔

(مفتی محمود۔ از نعیم آسی، صفحہ ۹۰، از ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور بابت ۱۰ر جنوری ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳)

ایوب خان کو ملک کے اقتدار پر سول سروس کے غلبہ کی وجہ سے قبضہ کرنے کا حوصلہ ہوا۔ جس نے پاکستان کے سیاسی اقتدار پر مکمل عمل دخل حاصل کر لیا تھا۔ جس کی وجہ اقلیتی فرقوں اور معاشی استحصالی طبقوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ ایوب خان کو عوام نے اس لیے خوش آمدید کہا تھا کہ ۱۰ سالہ کوتاہیوں کا ازالہ ہو سکے۔ لیکن ایوب خان نے سول سروس کے ساتھ ملٹری سروس کو بھی ملک کے اقتدار پر گرفت کا موقع فراہم کر دیا جس نے عوام کے لیے بھی کچھ نہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ اسلام کو غالب لانے سے نہ

صرف گریز کیا بلکہ اسلام کے بنیادی احکام بالخصوص اسلامی معاشرت کے اہم ترین شعبے، نکاح وازدواج کے احکام کو عائلی قوانین کے نام سے تبدیل کرنے کی کوششیں کر ڈالیں نیز خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے فحاشی کو فروغ دیا۔ علاوہ ازیں ایسے اداروں واشخاص کو چھا جانے کے مواقع فراہم کیے جو اسلام کے نظریات وعقائد میں خودساختہ اور من مانی تحریفات پر دلیر تھے۔ ملک کے اقتصادی وسائل ترقی کے نام پر مخصوص خاندانوں کی اجارہ داری میں دے ڈالے۔ جس سے عوام معاشی بدحالی اور پس ماندگی کا شکار ہو گئے۔ کسانوں، مزدوروں، چھوٹے دکان داروں، معمولی ملازم پیشہ لوگوں کے لیے زندگی گذارنا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل تر مسئلہ بن گیا۔

ظاہر ہے کہ اس بدترین صورت حال کو برداشت کرنا ممکن نہیں تھا۔ مسلمان عوام نہ تو اپنے دین میں تحریف اور انحراف کو خاموشی کے ساتھ دیکھ سکتے تھے اور نہ مسلسل سرمایہ دارانہ استحصال وتغلب پر چپ رہ سکتے تھے مختصر یہ کہ

(۱) ملک میں دفعہ ۱۴۴ کے ذریعہ عوام کی زبان بندی۔

(۲) یونی ورسٹی آرڈیننس کے ذریعہ اعلی تعلیم کا حصول اور اس کے خلاف آواز اٹھانے پر پابندی۔

(۳) صحافت پر مستقل پابندی اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے ذریعہ غلامانہ صحافت کی بنیاد۔

(۴) بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے شخصی حکم رانی۔

(۵) مرزائیوں کی مذہبی وسیاسی آزادی جیسے جبر واستبداد کے حربوں سے چھٹکارا حاصل کیے بغیر اسلامی نظام کے نفاذ کی منزل کی طرف بڑھنا ناممکن بن کر رہ گیا تھا۔

اس ماحول میں جمعیت علمائے اسلام نے پیش قدمی کی اور ۱۹۶۸ء میں پورے دس ماہ اس جبر واستبداد کے خلاف جس پامردی اور استقلال سے جدوجہد کی، اس کے نتیجہ خیز اثرات کو مخالف سیاسی جماعتوں اور دینی حلقوں نے محسوس کیا اور ایک نئے

دائرہ عمل کی تشکیل کی ضرورت کو سمجھ لیا۔ اور جمعیت علمائے اسلام دینی حلقوں میں کافی مقبول جماعت بن گئی۔ جمعیت علمائے اسلام نے جنوری ۱۹۶۹ء کے اوائل میں مشرقی پاکستان کی صوبائی کانفرنس رکھی۔ اس موقع پر ڈھاکہ میں ۴، ۵؍ جنوری کو مرکزی مجلس عمومی کا اجلاس ہوا۔ جس میں جمعیت علمائے اسلام کی مساعی کو ملک کے دونوں حصوں میں تیز تر کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ نیز ملک کی دیگر سیاسی جماعتوں سے اشتراک عمل کی اگر کوئی صورت ممکن ہو تو ایسا کرنے کے لیے مولانا مفتی محمود کو نمائندہ چن لیا گیا۔

ملک میں پہلے سے پاکستان تحریک جمہوریت (P.D.M.) کے نام سے ایک اتحاد موجود تھا جس میں (۱) پاکستان عوامی لیگ (نواب زادہ نصر اللہ گروپ) (۲) نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ (۳) کونسل مسلم لیگ (۴) نظام اسلام پارٹی (۵) جماعت اسلامی شامل تھے۔ لیکن P.D.M کے مطالبات سے ملک میں کسی سیاسی تبدیلی کا امکان نہیں تھا۔ انہی تاریخوں میں پاکستان جمہوری تحریک نے ڈھاکہ میں اجلاس بلایا ہوا تھا اور ان پانچ جماعتوں کے علاوہ دیگر تین سیاسی جماعتوں کو بھی اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی (۱) جمعیت علمائے اسلام (۲) نیشنل عوامی پارٹی (ولی قصوری گروپ) (۳) عوامی لیگ (مجیب الرحمٰن گروپ)

جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے مفکر اسلام مولانا مفتی محمود صاحب مرحوم نے نمائندگی کی، ۸ جماعتوں کے مشترکہ اجلاس میں مولانا مفتی محمود صاحب نے اپنی جماعت کا مؤقف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) مثبت اور دیرپا اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ اسلام بناء اتحاد ہو اور علما کے بائیس نکات پروگرام میں شامل کیے جائیں۔

(۲) آیندہ انتخابات کا بائی کاٹ کیا جائے اس لیے کہ موجودہ نظام میں نہ تو حقیقی آزادانہ انتخابات ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے ذریعہ موجودہ حاکمیت کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

مولانا مفتی محمود صاحب کی اس تجویز سے تو اکثر جماعتوں نے اتفاق نہ کیا لیکن آٹھ جماعتوں کا اتحاد "جمہوری مجلس عمل" کے نام سے ۸ر جنوری ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں قوم کے سامنے پیش کر دیا گیا اور درج ذیل آٹھ نکاتی فارمولا پر اتفاق کا اعلان کر دیا گیا۔

(۱) وفاقی پارلیمانی نظام کا قیام جو موجودہ آمرانہ نظام کی جگہ لے سکے۔

(۲) بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات (جن کے ذریعہ ایسے نمائندے منتخب کیے جا سکیں جو اسلامی نظام کے نفاذ کو ملک کا دستور بنا سکیں)

(۳) ہنگامی حالات کے نفاذ کی فوری تنسیخ۔

(۴) شہری آزادیوں کی مکمل بحالی اور کالے قوانین بالخصوص جن کے ذریعہ بغیر مقدمہ چلائے قید و بند میں ڈالا اور رکھا جاتا ہے۔ نیز یونی ورسٹی آرڈیننس، ان سب کی فوری تنسیخ۔

(۵) تمام سیاسی نظر بندوں، قیدیوں، طلبا، مزدور، صحافی بشمول شیخ مجیب الرحمٰن، خان عبدالولی خان، اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، ان سب کی فوری رہائی۔ تمام سیاسی مقدمات جو عدالتوں اور ٹریبونلوں کے سامنے پیش ہیں۔ اور سیاسی مقدمات کے سلسلے میں جاری کردہ وارنٹوں کی فوری تنسیخ۔

(۶) دفعہ ۱۴۴ کے تحت جاری کردہ تمام احکامات کی فوری تنسیخ۔

(۷) مزدوروں کے حق میں ہڑتال کی فوری بحالی۔

(۸) پریس پر عائد پابندیوں کا خاتمہ، جن میں نئے ڈیکلریشنوں کی اجازت ضبط کردہ اخبارات، رسائل، مطابع، اور معطل کردہ ڈیکلریشنوں کی بحالی اور "اتفاق" اور "پروگریسو پیپرز لمیٹڈ" کی ان کے اصل مالکان کو واگذاری بھی شامل ہے۔

(ڈھاکہ کا آٹھ جماعتی فیصلہ، مرتبہ احمد حسین کمال، صفحہ ۲۰)

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا سیاسی اتحاد تھا۔ اتحاد میں جماعت اسلامی کی شمولیت کی وجہ سے جمعیت علمائے اسلام میں کچھ اختلاف رائے پیدا ہوا۔ لیکن

نتائج کے لحاظ سے یہ اتحاد جمعیت کے لیے نیک فال ثابت ہوا اور ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ اعتماد آ گیا کہ جمعیت علمائے اسلام چند مولوی صاحبان کی جماعت نہیں بلکہ صحیح معنی میں ایک دینی سیاسی جماعت ہے۔

ایوب خان کے اقتدار کو آخری دھکا:

جمعیت علمائے اسلام پاکستان کی تاریخی کانفرنس اور علمائے کرام کے ۵ر مئی ۱۹۶۸ء کے جلوس نے ایوب خان کے اقتدار میں زلزلہ برپا کر دیا۔ اور اقتدار کی چار دیواری میں شگاف ڈال دیئے۔ علمائے کرام کی یک جہتی کانفرنس اور جلوس میں عوام کی لاتعداد شرکت اور دل چسپی نے قومی اخبارات کو جمعیت علمائے اسلام کی طاقت کا احساس دلا دیا۔ اور اخبارات کو مجبوراً جمعیت علمائے اسلام کی جدوجہد کو اہمیت دینی پڑی۔ ایوب خان آمریت سے دبے ہوئے سیاست دان بلوں سے باہر نکلنے لگے۔ ان حالات میں جمعیت علمائے اسلام ڈیرہ اسماعیل خان نے ۲۲ر اگست ۱۹۶۸ء کو بنوں کی جامع مسجد حق نواز میں ایک بھرپور اجلاس کا انعقاد کیا۔ جس میں ڈویژنل جمعیت کے عمومی کے اراکین کے علاوہ ڈویژن بھر کے علمائے کرام نے شرکت کی اور اگلے سال مارچ میں ڈیرہ اسماعیل خان میں مغربی پاکستان سطح پر کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ راقم الحروف اس کانفرنس کا قدرے تفصیل سے ذکر کرے گا۔ کیوں کہ مذکورہ کانفرنس حضرت مفتی محمود صاحب مرحوم کے علاقہ میں منعقد ہوئی، اس لیے اس کے انعقاد اور کام یابی کو ان کی سیاسی جدوجہد سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کانفرنس کی کام یابی نے جمعیت علمائے اسلام کے اکابرین کو عمل کی نئی راہوں کی تلاش اور جستجو پر آمادہ کیا اور کارکنوں کو نئے حوصلے کا پیغام دیا۔ اور دوسری طرف یہ کانفرنس صدر ایوب خان کے اقتدار میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ جب کہ اس کا ذکر جمعیت علمائے اسلام کی مطبوعات میں نہیں۔

ڈیرہ ڈویژن اس وقت ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں کے اضلاع پر مشتمل تھا اور

اس کے ڈویژنل امیر مولانا قاضی عبدالکریم صاحب (کلاچی) اور ناظم عمومی مولانا علاؤالدین صاحب (ڈیرہ اسماعیل خان) تھے۔ اس کانفرنس کا فیصلہ مسجد حق نواز ہوں میں ہوا کیوں کہ کانفرنس ڈیرہ اسماعیل خان میں رکھی گئی تھی اس لیے استقبالیہ کے اکثر اراکین ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھتے تھے۔ صدر استقبالیہ مولانا صاحب زادہ عبدالحکیم شیرانی صاحب، ناظم مولانا قاضی عبداللطیف صاحب، اور خازن راقم الحروف کو مقرر کیا گیا۔ کانفرنس کے سلسلہ میں دوسرا اجلاس یا مجلس استقبالیہ کا پہلا اجلاس پینرو میں ۲۵ رشعبان المعظم ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۷ رنومبر ۱۹۶۸ء بروز اتوار ہوا۔ بندہ کی تجویز پر اس کا نام آئین شریعت کانفرنس رکھا گیا۔ مولانا عبدالحق مرحوم (ٹانک) امیر جمعیت علمائے اسلام ضلع ڈیرہ اسماعیل خان نے اس کی تائید کرتے ہوئے فرمایا تھا ''یہ نام ٹھیک ہے۔'' کیوں کہ متحدہ ہندوستان میں بھی ہم اس نام سے جمعیت علمائے ہند کی طرف سے کانفرنس کرتے تھے۔ بہر حال اس کانفرنس کی تاریخیں ۱۸، ۱۹، ۲۰ رذی الحجہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۷، ۸، ۹ رمارچ ۱۹۶۹ء مقرر ہوئیں۔ جس میں پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد، آزاد کشمیر، آزاد قبائلی علاقہ جات کے لوگوں نے بھرپور شرکت کی۔

۱۷ رذی الحجہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۷ رمارچ ۱۹۶۹ء بروز جمعۃ المبارک، جمعہ کی نماز کے بعد پہلی نشست ہوئی۔ جس کی صدارت نائب امیر کل پاکستان جمعیت علمائے اسلام ولی ابن ولی حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحبؒ نے کی۔ خطبہ استقبالیہ راقم الحروف نے پڑھا اور خطبہ صدارت، صدر اجلاس نے ارشاد فرمایا، اس کے بعد تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ تین دن اور دو رات جاری رہا۔ کانفرنس کے دوسرے دن صبح ۹ بجے جلال پارک (موجودہ حق نواز پارک) سے ایک جلوس حضرت مولانا عبیداللہ انور نائب (وقائم مقام) امیر مرکزیہ کی قیادت میں شروع ہوا۔ جس میں پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، آزاد قبائل خصوصاً جنوبی وشمالی وزیرستان، تیرائی علاقہ اور آزاد کشمیر کے لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ جلوس پارک سے نکل کر

توپانوالہ دروازہ کی طرف سید حاسر کلر روڈ کے شمال مشرق کے آخری کنارہ سے مغرب کی طرف مڑا پھر شمال کی پوری سڑک مکمل کر کے آخر شمال مغربی کنارہ سے جنوب کی طرف سے شہر میں بونداوالا دروازہ سے داخل ہو کر، باکھری بازار، چوگلیہ، بکری بازار، رحیم بازار سے ہو کر توپانوالہ دروازہ جلسہ گاہ میں پہنچا۔ اس وقت کے موجود لوگ اس پر گواہ ہیں کہ جب یہ جلوس توپانوالہ دروازہ سے جلسہ گاہ کی طرف مڑا تو دوسری جانب چند فرلانگ کے فاصلہ پر جلوس کا آخری فرد موجود تھا۔ بہر حال اس زمانہ میں ڈیرہ اسماعیل خان میں اس قسم کے جلوس نے پورے ملک میں تہلکہ مچادیا۔

کانفرنس میں جمعیت علمائے اسلام کی مرکزی اور صوبائی (مغربی پاکستان) مجالس عاملہ کے اراکین صوبہ مغربی پاکستان کے قابل ذکر علمائے کرام، زعمائے ملت دانش ور اور قابل قدر سیاسی شخصیات شریک ہوئیں۔ میری یادداشت کے مطابق درج ذیل حضرات نے کانفرنس سے خطاب فرمایا،

حضرت مولانا عبیداللہ انور، حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی، حضرت مولانا سید گل بادشاہ صاحب، حضرت مولانا عبدالحق حقانی صاحب (وانا) مولانا دوست محمد صاحب قریشی، مولانا قاضی مظہر حسین صاحب چکوال، سردار عبدالقیوم صاحب (آزاد کشمیر) اور جناب نواب زادہ نصراللہ خان و دیگر حضرات حافظ القرآن والحدیث امیر محترم حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی صاحب تشریف نہیں لائے تھے جب کہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ''جمہوری مجلس عمل'' کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی وجہ سے اس کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے، آپ ۵ رمارچ کو ملتان سے تشریف لائے اور کانفرنس کے انتظامات کا جائزہ لیا اور ۶ رمارچ کو واپس لاہور چلے گئے۔

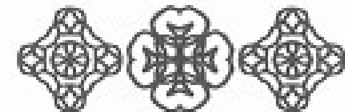
کیوں کہ جمہوری مجلس عمل میں شریک جماعتوں کے مابین اختلاف رائے کو دور کرنے کے لیے پہلے تو مشرقی پاکستان کی مجلس عمل کا اجلاس ۶ رتا ۸ رمارچ لاہور میں ہوا۔ جس میں جمہوری مجلس عمل کی مرکزی کمیٹی کے لیے پانچ سفارشات منظور کی

گئیں۔

۹ مارچ کو "جمہوری مجلس عمل" کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مذکورہ پانچ نکات پر غور کیا گیا۔ جب کہ اس کے تین آخری نکات اس مشترکہ اعلان کے مطابق نہ تھے۔ جو "جمہوری مجلس عمل" کی تاسیس کے وقت جاری کیا گیا۔ اس اجلاس میں شیخ مجیب الرحمٰن کا رویہ خاص طور پر بڑا سخت تھا جو اپنے مخصوص مطالبات پر نہایت سختی کے ساتھ ڈٹ گئے تھے جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے اس اجلاس میں مولانا مفتی محمود صاحب نمائندگی کر رہے تھے۔ انھوں نے پیش نامہ میں یہ دو مطالبات شامل کرائے۔

۱۔ علما کے بائیس نکات دستور میں شامل کرائے جائیں تاکہ دستور مکمل طور پر اسلامی بن سکے۔

۲۔ دستور میں ایک دفعہ شامل کی جائے۔ جس میں مسلمان کی ایسی جامع و مانع تعریف ہو کہ جس کے بعد کوئی غیر مسلم اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر ملک کا سربراہ بننے کے لیے بطور امیدوار کھڑا نہ ہو سکے۔ (بحوالہ مفتی محمود، نعیم آسی، صفحہ ۹۸)



مقالاتِ مفتی محمودؒ سمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۸

مفتی محمودؒ ایک سیاسی قائد

مولانا زاہد الراشدی صاحب
چیف ایڈیٹر ماہنامہ الشریعہ
گوجرانوالہ

مفتی محمودؒ اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۵)

''مفتی صاحب'' ایک عالم دین کے طور پر اس نظریاتی تحریک کے نمائندہ اور باشعور راہ نما تھے جسے ولی اللّٰہی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس نے اس خطۂ ارض میں مسلمانوں کے دینی تشخص، علوم و روایات اور ثقافت وتمدن کے تحفظ اور آزادی کے حصول کے لیے کم وبیش دو صدیوں پر محیط طویل جنگ لڑی اور دینی درس گاہوں کے ساتھ ساتھ جیل کی کال کوٹھڑیوں، پھانسی کے پھندوں اور میدان جہاد کے معرکوں کو بھی رونق بخشی۔''

حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز صرف ایک سیاست دان نہیں تھے بلکہ دینی علوم کے متبحر استاذ، بیدار مغز مفتی، فقیہ النفس عالم، حق گو خطیب اور شب زندہ دار عارف باللہ بھی تھے اس لیے ان کی ان متنوع اور گونا گوں حیثیتوں میں سے سیاست دان اور سیاسی قائد کی حیثیت کو الگ کرنا اور اس کے امتیازات وتخصصات کو جداگانہ طور پر پیش کرنا ایک مشکل اور دشوار امر ہے اور شاید یہ ان کے ساتھ ناانصافی بھی ہو کہ انھیں صرف سیاسی قائد کے طور پر سامنے لایا جائے۔

سیاست زندگی بھر حضرت ''مفتی صاحب'' کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے، انھوں نے سیاست کو مشغلہ، ہابی یا آج کے سیاسی پس منظر میں کاروبار کے طور پر نہیں بلکہ مشن اور فریضہ کے طور پر اختیار کیا اور اس کا حق ادا کر کے دکھایا، ان کا شمار ملک کے مقتدر اور کامیاب سیاست دانوں میں ہوتا تھا اور ان کی سیاسی قیادت کا لوہا ان کے معاصر بلکہ سینیئر سیاست دانوں نے بھی مانا لیکن آج سیاست اور سیاست دان کی اصطلاحات کے گرد مفہوم و تعارف کے جو نامانوس دائرے نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اور جن لوازمات نے ایک سیاست دان کے لیے ناگزیر حیثیت اختیار کر لی، ان کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا مفتی محمودؒ کو ''سیاسی قائد'' کے طور پر پیش کرتے ہوئے طبیعت ہچکچا رہی ہے اور دل کو خوف محسوس ہو رہا ہے کہ کل قیامت کے روز مفتی صاحب گریبان پکڑ کر کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ:

''ظالم! تم تو مجھے جانتے تھے، میری خلوت وجلوت سے واقف تھے تم نے مجھے کس صف میں کھڑا کر دیا؟''

مجھے مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ ایک کارکن اور پھر ٹیم کے رکن کے طور پر طویل

عرصہ کام کرنے کا موقع ملا ہے جو کم وبیش دو دہائیوں پر محیط ہے، میں نے مفتی صاحب کو علما کی صف میں انھیں سیاست کے اسرار و رموز سمجھاتے اور اس کے لیے انھیں تیار کرتے دیکھا ہے، سیاست دانوں کے ساتھ معاملات طے کرتے اور ان سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے دیکھا ہے، عوامی اجتماعات میں لوگوں کو ابھارتے اور ان کے جذبات سے کھیلتے ہوئے دیکھا ہے، اہل فکر و دانش کی محافل میں اسلام کی حکیمانہ ترجمانی کرتے اور اسلامی احکام وقوانین پر اعتراضات کے مسکت جوابات دیتے ہوئے دیکھا ہے، کہنہ مشق صحافیوں کے گھیرے میں ان کے تندو تیز سوالات کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کرتے ہوئے دیکھا ہے، مسند تدریس پر قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے علوم ومعارف کو آج کی زبان اور اسلوب میں پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے اور نصف شب تک جلسہ سے خطاب کے بعد علالت اور تھکاوٹ کے باوجود سحری کے وقت جائے نماز پر قبلہ رو بیٹھے اللہ اللہ کرتے اور آنسو بہاتے بھی دیکھا ہے اس لیے میرے نزدیک مولانا مفتی محمودؒ کا تعارف محض ایک سیاسی قائد اور سیاست دان کا تعارف نہیں ہے بلکہ میں ان کے ایک کارکن اور ساتھی کے طور پر انھیں اس سے بالکل مختلف حیثیت اور نظر سے دیکھتا ہوں اور ان سطور میں ان کی اسی حیثیت کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میرے نزدیک مفتی صاحب کی بنیادی حیثیت ایک عالم دین کی ہے اور روایتی عالم دین نہیں بلکہ وہ عالم جس کے بارے میں امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ:

رجل یدری ویدری انه یدری فهو عالم فاتبعوه.

''وہ شخص جو علم رکھتا ہے اور علم کی ذمہ داری کا احساس بھی رکھتا ہے وہی صحیح معنوں میں عالم ہے اس کی پیروی کرو۔''

مولانا مفتی محمودؒ ایک پختہ کار عالم دین تھے اور اس حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے نہ صرف کما حقہٗ آگاہ تھے بلکہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آخر دم تک کوشاں رہے حتی کہ اہل علم ہی کی ایک محفل میں علمی ذمہ داریوں کو ادا

کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے، سیاست کو انھوں نے اپنے انہی فرائض کی انجام دہی کے لیے ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر اختیار کیا اور اسے منزل یا مقصود بنانے کی بجائے آخر وقت تک وسیلہ اور ذریعے کے درجے میں ہی رکھا۔

مفتی صاحبؒ ایک عالم دین کے طور پر اس نظریاتی تحریک کے نمائندہ اور باشعور راہ نما تھے جسے ولی اللٰہی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس نے اس خطۂ ارض میں مسلمانوں کے دینی تشخص، علوم و روایات اور ثقافت و تمدن کے تحفظ اور آزادی کے حصول کے لیے کم وبیش دو صدیوں پر محیط طویل جنگ لڑی اور دینی درس گاہوں کے ساتھ ساتھ جیل کی کال کوٹھڑیوں، پھانسی کے پھندوں اور میدان جہاد کے معرکوں کو بھی رونق بخشی۔ مفتی صاحب نے اسی درس گاہ حریت سے تربیت حاصل کی اور انہی اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، وہ اپنے اساتذہ کے صرف علوم کے وارث نہیں تھے بلکہ ان کی جدوجہد اور روایات کے بھی امین تھے اور ان کی زندگی بھر کی تگ و تاز اس بات پر گواہ ہے کہ انھوں نے اس وراثت و امانت کی حفاظت اور اسے اگلی نسل تک پہنچانے میں کوئی کمی اور کوتاہی اپنی استطاعت کی حد تک روا نہیں رکھی۔

مفتی صاحبؒ کی جدوجہد کا سب سے بڑا ہدف اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ اور اسلامی احکام وقوانین کی عمل داری رہا ہے، انھیں زندگی میں جب بھی کوئی فیصلہ کن موقع ملا ہے انھوں نے نفاذ اسلام کے لیے اس موقع کو استعمال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور ایک ہوشیار سیاست دان کی طرح انھوں نے موقع کی نزاکت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے، میں اس سلسلہ میں تین مواقع کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

- ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیت علما اسلام کو صوبہ سرحد کی اسمبلی میں چالیس کے ایوان میں چار نشستیں حاصل ہوئی تھیں اور دو آزاد ارکان الیکشن کے بعد جمعیت میں شامل ہو گئے تھے اس طرح جمعیت کے پاس چالیس میں سے چھ سیٹیں تھیں اور صوبائی حکومت کے لیے اصل مقابلہ نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ قیوم

گروپ کے درمیان تھا جن کے پاس غالباً پندرہ اور گیارہ سیٹیں تھیں، خان عبدالولی خان اور خان عبدالقیوم خان مرحوم صوبائی سیاست میں روایتی حریف چلے آرہے تھے اور ایک دوسرے کو صوبائی حکمران کے طور پر قبول کرنا دونوں میں سے کسی کے لیے بھی آسان نہیں تھا، اس لیے دونوں نے جمعیت علما اسلام کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی، مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیت علما اسلام کے قائد کی حیثیت سے موقع کی نزاکت کا اچھی طرح اندازہ کرلیا اور تعاون کے لیے جو شرائط عائد کیں ان میں وفاق میں دستور ساز اسمبلی میں دستور پاکستان کی ترتیب و تدوین کے دوران اسلامی امور میں جمعیت سے تعاون اور صوبہ میں اسلامی قوانین و احکام کے نفاذ کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، خان عبدالولی خان اور خان عبدالقیوم خان مرحوم دونوں نے ایک دوسرے کے خوف میں یہ شرطیں منظور کرلیں اب جمعیت علما اسلام کی طرف سے نئی شرط عائد کردی گئی کہ صوبہ میں وزیر اعلیٰ بھی جمعیت کا ہوگا یہ شرط بھی دونوں نے منظور کرلی، اس پر جمعیت علما اسلام نے نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ مل کر صوبہ سرحد میں حکومت بنانے کا فیصلہ کیا اور نہ صرف مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بن گئے بلکہ نیشنل عوامی پارٹی اپنے منشور اور پارٹی مزاج کے علی الرغم دستور ساز اسمبلی میں اسلامی معاملات میں جمعیت کا ساتھ دینے کی پابند ہوگئی جب کہ بلوچستان میں صوبائی اسمبلی کی بیس میں سے تین نشستیں جیتنے والی جمعیت علما اسلام سردار عطاء اللہ مینگل کے ساتھ شریک اقتدار ہوئی تین میں سے ایک ممبر ڈپٹی اسپیکر بنا اور دوسرا صوبائی وزیر کی حیثیت سے حکومت میں شامل ہوا۔

مفتی صاحب نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اسلامی اصلاحات کے نفاذ اور سادگی کے ساتھ حکومت کرنے کی جو مثال اس دس ماہ کے دور میں قائم کی وہ ان کی شخصیت اور جمعیت کی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہے اور یہ پارٹی لیڈر کے طور پر ان کی معاملہ فہمی، سیاسی تدبر اور موقع شناسی کا ایک شاندار مظاہرہ بھی ہے۔

دوسرا موقع دستور ساز اسمبلی میں ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کا ہے، ۱۹۷۰ء

میں منتخب ہونے والی اس دستور ساز اسمبلی میں پاکستان پیپلز پارٹی کو واضح اکثریت حاصل تھی اور اس کے منشور میں سوشلزم کا عنصر نمایاں تھا لیکن مولانا مفتی محمودؒ نے دستور ساز اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کے طور پر جس سیاسی ہوش مندی کا ثبوت دیا یہ اس کا ثمرہ ہے کہ دستور پاکستان میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے کے علاوہ ملک کے تمام قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی ضمانت موجود ہے اور سیکولر لابیوں کے گلے کی پھانس بنی ہوئی ہے۔

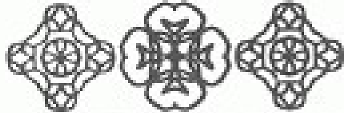
دستور ساز اسمبلی میں مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد، مولانا ظفر احمد انصاری، اور دیگر مذہبی شخصیات بھی موجود تھیں اور دستور میں زیادہ سے زیادہ اسلامی دفعات شامل کرانے کے لیے مسلسل کوشاں تھیں لیکن فیصلہ کن حیثیت مولانا مفتی محمودؒ کو حاصل تھی اس طور پر کہ دستور ساز اسمبلی میں بلوچستان سے چار ارکان منتخب ہوتے تھے جن میں سے تین نیشنل عوامی پارٹی کے تھے اور ایک کا تعلق جمعیت علما اسلام سے تھا، یہ چار کے چار مفتی صاحبؒ کے کنٹرول میں تھے، کہنے کو یہ چار تھے لیکن ایک مکمل صوبے اور وفاق کی ایک اکائی کی نمائندگی کر رہے تھے اور ان کے بغیر نہ وفاق مکمل ہوتا تھا اور نہ دستور پاس ہوسکتا تھا گویا ان چار ارکان کی صورت میں مفتی صاحبؒ کے پاس وفاق کی ایک مکمل اکائی کی قوت موجود تھی اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی دستور پاس نہیں ہوسکتا تھا۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی اکثریت کے زعم میں اپنے منشور اور نظریات کے مطابق دستور تشکیل دینے پر مصر تھی اور ایوان میں من مانی کررہی تھی چنانچہ مفتی صاحبؒ کی قیادت میں اپوزیشن نے دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کا بائی کاٹ کردیا، یہ صرف اپوزیشن کا بائی کاٹ نہیں تھا بلکہ اس میں وفاق کی ایک مکمل اکائی کا بائی کاٹ بھی شامل تھا چنانچہ بھٹو حکومت مذاکرات پر مجبور ہوئی اور ان مذاکرات میں حکومت کو اپوزیشن کے دیگر مطالبات کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان اسلامی دفعات کو بھی دستور کے حصہ کے طور پر قبول کرنا پڑا جو آج بھی دستور میں شامل ہیں اور جنہیں پاکستان کے دستور سے نکالنے اور غیر مؤثر بنانے کے لیے نہ صرف ملک کی سیکولر

لابیاں بلکہ عالمی استعماری قوتیں بھی مسلسل پیچ وتاب کھا رہی ہیں۔

تیسرا مرحلہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ان کی حکومت میں شامل ہونے اور اس شمولیت کو نفاذ اسلام کے لیے ہر ممکن طور پر مفید اور نتیجہ خیز بنانے کا تھا، مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں پاکستان قومی اتحاد نے شمولیت کا فیصلہ کیا اور قومی اتحاد حکومت میں شامل ہوگیا، یہ شمولیت سیاسی طور پر درست تھی یا نہیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر مستقل گفتگو کی ضرورت ہے البتہ اس مرحلہ پر صرف یہ بات عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مارشل لاء حکومت میں شمولیت یا عدم شمولیت کا فیصلہ کرنے کے لیے جمعیت علما اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کا جو اجلاس راول پنڈی میں حکومت میں شامل ہونے سے پہلے ہوا تھا اس میں راقم الحروف نے ضیاء حکومت میں شمولیت کی نہ صرف مخالفت کی تھی بلکہ اس پر طویل بحث بھی کی تھی اور شمولیت کے حق میں مجلس شوریٰ کے فیصلہ پر اس فیصلہ کے خلاف اپنا اختلافی نوٹ بھی ریکارڈ کرایا تھا تاہم قومی اتحاد اور اس کے ساتھ جمعیت علما اسلام نے بھی حکومت میں شمولیت اختیار کی اور مولانا مفتی محمودؒ عوامی جلسوں میں اس شمولیت کا یہی جواز پیش کرتے رہے کہ ہمارا مقصد صرف اسلام کا نفاذ ہے وہ کسی بھی ذریعے سے آئے ہم اسے قبول کریں گے اس سلسلہ میں جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے سامنے اپنے مؤقف اور پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے شیرانوالہ لاہور کے اجلاس میں جو طویل خطاب کیا اس میں انھوں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ سیاسی عمل، جمہوری جدوجہد اور انتخابات ہمارا مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہیں جن کے ذریعے ہم نفاذ اسلام کی منزل حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں اگر اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ مل جاتا ہے اور ہم اس راستے سے منزل تک جلدی پہنچ سکتے ہیں تو ہمیں اسے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے اور ہم نے اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر لگاتے ہوئے مارشل لا حکومت میں اسی لیے شمولیت اختیار کی ہے کہ اگر اس راستہ سے اسلام نافذ ہوسکتا ہو تو اس کو بھی آزما لیا جائے چناں چہ ضیاء حکومت کی طرف سے حدود آرڈیننس، وفاقی شرعی عدالت اور دیگر امور کے بارے میں چند اسلامی

اصطلاحات کے نفاذ پر مفتی صاحب نے نہ صرف ان اقدامات کی حمایت میں لاہور میں بہت بڑے جلوس کی قیادت کی بلکہ ملک بھر میں بیسیوں اجتماعات میں لاکھوں کے مجمع کے سامنے ان اقدامات کا دفاع کیا نفاذ اسلام کے لیے مارشل لا حکومت کے یہ اقدامات مؤثر کیوں نہ ہوئے؟ یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس پر کھلے دل سے بحث ہونی چاہیے لیکن اس حوالہ سے اس موقع پر صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ مولانا مفتی محمودؒ نے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے قائد کی حیثیت سے اپنے مقصد کے حصول کے لیے جو راستہ بھی ممکن نظر آیا ہے اسے استعمال کرنے میں تامل سے کام نہیں لیا اور اس کے لیے اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔

الغرض حضرت مولانا مفتی محمودؒ ایک ”روایتی سیاسی راہ نما“ نہیں بلکہ تحریک ولی اللّٰہی کے باشعور نمائندے اور پاکستان کے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے ایک ہوش مند قائد تھے جنھوں نے اپنی سیاسی قوت کو محدود اور کم ہونے کے باوجود اپنے مقاصد کے لیے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا اس میں جہاں ان کی علمی ثقافت، سیاسی تدبر، جرأت، بے باکی اور حکمت ودانش کا نمایاں حصہ ہے وہاں میرے نزدیک سب سے بڑا کردار ان کی اس اخلاقی برتری کا ہے کہ وہ کسی حکومت یا سیاسی قوت کے اس درجہ میں احسان مند نہیں تھے کہ اس سے اپنے مشن اور پروگرام کی بات کرتے ہوئے انھیں کوئی حجاب یا رکاوٹ محسوس ہو، وہ بے لوث اور قناعت پسند سیاسی راہ نما تھے اسی ”صاف دامنی“ کی وجہ سے انھیں ملک کے علمی، دینی اور سیاسی حلقوں کا اعتماد حاصل تھا اور اسی اعتماد نے اس پیش رفت اور کامیابیوں کی راہ ہموار کی جوان کی زندگی کے نمایاں ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ نفاذ اسلام کی جدوجہد کی قیادت کا آج کے دور میں ایک صحیح اور آئیڈیل نمونہ تھے خدا کرے کہ ان کی روایات اور طرز سیاست کو اگلی نسل تک اصلی حالت میں منتقل کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ آمین آمین آمین



مقالاتِ مفتی محمودؒ سمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۶

سرحد کے عالم دین وزیراعلیٰ

خطیب شہیر

مولانا محمد ضیاء القاسمی علیہ الرحمہ

جامعہ قاسمیہ۔ فیصل آباد

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۶)

"مفتی محمود کی سیاست بے دین سیاست نہیں تھی۔ ان کی سیاست پر دین غالب تھا وہ سیاست کرتے وقت سیاسی فیصلے کرتے وقت دینی مقاصد اور دینی تقاضوں کو اولیت دیتے تھے ان کی سیاست برائے دین تھی۔ سیاست برائے دنیا نہیں تھی ان کی پوری زندگی اسی بات کا نقشہ پیش کرتی ہے۔"

مولانا مفتی محمود کو میں کئی حوالوں سے جانتا ہوں۔ مفتی، عالم، درویش، مدرس، شیخ الفقہ، شیخ التفسیر، شیخ الحدیث، شیخ الادب، سیاست دان، مقرر، خطیب، مجاہد، جنگ آزادی کا بہادر سپوت، غیور پٹھان، دوستوں کا دوست، بڑوں کا نیاز مند اور چھوٹوں کے لیے دردمند

جامعہ قاسم العلوم ملتان میں دورہ حدیث پڑھنے کے لیے داخلہ لیا تو مسلم شریف کا درس جس استاذ کے حصے میں آیا ان کا اسم گرامی "محمود" تھا جو مولانا مفتی محمود کے نام سے مدرسہ کے ماحول میں پہچانے جاتے تھے۔ بھاری بھرکم جسم، گھنی داڑھی، سر پر قبائلی طرز کی پگڑی، کھلا لباس، لمبا کرتا اور کھلے پائنچوں والی شلوار، چہرہ پر وقار، کھلی پیشانی، رعب دار باوقار آنکھیں مگر عینک کے شیشے کے پیچھے۔

طلبا نے بتایا کہ یہ استاذ فقہ کے بلند پایہ عالم اور حدیث کے ممتاز مدرس ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ اپنی خداداد قوت لسانی سے اسباق کا مفہوم طلبا کے دل کی گہرائیوں میں اتار دیتے ہیں۔ فقہ میں ان کی شہرت کے دریچے کھلنے لگے اور ان کے علوم و معارف کی گرہیں کھلنے لگیں ان کا علوم و معارف کا بہتا ہوا دریا تو مجھے متاثر کر ہی رہا تھا لیکن ان کی اردو اس قدر صاف ستھری اور سلیس تھی کہ ان کے پٹھان ہونے کا معمولی سا شبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ کا طالب علمی کا دور یوپی کے مدارس میں گزرا تھا جس کی وجہ سے آپ کی اردو پر پٹھانی لہجہ کی بجائے یوپی، سی پی کے لہجے کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب علمی ذخائر کو اردو کا نستعلیق لہجہ میسر آئے گا تو اس سے حسن بیان کی شیرینی پیدا ہو جاتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا مفتی محمود اپنی خداداد صلاحیتوں سے ہمارے دلوں میں اترتے گئے۔ پھر ان سے بے تکلفی بھی ہوتی

گئی اور جب ہم دورہ حدیث سے فارغ ہوئے اسی سال ملتان میں جمعیت علمائے اسلام کا تاسیسی اجلاس ہوا۔ جس کے روحِ رواں مولانا غلام غوث ہزارویؒ تھے۔ وہ درویش خدامست بزرگ تھے۔ جمعیت علمائے اسلام کے سیاسی پودے کو قد آور کرنے میں مولانا ہزاروی کا کردار فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مفتی محمود جب ملتان میں جمعیت کے اجلاس میں شریک ہوئے تو وہ مجھے بھی چند رفقا کے ساتھ اجلاس میں لے گئے کہ آپ بھی میرے ساتھ ہی جمعیت میں شامل ہوں۔ اس اجلاس میں ایسی قد آور شخصیات نے شرکت فرمائی جن کے چہروں سے ایمان کا نور جھلکتا تھا اور آنکھوں میں تہجد کے سجدوں کا سرور نمایاں نظر آتا تھا۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اس طرح کے بلند پایہ اکابر کا اجتماع تھا۔ ان کی زیارت اور گفتگو سے ایمان تازہ ہوگیا۔ جمعیت کی تشکیل ہوگئی اور پھر ایک طویل عرصہ مفتی محمود کا ساتھ رہا۔

بڑے طویل اور مصائب سے بھرپور عرصے کے بعد مولانا مفتی محمود سیاسی افق پر ابھرے اور جب ابھرے تو پھر ابھرتے ہی چلے گئے قومی اسمبلی کا الیکشن جیتا، اپنے مدمقابل ذوالفقار علی بھٹو کو شکست دی اور یہ واحد سیٹ تھی جس پر مسٹر بھٹو کو شکست ہوئی۔ فاتح بھٹو ہونے کے حوالے سے مفتی محمود کا قد اور اونچا ہوگیا اور انھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ خاص طور پر اسلامی نظریات رکھنے والی قوتوں کو بہت طاقت اور پذیرائی ملی کہ ایک عالم دین سے سوشل ازم کا عظیم راہنما شکست کھا گیا۔ خود مسٹر بھٹو نے اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

❁ جو جماعتیں الیکشن میں حصہ لیتی ہیں ظاہر ہے اقتدار میں جاکر اپنے مقاصد اور منشور کو نافذ کرنا ان کا اولین ہدف ہوتا ہے اور حکومت مخالف تقریریں کرنا ہی مقصد سیاست ہو تو وہ ایک عالم دین ممبر و محراب سے بہتر طور پر کرسکتا ہے۔ پھر

ووٹ لینے کے لیے مارے مارے پھرنا اور الیکشن کے لیے دن رات مشقت کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے جمعیت علمائے اسلام کی قیادت نے بھی اپنی کامیابی سے اقتدار میں شامل ہوکر دینی اور اسلامی اہداف اور مقاصد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ایک سیاسی معاہدے کے ذریعے مولانا مفتی محمود سرحد کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ یہ سیاسی معاہدہ پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کے درمیان ہوا تھا اور پوری جمعیت علمائے اسلام کے عمائدین اور سربرآوردہ شخصیات نے متفقہ طور پر کیا تھا۔ جمعیت علمائے اسلام نے وزیر اعلیٰ کے لیے مولانا مفتی محمود کا انتخاب کیا تھا۔ اور یہ فیصلہ ذاتی مفادات کے لیے نہیں بلکہ دینی اور اسلامی مقاصد کے حصول کے لیے کیا تھا۔ مجھے اس وقت یہ شعور ملا کہ سیاسی معاہدوں میں عقائد و نظریات کا اتحاد مقصود نہیں ہوتا بلکہ سیاسی دینی اہداف یا عوامی فلاح و بہبود کے تقاضے ملحوظ ہوتے ہیں جو کسی طرح بھی اسلامی اقدام سے متصادم نہیں ہوتے، ان معاہدوں میں نہ کوئی بکتا ہے اور نہ ہی اپنے عقائد تبدیل کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اپنا قبلہ الگ بناتا ہے۔ ایسے معاہدے سیرت النبی میں بھی ملتے ہیں، اور میثاق مدینہ ایک تاریخ ساز معاہدہ ہے جو یہود مدینہ کے ساتھ پیغمبر انقلاب حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تنگ نظر نقادوں اور نام نہاد مصلحین کو سیرت النبی کے ان روشن پہلوؤں پر بھی نظر رکھنی چاہیے، اور اندھا دھند تنقید کی بجائے شعور و آگہی کے چراغ جلا کر بھی حقائق تلاش کرنا چاہئیں۔

❁ مولانا مفتی محمود نے سرحد کی وزارت اعلیٰ قبول کرکے اپنے تین ہدف مقرر کیے۔

۱۔ سرحد کی فضا کو زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانا اور معاشرتی برائیوں کو دور کرنا۔

۲۔ پس ماندہ علاقوں کو ترقی دینا اور ان کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کی جدوجہد کرنا۔

۳۔ صوبے کے عوام کے لیے وزیر اعلیٰ ہاؤس کا دروازہ کھلا رکھنا اور ان کے مسائل کو سننا اور حل کرنا۔

سرحد کی فضا کو اسلامی بنانے کے لیے انھوں نے وہ تمام اقدامات بروئے کار لانے کی سعی کی جو قانون نے وزیر اعلیٰ کو دیے تھے۔ مثلاً:

۱۔شراب پر پابندی۔

۲۔مساجد کو زیادہ سے زیادہ آباد کرنا۔

۳۔صوبے میں دینی تعلیم کے فروغ کے اقدامات۔

۴۔ جمعہ کے اجتماعات کو عوام کے دینی مزاج میں ترغیبی کردار ادا کرنے کی تدابیر۔

۵۔اوقاف کی مساجد کے علما کو باوقار مقام عطا کرنا۔

۶۔ سینما گھروں کی غیر اسلامی حرکات کی مؤثر روک تھام۔

۷۔ پاکستان کے جید علما سے مشاورت کا اہتمام تاکہ اس کی روشنی میں وفاقی حکومت کو اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے راہ نمائی دی جائے۔

۸۔اسکول اور کالج میں اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے مختلف تدابیر کا فروغ۔

۹۔اگر مفتی محمود کی وزارت اعلیٰ کا زمانہ طویل ہوتا اور انھیں زیادہ سے زیادہ کام کا موقعہ دیا جاتا تو زمانہ دیکھتا کہ ان کی جدوجہد سے صوبہ سرحد میں کس طرح اسلامی طرز معاشرت قائم ہوتی اور اسلام کی بہار سے صوبہ کے عوام کس طرح بہرہ ور ہوتے۔
مفتی محمود کی وزارت کے دوران تلخ تجربہ ہوا کہ اسلامی طرز معاشرت قائم کرنے میں سب سے زیادہ مسلمان کہلانے والے بے دین طبقے ہی رکاوٹ ہیں۔ سود خور، کرپٹ سیاست دان، جاگیر دار، وڈیرے اور عوام کا خون چوس کر بلند و بالا بنگلے تعمیر کرنے والے صنعت کار ہی اسلامی اقتدار کی مخالفت و مزاحمت کرتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ کہتے ہے کہ پاکستان میں چہرے بدلنے کی بجائے نظام بدلنے کی ضرورت ہے وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی بے دین طبقہ جس کی صنعت اور جاگیر اسی سودی نظام سے قائم و دائم ہے۔ مگر یہ کام جس قدر ضروری ہے

اسی قدر مشکل ہے۔ اسی طبقے کو مفتی محمود کا وزیر اعلیٰ بننا بہت شاق گزرا وہ ایک غریب مفلوک الحال طبقے کے ذہین اور ناقابل شکست شخص کو وزیر اعلیٰ کی کرسی پر بیٹھا دیکھ کر جل بھن گئے۔ چناں چہ آپ حیران ہوں گے کہ ایک طرف تو مسٹر بھٹو ہمارے حلیف تھے اور دوسری طرف ہمارے زبردست حریف تھے، چناں چہ وہ رات دن اسی بات پر محنت کرتے رہے کہ کسی طرح مفتی محمود کو وزارت اعلیٰ سے الگ کر دیا جائے ولی خان پارٹی کا کردار بھی کوئی زیادہ دوستانہ نہیں تھا وہ بھی اس داؤ میں رہتے تھے کہ کام توان کے کارکنوں کا ہو اور بدنامی مفتی محمود اور جمعیت کے کھاتے میں آئے، مولانا غلام غوث ہزاروی اسی لیے زیادہ دیر نیپ کے ہم نوا نہیں رہے، اور بالآخر معاہدہ ختم ہوگیا اور مفتی محمود وزارت اعلیٰ سرحد کے منصب سے الگ ہو گئے، اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

آپ کو یہ معلوم کر کے بھی تعجب ہوگا کہ مفتی محمود وزیر اعلیٰ بھی تھے۔ اور بھٹو کے حریف اعلیٰ بھی تھے۔ بھٹو نے مخفی طور پر سرحد انتظامیہ کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ مفتی محمود کے اہم منصوبے ناکام بناتے جائیں۔ اور ان کے احکامات کی تعمیل کرنے کی بجائے ان میں قانونی موشگافیاں پیدا کر کے الجھا دیے جائیں یہی وجہ تھی کہ مفتی محمود نے مسٹر بھٹو اور ان کی حکومت کے خلاف تمام صوبوں کا دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ بڑے جلسوں کا اہتمام کیا گیا چناں چہ مجھے خاص طور پر طلب کیا گیا کیوں کہ میں جمعیت علمائے اسلام پنجاب کا جنرل سیکرٹری تھا۔ طے ہوا کہ ہر کانفرنس میں مین تقریریں دو ہوں گی، مفتی صاحب کی اور دوسری میری، اس دورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھٹو مرحوم بوکھلا گئے، انھوں نے مفتی محمود سے کہا کہ دورہ ختم کر کے اسلام آباد آئیں اور بھٹو سے مذاکرات کر کے اپنے مطالبات منوائیں اور مجھے مظفر گڑھ کی ایک پرانی تقریر کی پاداش میں گرفتار کر کے مظفر گڑھ جیل بھجوا دیا گیا یوں انھوں نے اپنے دل کی تسکین کا سامان فراہم کیا اگر چہ مذاکرات سے فضا میں تلخی تو نہ رہی مگر دلوں میں غصے کے چنگاری سلگتی رہی، ان حالات کی وجہ سے بھی مفتی صاحب قبلہ اپنی من پسند اسلامی اصلاحات کا نفاذ سرحد میں ممکن نہ بنا سکے، ایک ذمہ

دار شخصیت کو کن مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا ادراک ایک کارکن یا نقاد یا دوسرے لیڈر کو نہیں ہو سکتا۔ سیاسیات کا طالب علم یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ برسر اقتدار رہ کر جماعتی منشور کا نفاذ جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے، برس ہا برس سے جما ہوا نظام آنکھ جھپکتے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں ہوتا۔ پرانے نظام کی پشت پر بیوروکریسی کی گرفت اس قدر مضبوط ہو چکی ہے کہ اس کو توڑنے کے لیے خود اپنے ہاتھ ٹوٹ جاتے ہیں یا زخمی ہو جاتے ہیں۔ مفتی محمود کو کچھ ایسے حالات ہی سے دوچار ہونا پڑا۔ چوں کہ مفتی محمود مضبوط اعصاب اور قوی دل و دماغ کے مالک تھے اس لیے نوکر شاہی کے تمام پیچ و خم ان کو پریشان تو ضرور کرتے رہے مگر شکست نہیں دے سکے۔ اور مفتی محمود نے وزارت اعلیٰ سرحد کے دوران نوکر شاہی اور شاطر سیاست دانوں کو باور کرا دیا کہ ایک عالم دین اپنی بصارت اور سوجھ بوجھ سے نظام مملکت چلا سکتا ہے۔

کہنہ مشق بیوروکریسی شاطر اور عیار سیاست دانوں پر مولانا مفتی محمود ایک وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عالم دین اور مفتی ہونے کے ناطے چھائے رہے۔ میں بے تکلفی سے مفتی صاحب سے کہا کرتا تھا کہ آپ کو لوگ سیاست دان یا وزیر اعلیٰ سے زیادہ مفتی صاحب کے نام سے پکارتے ہیں، اس کی یہی وجہ ہے کہ آپ کا اعزاز مفتی ہونے کی وجہ سے ہے وزیر اعلیٰ ہونے کی وجہ سے نہیں، مفتی کا اعزاز وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم کے اعزاز سے بھی اونچا اور بالا ہے۔ مفتی صاحب بھی اس بات کو سمجھتے تھے اور اس کا ادراک رکھتے تھے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر مفتی محمود کے راستے میں کانٹے نہ بچھائے جاتے اور آپ کو صوبہ سرحد میں کام کا پورا موقع دیا جاتا تو وہ سرحد کو اسلامی طرز زندگی کا مثالی صوبہ بنا دیتے جو پاکستان کے دوسرے صوبوں کے لیے نمونہ ہوتا۔

مفتی محمود نے اپنے صوبے کے مفلوک الحال عوام کی خوش حالی کے لیے بہت ہی مفید منصوبے بنائے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی بے پناہ خواہش رکھتے تھے۔ صوبے کے لیے نئی شاہراہیں پانی کی فراہمی، بجلی اور سوئی گیس کا نظام، اور پینے کا پانی،

زراعت اور صنعت کے شعبے میں ترقی کے اقدامات، ٹرانسپورٹ، رسل و رسائل، اور کئی عوامی مفادات کے پروگراموں کو سرانجام دینے کا عزم رکھتے تھے۔ مگر برا ہو سیاسی رقابتوں کا وزیر اعظم بھٹو سے لے کر صوبے کے جدی پشتی جاگیرداروں اور وڈیرے اور غاصب سیاست دانوں نے ملی بھگت سے مفتی صاحب کے راستے میں کانٹے بچھا دیئے، اور صوبہ سرحد کے اس عالم وزیر اعلیٰ کے راستے میں رکاوٹ بن کر نہیں بلکہ سازش کا پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے۔

اس تھوڑے سے وقت میں صوبہ سرحد کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے کیا اگر کوئی اور وزیر اعلیٰ ہوتا تو وہ دل برداشتہ ہو جاتا مگر مفتی محمود چوں کہ انگریز کی اولاد کی ریشہ دوانیوں سے واقف تھے اس لیے ان کی فطرت کا ادراک رکھنے کی وجہ سے ان سے شکست نہ کھائی اور ان کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔

سازشیوں نے بالآخر ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مولانا مفتی محمود نے سازشیوں کے سامنے ہتھیار پھینک کر سمجھوتہ کرنے کی بجائے وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا، مجھے یاد ہے کہ قومی پریس نے مولانا مفتی محمود کے استعفیٰ پر مفتی محمود کو زبر دست خراج تحسین پیش کیا۔ ان کے نزدیک یہ بات نہایت حیران کن تھی کہ ایک عالم دین نے کس طرح وزارت اعلیٰ کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔

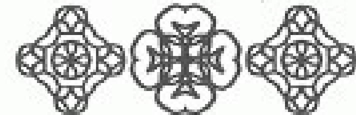
یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

مجھے اس وقت تو مفتی صاحب کا وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ عجیب سا لگا تھا۔ مگر ماضی حال کے سیاست دانوں کے منافقانہ رویوں سے یہی تجربہ ہوا کہ بدکردار سیاست دانوں کے ہاں سچائی اور ایفائے عہد نام کی کوئی اصطلاح ہے ہی نہیں، بقول آغا شورش کاشمیری

"بدقماش سیاست دان اور طوائف میں کوئی فرق نہیں وہ عصمت فروش ہے اور یہ ضمیر فروش ہے۔"

مفتی محمود نے جن اصولوں کی بنا پر وزارت اعلیٰ پر لات ماری تھی انھیں اس پر کوئی افسوس نہیں تھا مگر اصول سے بے زار نام کے ولی اس وقت بھی بے اصولی کی سیاست کر رہے تھے اور آج بھی بے اصول سیاست کا حصہ ہیں۔

چوں کہ مفتی محمود کے اسلامی نظریات اور خدمات کا تذکرہ ہو رہا ہے اس لیے میں یہ بات ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مفتی محمود کی سیاست بے دین سیاست نہیں تھی۔ ان کی سیاست پر دین غالب تھا وہ سیاست کرتے وقت سیاسی فیصلے کرتے وقت دینی مقاصد اور دینی تقاضوں کو اولیت دیتے تھے ان کی سیاست برائے دین تھی۔ سیاست برائے دنیا نہیں تھی ان کی پوری زندگی اسی بات کا نقشہ پیش کرتی ہے، آج ماضی کے حوالے سے جن علما کا نام احترام سے لیا جاتا ہے ان میں مفتی محمود کا نام بھی شامل ہے۔ یہ ان کی روشن ضمیری اور بلند کردار کی وجہ سے ہے، انھوں نے ہمیشہ اپنے پیش نظر دینی اصولوں کو رکھا۔ یہی بات انھیں سیاست دانوں میں ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتی ہے، یہ سوچ انھیں اپنے اکابر اور مولانا غلام غوث ہزاروی کی رفاقت سے حاصل ہوئی تھی، سیاست پر دین کی بالادستی قائم رکھنا جس قدر خوش نما جملہ ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اس وقت سیاست جس غلاظت کے قعر مذلت میں گر چکی ہے، اس سے بچنا کسی دل گردے اور صاحب عزیمت شخصیت کا ہی کام ہے جو ہر بونے قد کے بس کا روگ نہیں اس میں بڑے بڑے جغادری اور ہاتھی پھسل چکے ہے، مفتی محمود کے پیروکاروں پر مفتی محمود کے اس مشن کو زندہ رکھنا لازم اور واجب ہے، مفتی محمود کا دور وزارت اس نقطہ نظر سے نہایت آبرو مندانہ دور ہے کہ آپ نے اپنے دور میں اسلام اور سرحد کے عوام کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کردی تھیں۔



مقالاتِ مفتی محمودؒ سمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۷

مفتی محمودؒ۔ زعیمِ سیاست

مولانا محمد اکبر صاحب

جامعہ قاسم العلوم۔ ملتان

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۷)

''حضرت مفتی صاحب مرحوم نے علما اہل حق کا قابل تقلید نمونہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ علما منبر و محراب سے قیادت و سیادت تک بجا طور پر اہل ہیں۔ اور دینی اداروں کے سپوت جدید دنیا کی عیارانہ اور شاطرانہ مسموم فضا میں دیانت دارانہ سیاست کرنے کی پوری صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں۔''

حضرت مفتی صاحبؒ زمانہ طالبِ علمی سے ہی علمائے حق کے قافلہ کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں مصروف عمل رہے۔ اس دوران آپ نے سیاسیات کا وسیع مطالعہ کیا۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخابات ہوئے تو سیاسی صورت حال اور علاقائی نزاکتوں کو بھانپتے ہوئے یوپی (انڈیا) میں جمعیت علمائے ہند نے مسلم لیگ کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ ان دنوں مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کے مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا فخر الدینؒ سے درس حدیث کا شرف تلمذ حاصل کر رہے تھے۔ آپ نے اس الیکشن کے دوران شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنیؒ کے زیر نگرانی ایک رضا کار کی حیثیت سے بھرپور حصہ لیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی سیاسی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز ۱۹۴۲ء میں آزادی سے قبل جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے کیا جو ہندوستان میں علما کی ایک مؤثر اور محرک جماعت تھی۔

۱۹۴۲ء میں حضرت مفتی صاحب نے اپنے اکابر کے حکم پر مشہور تحریک ''ہندوستان چھوڑ دو'' میں حصہ لیا جو آخری متحدہ، سیاسی تحریک تھی۔ جس میں تقریباً پینتالیس ہزار مسلمان اور ہندو پابند سلاسل ہوئے۔ اسی تحریک کے نتیجہ میں حضرت مفتی صاحب جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے رکن اور آل انڈیا جمعیت علما کے کونسلر منتخب ہوئے۔ نیز آپ نے یہ اعزاز محض تیئس سال کی عمر میں حاصل کیا۔

مئی ۱۹۴۵ء میں جب یورپ کی جنگ ختم ہوگئی اور ہندوستان کی آزادی ناگزیر ہوگئی۔ تو نئے حکمران ٹولے نے ۱۹۴۶ء میں انتخابات کا اعلان کر دیا۔ چناں چہ اس

سلسلے میں حضرت مفتی صاحبؒ ۱۹۴۶ء میں سہارن پور کی تاریخی کانفرنس میں سرحد جمعیت کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنے اکابر کے ساتھ اس الیکشن میں بھرپور حصہ لیا۔

حضرت مفتی صاحب میدان سیاست کے ایسے شاہ سوار تھے جو فرنگی سیاست کو بخوبی جانتے تھے وہ اس کے ہر وار کو بڑی خوب صورتی اور اپنی مدبرانہ حکمت عملی کی ڈھال کے ساتھ روکتے اور لطیف مسکراہٹ کے ساتھ اس کو ایک نوکیلا سا نشتر مارتے، انھوں نے اپنی سیاسی روش کو پرتکلف بنانے کی بجائے عوامی بنادیا تھا۔ وہ عمومی اور بین الاقوامی سیاسیات میں ذی اثر خصوصیات کے حامل تھے۔ سیاسی معاملات میں ان کی ایک نکھری ہوئی رائے ہوتی تھی۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ مذہب اور دینی معاملات میں نہایت پختہ اور متصلب تھے، ان کے ہاں کچھ ضابطے اور حدود مقرر تھے جن پر سختی سے کاربند رہتے۔

حضرت مفتی صاحب نے ساری زندگی پاکستان کے نظریاتی تحفظ کی جنگ لڑی۔ قومی اقدار کے فروغ، جمہوریت، جمہوری اداروں کی نشو و نما اور اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے لیے نہایت محدود اختیارات کے باوجود جس جرأت، عزم و استقلال اور قوت وفراست سے پیش قدمی کی وہ آپ کے سیاسی شعور اور سیاسی بالغ نظری کا نتیجہ تھی۔ ان کی شخصیت میں توازن، متانت اور کردار کی پختگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

عزم وعمل کے اس پہاڑ کے سامنے اہل علم وفضل اپنا سر جھکانا، فخر کا باعث سمجھتے تھے۔ وہ وقت کے ان علما اور محققین کے سرخیل تھے۔ جن کی علمی اور سیاسی خدمات پر عالم اسلام فخر کرتا تھا۔ علم ودانش کے اس بحر بیکراں کا علمی اور سیاسی مقام وقت کے علما اور سیاست دانوں کے لیے قابل رشک تھا۔ اس معجزہ نما شخصیت نے علما کو سیاست کے رموز بتائے۔ مسند تدریس سے کئی جماعتوں کو اپنی قیادت سے نوازا۔ ان کا طرز سیاست حضرت مدنیؒ کی طرح معتدل تھا۔ مفتی صاحب کی ساری زندگی کی مساعی جمیلہ میں

دین اور سیاست، ہم سفر اور قدم بقدم رہے۔ وہ ایک حق پرست سیاست دان اور عارفانہ رنگ لیے ہوئے تھے۔ دین کے بغیر سیاست کو چنگیزیت تصور کرتے تھے۔ آپ نے بحر سیاست میں اپنی کشتی کی تختہ بندی کرلی تھی مگر اپنے بے داغ سیاسی کردار کو آلودہ نہیں ہونے دیا جو ایک عبقری (Genious) شخصیت کی خصوصیات میں سے ہے۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم نے علما اہل حق کا قابل تقلید نمونہ پیش کرکے یہ ثابت کردیا کہ علما منبر ومحراب سے قیادت وسیادت تک بجا طور پر اہل ہیں۔ اور دینی اداروں کے سپوت جدید دنیا کی عیارانہ اور شاطرانہ مسموم فضا میں دیانت دارانہ سیاست کرنے کی پوری صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان سیاسی احوال سے کبھی گٹھ جوڑ نہیں کیا جو دین کی خفت کا باعث بنتے تھے۔ انھوں نے سیاست کو کاروبار نہیں بنایا۔ ہمیشہ غیر متزلزل ایمان کے مالک رہے۔ انھوں نے سیاسی قوت فکر کے دائرے میں رہ کر کائنات کی وسعتوں کو سمیٹا ارباب اقتدار کی معاندانہ پالیسیوں، حالات کے مدو جزر اور ملکی محاذ آرائی کے باوجود مفتی صاحبؒ نے جس طرح سیاسی اتحادوں کو پروان چڑھایا اس کی مثال پاکستان کی سیاسی تاریخ میں نہیں ملتی۔

حضرت مفتی صاحب کا تعلق اگرچہ مسلمانوں کے ایک خاص مکتب فکر سے تھا لیکن ان میں فرقہ وارانہ تعصب کی بات قطعاً نہ تھی۔ اس کی واضح مثال ۱۹۷۷ء کی تحریک ہے۔ جس کے آپ سربراہ تھے۔ چشم فلک نے پہلی بار یہ منظر دیکھا کہ تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے لیڈروں نے ایک عالم دین کی قیادت میں متحد ہوکر حکومت وقت کی آمریت کو للکارا، یہ گویا ان کی شخصی عظمت کا اعتراف تھا۔ حضرت مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ آپ دیوبند اور بریلی تو ہندوستان میں رہ گئے ہیں موجودہ وقت میں ہمیں پاکستانی کی حیثیت سے رہنا چاہیے۔

جمعیت علمائے اسلام کا احیا:

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ماضی کے تجربات اور

مسلسل غور وفکر کے نتیجہ میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ نظام جماعت اور امارت شرعیہ کے بغیر کوئی پیچیدگی اور الجھن دور نہیں ہو سکتی۔ مقاصد اور مصالح انقلاب کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سب لوگ نظام شریعت کے مطابق ایک امیر اور قائد کی اطاعت پر مجتمع نہیں ہو جاتے جس کے متعلق ارشاد ربانی وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم علیکم بالجماعۃ والسمع والطاعۃ ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد خصوصاً ''قرارداد لاہور'' کی منظوری کے بعد ملکی سیاست سے اسلام اور علمائے حقانی کو جس طرح باہر کرنے کی کوشش کی گئی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ایسی تلاطم خیز موجوں میں ڈولتی ہوئی کشتی کو سنبھالنا ناخدا کے لیے ایک کڑی آزمائش ہوتی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے جمعیت علمائے اسلام کے احیا کی کوشش کی مگر سیاسی اختلافات کی وجہ سے ان کی مساعی ثمر آور نہ ہو سکیں۔

کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۲ء میں جب حضرت مفتی صاحب کو جامعہ قاسم العلوم ملتان میں تقریباً دو سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ ان دنوں مولانا احتشام الحق تھانویؒ کراچی سے ملتان تشریف لائے انھوں نے جامعہ خیر المدارس ملتان کے ایک اجلاس میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ جمعیت علمائے اسلام کا از سر نو احیا ہونا چاہیے اور اسے متحرک و فعال بنانا چاہیے۔

حضرت مفتی صاحب نے ملک بھر کا دورہ کیا اور خصوصاً صوبہ سرحد کے مختلف دور دراز اور دشوار گذار علاقوں میں بنفس نفیس پہنچ کر علما کو آیندہ منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کی دعوت و ترغیب دی۔ چناں چہ حضرت مفتی صاحب کی کوششیں رنگ لائیں اور پاکستان کے چاروں صوبوں سے جید اور فرض شناس علما کا ایک بڑا نمائندہ اجلاس ہوا۔ جس میں حضرت مفتی صاحب نے اپنی سیاسی بصیرت اور عاقبت اندیشی سے جمعیت کی صدارت کے لیے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور نظامت اعلیٰ کے لیے مولانا احتشام الحق تھانویؒ کا نام تجویز کیا چناں چہ ہاؤس نے

اس کی توثیق وتصویب کر دی۔ حضرت مفتی صاحب کی ان قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت ہی جمعیت علمائے اسلام ترقی کے شاہراہ پر منازل طے کرتی رہی، یہی وجہ ہے کہ ملک میں ابھرنے والی مختلف تحریکوں میں جمعیت علمائے اسلام کا کردار اور رول کوئی منصف مزاج مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جس کا گواہ ان کا وہ عہد زریں ہے جو پارلیمنٹ کے رکن بننے سے لے کر صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ تک تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ اپنی خودداری پر کوئی حرف آنے دیا۔ انھوں نے ان اصولوں کی پاس داری کرتے ہوئے وزارت اعلیٰ کے منصب کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر قرآنی دستور کی پاس بانی، مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی اور جمہوری اداروں کی برتری کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے بلند سیاسی شعور و آگہی کا ثبوت دیا اور نہایت مؤثر طریقے سے اسلام اور عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے قرون اولیٰ کا عملی نمونہ پیش کیا۔

۱۹۵۶ء میں جب دوبارہ جمعیت علمائے اسلام کے انتخابات ہوئے تو حضرت شیخ التفسیر لاہوریؒ دوبارہ منصب صدارت پر فائز ہوئے جو شیخ الہند مولانا محمودؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی جدوجہد اور روحانی فیوض و برکات کے حقیقی وارث تھے۔ اور جنھوں نے ارض لاہور میں قرآن کی انقلابی دعوت کے شجرہ طیبہ کی تخم ریزی اور آب یاری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ حضرت لاہوریؒ نے مفتی صاحب کو کل پاکستان جمعیت علمائے اسلام کا نائب صدر مقرر کیا۔ حضرت شیخ التفسیرؒ نے اپنی پیرانہ سالی اور مفتی صاحب کی ذات گرامی پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے عملاً جمعیت علمائے اسلام کی صدارت ان کے سپرد کر دی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ حضرت مفتی صاحب کو دینی حلقوں میں زبردست اعتماد حاصل تھا۔ ان کی سیاسی بصیرت اور دینی فراست کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تجاویز جمعیت علمائے اسلام میں مرکزی اور کلیدی اہمیت کی حامل ہوتی تھیں۔

عوام کا وہ طبقہ جس پر ابتدا ہی سے علما کے گہرے اثرات تھے اور وہ قومی سطح پر علما

کے طریق کار سے اتفاق رکھتے تھے اس نے سیاسی میدان میں علمائے کرام کو نہ پا کر سیاست سے عملاً کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، جمعیت علمائے اسلام کے احیا سے اس طبقہ کی مساعی سامنے آئیں اور حضرت مفتی صاحب کی جرأت مندانہ قیادت میں اس حکومتِ وقت کو للکارا، اس عوامی پذیرائی اور مفتی صاحب کی مؤثر سیاسی پالیسیوں کی بدولت جمعیت علمائے اسلام ایک مضبوط سیاسی پارٹی اور تحریک کی شکل میں اُبھر کر سامنے آئی۔

تحریک ختم نبوت:

۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کے دورِ حکومت میں جب پاکستان کو بلقانی ریاستوں کی طرز پر تقسیم کرنے کی سازشیں کھلے عام منظر پر آنے لگیں اور بلوچستان کو قادیان بنانے کی خفیہ ناپاک کوششیں ہونے لگیں، کھلے عام مرزائیت کا پرچار ہونے لگا حتیٰ کہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی مرزائیت کے خلاف لکھی گئی کتاب ''الشہاب الثاقب'' ضبط کر لی گئی تو اس بگڑتی ہوئی صورت حال میں مکافاتِ عمل کے طور پر قادیانیوں کے خلاف ملک بھر میں ایک غضب ناک عوامی تحریک نے سر اٹھایا۔ بعد میں اس تحریک نے ''تحفظ عقیدۂ ختم نبوت'' کا عنوان اختیار کر لیا۔ اس تحریک میں ہزاروں مسلمانوں نے عقیدۂ ختم نبوت کے مقدس شجر کی اپنی خون سے آب یاری کی۔ سینکڑوں علمائے کرام کو گرفتار کیا گیا حتیٰ کہ بعض حضرات کو پھانسی کی سزا سنائی گئی جو بعد میں معاف کر دی گئی۔ حضرت مفتی صاحب نے اس تحریک میں ختم نبوت کے شیدائیوں کا بھرپور ساتھ دیا اور اس تحریک کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا اور قادیانیت پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر اسے سر اٹھانے کی کی جرأت نہیں ہوئی جس کی پاداش میں آپ ملتان کے ڈسٹرکٹ جیل میں ایک سال تک محبوس رہے یہ آپ کی پہلی نظر بندی تھی۔

۱۹۵۶ء کے آئین پر مفتی صاحب کی تنقیدی رپورٹ:

یہ آئین گورنر جنرل غلام محمد کی قائم کردہ دستور ساز اسمبلی کے ذریعے سکندر مرزا نے نافذ کیا تھا گذشتہ آٹھ سال کے بعد یہ پہلا آئین تھا جو نافذ ہوا تھا لیکن بدقسمتی سے اسے یورپین ممالک کے دساتیر کا چربہ بنا دیا گیا تھا جس کے ذریعے افسر شاہی نے پاکستان پر اپنا ناجائز تسلط قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس آئین میں اسلام کا ذکر بطور دیباچہ کے کیا گیا تھا۔ جس سے مقصد ارباب اقتدار کا اسلام کے نام پر غیر اسلامی قوانین نافذ کرنے تھے، اس نازک صورت حال کو بھانپتے ہوئے جمعیت علمائے اسلام نے اس آئین کی غیر اسلامی دفعات کی نشان دہی اور ان میں اسلامی اصولوں کے مطابق ترمیمات کرنے کے لیے حضرت مفتی صاحب کی قیادت میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں مولانا شمس الحق افغانیؒ اور علامہ خالد محمود شامل تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے آئین کا بغور و فکر جائزہ لینے کے بعد اس پر تنقیدات و ترمیمات کی ایک بہترین جامع رپورٹ لکھی اور تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ''مسلمانوں کو ۱۹۵۶ء کے اس آئین کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کیوں کہ اس آئین میں اسلام کو بطور تمہید ذکر کیا گیا ہے جو قانوناً دستور کا حصہ نہیں بنتا۔''

حضرت مفتی صاحب نے حکومت کی اس غیر اسلامی روش کو بے نقاب کیا۔ حضرت مفتی صاحب کے پیش کردہ ان ترمیمات کو عوامی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی۔

عائلی قوانین:

۱۹۵۶ء میں حکومت کے تشکیل کردہ کمیشن نے ایک مسودہ ''تحفظ حقوق نسواں'' کے نام سے تیار کیا۔ لیکن کمیشن کے افراد کے باہمی اختلاف سے وہ مسودہ معرض التوا میں پڑ گیا۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کی فوجی حکومت نے اس مسودہ کے کچھ مندرجات

آرڈیننس کے ذریعے نافذ کر دیے جو نہ صرف خلاف اسلام تھے بلکہ خلاف عقل بھی تھے۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا "کہ اگر کسی لڑکی یا لڑکے کا اپنے والد سے پہلے انتقال ہو جائے تو اس کو باپ کی وراثت میں اُسی قدر حصے دار تصور کیا جائے گا جو انھیں زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔" اور یوں ایک مردہ شخص کو بطور مفروضہ زندہ تصور کر کے وارث بنا کر اسلامی وراثت کا سرے سے مفہوم ہی بدل دیا گیا۔ چناں چہ حضرت مفتی صاحب نے قومی اسمبلی میں نافذ ہونے والے ان عائلی قوانین کے خلاف مجاہدانہ صدا بلند کی اور جس مدبرانہ اور عالمانہ انداز میں قرآن و سنت اور مذاہب خمسہ کے ذریعے ان قوانین کی دھجیاں بکھیریں اس سے ان قوانین کے ارباب بست و کشاد ورطۂ حیرت میں پڑ گئے۔

حضرت مفتی صاحب ایوان اسمبلی میں:

علمائے حق کے اس نمائندہ نے اسلام کے کاز کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ اگر چہ ایوان کے نزدیک مولوی سماج کا ایک حقیر عنصر ہے لیکن وہ ملکی معاملات چلانے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب ان بے دین طاقتوں کو جو پارلیمنٹ کے اندر الحاد و بے دینی کی علم بردار تھیں، للکارتے ہو[illegible] کرتے تھے:

"اسمبلی کے اندر میری موجودگی میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے خلاف کوئی کارروائی، کوئی قانون سازی مکمل نہیں ہو سکے گی۔ میں حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبے سے راہ نمائی حاصل کرتا ہوں۔ جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ "اینقص دین اللہ و انا حیی۔"

ایوان کے بڑے بڑے پرانے پارلیمنٹرین ان کے مؤثر وزنی دلائل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

۱۹۶۲ء کا الیکشن:

۱۹۶۲ء میں جب فوجی آمر ایوب خان نے کمال عیاری سے بی ڈی سسٹم کے ذریعے ملک پر آمریت مسلط کرنے کی کوشش کی اور ۲۱/ اپریل ۱۹۶۲ء کو انتخابات کا اعلان کیا تو حضرت مفتی صاحب نے سیاسی جماعتوں پر پابندی کی وجہ سے انفرادی طور پر اس الیکشن میں حصہ لیا۔ اور ڈیرہ اسماعیل خان کی اس سیٹ پر پہلی مرتبہ بھاری اکثریت سے ایم این اے منتخب ہوئے۔ مخالف امیدواروں میں صرف ایک امیدوار نواب زادہ فتح اللہ خان اپنی ضمانت بچانے میں کام یاب ہوئے۔ آپ کی اس شان دار کام یابی پر ملک کے سیاسی شاطر دم بخود ہو کر رہ گئے اور سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کام یابی کے بعد جب اسمبلی میں حلف لینے کی رسم ادا کی گئی تو حضرت مفتی صاحب نے حلف کے ان الفاظ کہ "دستور کو باقی رکھوں گا" کے متعلق واشگاف الفاظ میں فرمایا:

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دستور کو جوں کا توں باقی رہنے دیں گے بلکہ اس دستور کے دیے ہوئے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے ان جملہ خرابیوں اور خامیوں کی جو قرآن و سنت سے متصادم ہوں گی، ان میں ترمیم و تنسیخ کریں گے۔"

مرد مجاہد کے یہ سنہری الفاظ اسمبلی کے ریکارڈ میں شامل کیے گئے۔

۱۹۶۵ء کا الیکشن:

۱۹۶۵ء کے الیکشن میں بھی حضرت مفتی صاحب نے بھرپور حصہ لیا مگر آپ کا فولادی حلقہ حکومت کی چیرہ دستیوں اور معاندانہ رویے سے محفوظ نہ رہ سکا، بقول حضرت مفتی صاحب کہ ہم جہاں بھی جاتے وہاں ہم سے پہلے پولیس موجود ہوتی تھی اور یوں وہ یہ الیکشن ہار گئے لیکن دراصل یہ حضرت مفتی صاحب کی جیت تھی کیوں کہ اس الیکشن کے نتیجے میں حکومت کے خلاف جو اشتعال انگیز نفرت پیدا ہو گئی تھی وہ

بالآخر اس کے خاتمہ پر منتج ہوئی۔

۱۹۷۰ء کا الیکشن:

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے عہد سیاست کا تیسرا اور آخری یادگار انتخابی معرکہ یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف لڑا اور اس چیز نے الیکشن کو دلچسپ بنادیا تھا۔ ہزاروں رکاوٹوں، بے سروسامانی اور الزامات و اتہامات کے باوجود دیوبند کے اس قابل فخر سپوت نے مسٹر بھٹو کو تیرہ ہزار ووٹوں سے شکست فاش دے کر ناکوں چنے چبوادیے جب کہ بھٹو صاحب ملک کے پانچ دیگر حلقوں سے بڑی بھاری اکثریت سے منتخب ہوگئے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک ایسے شخص کو شکست سے دوچار کیا، جو روٹی کپڑا مکان کا دل فریب نعرہ لگا کر ''قائد عوام'' بن گیا تھا، حضرت مفتی صاحب نے بھٹو کی پُرفریب پالیسی کا پردہ اس وقت چاک کردیا جب انھوں نے آئین پاکستان کی تیاری کے دوران مسٹر بھٹو سے برسر اجلاس کہا کہ:

''روٹی کپڑا مکان تو ہر شہری کا بنیادی حق ہے جسے حکومت مہیا کرنے کی پابند ہے اگر کسی فرد کو حکومت یہ سہولتیں فراہم نہ کرے تو وہ عدالت سے اپنا یہ حق وصول کرنے کا مجاز ہوگا۔''

اس پر مسٹر بھٹو بوکھلا کر کہنے لگا:

''ہم ان چیزوں کے مہیا کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتے کیوں کہ آج کل ملک کی معاشی اور اقتصادی حالت اتنی اچھی نہیں۔''

مفتی صاحب نے فرمایا اس کے لیے آپ ایک سال کی مدت لے لیں اور آئین میں یہ لکھ دیں کہ یہ شق ایک سال بعد نافذ ہوگی۔ بھٹو صاحب کہنے لگے اس تھوڑے سے عرصے میں یہ ضرورتیں کہاں پوری ہوسکتی ہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے جواباً پانچ برس کی مدت بتائی مگر وہ ٹالتا رہا حتی کہ حضرت مفتی صاحب نے بیس برس کی پیش کش کی لیکن وہ اس پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی مسٹر بھٹو سے اکثر

سیاسی نوک جھونک رہتی تھی۔ ایک دن دوران گفتگو بھٹو حضرت مفتی صاحبؒ کو کہنے لگا کیا آپ نے ہٹلر کی آپ بیتی پڑھی ہے؟ حضرت مفتی صاحب نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر بھٹو صاحب کہنے لگے میں نے اس کو بیس مرتبہ پڑھا ہے، حضرت مفتی صاحب نے اس کو ہٹلر کے عبرت ناک انجام سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا ''اے کاش! آپ ایک دفعہ اس کا انجام پڑھ لیتے۔''

حضرت مفتی صاحب کی جرأت مندانہ قیادت کا اثر جہاں جہاں پہنچا، اعتراف وتسلیم کی شکل اختیار کرگیا، ان کی سیاسی شخصیت نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے سرمایہ ناز تھی۔ قومی اتحاد کے بتیس مطالبات میں اکتیس مطالبات مسٹر بھٹو سے مذاکرات کی میز پر منوا کر اس مرد قلندر نے اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا۔ جسے کوئی منصف مزاج مؤرخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔

وزارت اعلیٰ:

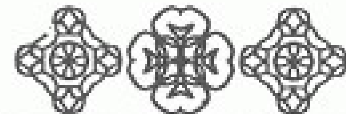
حضرت مفتی صاحب نے یکم مئی ۱۹۷۲ء کو صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کا قلم دان سنبھالا، پاکستان کی پارلیمانی تاریخ میں یہ پہلا اور انوکھا تجربہ تھا کہ اقتدار کی باگ ڈور ایک ایسے عارف باللہ کے ہاتھوں میں آئی جس نے ساری زندگی چٹائی پر بیٹھ کر قال اللہ وقال الرسول کی صدا بلند کی تھی۔ آپ نے نو ماہ کی قلیل مدت میں جو دینی اور سیاسی کارہائے نمایاں سرانجام دیے مخالفین بھی اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ اور روشن خیال طبقے کو پہلی بار معلوم ہوا کہ اسلام میں غسل وطہارت کے علاوہ ایک بہترین جامع مربوط سیاسی نظام بھی موجود ہے۔ اس درویش وزیر اعلیٰ نے اسلاف کا قابل تقلید نمونہ پیش کرکے یہ ثابت کردیا کہ مسجدوں اور خانقاہوں میں رہنے والے بوریا نشین حکومت وقیادت سنبھالنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ انھوں نے یہ بات عملاً ثابت کردی کہ کام یاب سیاست کے لیے فریب اور جھوٹ کی ضرورت نہیں اور یہی چیز سیاست کی روح ہے۔

حضرت مفتی صاحب کی عظمت کی یہ بڑی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنے سیاسی نظریات کی کبھی تاویل نہیں فرمائی۔ کسی سابقہ فیصلے پر پچھتاوا نہیں ہوا بلکہ جو کہا علی الاعلان کہا۔

جمہوریت:

۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو ایک جلسہ عام میں جمہوریت کے بارے میں جمعیت علمائے اسلام کا مؤقف واضح کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم مطلق آزاد جمہوریت کے قائل نہیں بلکہ محدود جمہوریت کے قائل ہیں۔ جو جمہوریت اس وقت رائج ہے اس میں اکثریت کا فیصلہ قانون بن جاتا ہے چاہے وہ قرآن وسنت کے ساتھ متصادم کیوں نہ ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ دنیا کے سارے جمہوری ملک اور اربوں عوام مل جائیں اور خدائی قوانین کے خلاف فیصلہ کریں تو وہ غلط تصور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے راہ نما اصول متعین فرمادیے ہیں۔ اور ہر زمانے میں جزئیات طے کرنے کا اختیار اور فیصلہ انسانوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا۔ لہٰذا ان جزئیات کے متعلق فیصلوں میں ہم جمہوریت کے قائل ہیں لیکن اگر ایوان اسمبلی میں کوئی فیصلہ قرآن وسنت کے خلاف کیا گیا تو ہم اس کی بھرپور مزاحمت کریں گے۔"



مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۸

مفتی محمودؒ، ایک مثالی قائد

حافظ فاروق احمد
ایم اے۔ بی ایڈ
اکوڑہ خٹک۔ ضلع نوشہرہ

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۸)

"سیاست میں لہجوں کا بدلنا ایک معمول بن گیا ہے، مگر ان کا لہجہ نہایت شستہ، زبان ستھری، گفتگو بے لاگ اور مدلل ہوتی تھی۔

اپنے بدترین مخالفوں کا نام بھی نہایت احترام سے لیتے تھے۔

اسی لیے ہر طبقے میں بھی ان کا نام پورے احترام سے لیا جاتا تھا۔ آپ کی سیاسی و غیر سیاسی گفتگو نہایت شائستہ ہوتی مفتی صاحب کی جماعتی عظمت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کے سچے پیروکار تھے اور ان کے پیروکاران بزرگوں کا نعم البدل آپ ہی کو سمجھتے تھے، وہ تو اپنے بڑوں کے جاں نشین بننے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن ان کا نعم البدل مشکل سے ہی پیدا ہوگا۔"

۱۹۱۹ء کو پیر کی رات خلیفہ محمد صدیق کے ہاں پیدا ہونے والے فرزند کا نام محمود ہے۔ آپ کی پیدائش پنیالہ میں ہوئی۔ وہ پنیالہ جو سطح سمندر سے تین ہزار فٹ بلند ہے، سامنے شیخ بدین کے پہاڑ اور پشت پر کوہ سرخ ہے۔

بحیثیت سیاست دان مفتی صاحب نہایت عظیم انسان تھے۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت ہر کسی پر عیاں اور طشت از بام ہے۔ آپ کی گہرائی، سنجیدگی اولوالعزمی اور بے جگری کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مفتی صاحب آسمان علم و سیاست کے مہ کامل تھے۔ دور دور تک ان کی سیاست اور علمیت کی روشنیاں بکھری اور پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر سیاست دان آپ سے متاثر تھا۔ یہاں تک کہ بھٹو مرحوم نے بھی آپ کی سیاست کی عظمت کی گواہی دی۔

اپریل ۱۹۶۲ء کا زمانہ تھا۔ اس میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم نے بی ڈی سسٹم کے تحت قومی اسمبلی کے پہلے انتخابات کا اعلان کیا۔ تو مفتی صاحب جمعیت کی جانب سے انفرادی حیثیت سے کھڑے ہوگئے۔ اس سے پہلے آپ نے باقاعدہ خانقاہ سراجیہ کندیاں سے مشورہ بھی کیا۔ اس کے بعد مخالفت کا آغاز ہوا۔ سامنے قانون دان بھی تھے۔ وکیل بھی تھے، نواب اور وڈیرے بھی تھے، پولنگ کا دن آیا، تو آپ کو دھڑا دھڑ ووٹ ملے۔ نتیجہ کا اعلان ہوا۔ تو آپ ڈیرہ اسماعیل خان میں تھے چناں چہ بڑی اکثریت سے کامیابی ملی۔ اکثر مخالفین کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں۔

صرف ایک مخالف امیدوار نواب زادہ فتح اللہ اپنی ضمانت بچانے میں کامیاب ہوا۔

۱۹۶۲ء کے الیکشن کے بعد کامیابی کے ملنے پر پورے پاکستان میں آپ کا نام

(۸)

”سیاست میں لہجوں کا بدلنا ایک معمول بن گیا ہے، مگر ان کا لہجہ نہایت شستہ، زبان ستھری، گفتگو بے لاگ اور مدلل ہوتی تھی۔

اپنے بدترین مخالفوں کا نام بھی نہایت احترام سے لیتے تھے۔ اسی لیے ہر طبقے میں بھی ان کا نام پورے احترام سے لیا جاتا تھا۔ آپ کی سیاسی وغیر سیاسی گفتگو نہایت شائستہ ہوتی مفتی صاحب کی جماعتی عظمت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کے سچے پیروکار تھے اور ان کے پیروکاران بزرگوں کا نعم البدل آپ ہی کو سمجھتے تھے، وہ تو اپنے بڑوں کے جانشین بننے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان کا نعم البدل مشکل سے ہی پیدا ہوگا۔“

۱۹۱۹ء کو پیر کی رات خلیفہ محمد صدیق کے ہاں پیدا ہونے والے فرزند کا نام محمود ہے۔ آپ کی پیدائش پنیالہ میں ہوئی۔ وہ پنیالہ جو سطح سمندر سے تین ہزار فٹ بلند ہے، سامنے شیخ بدین کے پہاڑ اور پشت پر کوہ سرخ ہے۔

بحیثیت سیاست دان مفتی صاحب نہایت عظیم انسان تھے۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت ہر کسی پر عیاں اور طشت از بام ہے۔ آپ کی گہرائی، سنجیدگی اولوالعزمی اور بے جگری کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مفتی صاحب آسمان علم وسیاست کے مہ کامل تھے۔ دور دور تک ان کی سیاست اور علمیت کی روشنیاں بکھری اور پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر سیاست دان آپ سے متاثر تھا۔ یہاں تک کہ بھٹو مرحوم نے بھی آپ کی سیاست کی عظمت کی گواہی دی۔

اپریل ۱۹۶۲ء کا زمانہ تھا۔ اس میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم نے بی ڈی سسٹم کے تحت قومی اسمبلی کے پہلے انتخابات کا اعلان کیا۔ تو مفتی صاحب جمعیت کی جانب سے انفرادی حیثیت سے کھڑے ہو گئے۔ اس سے پہلے آپ نے باقاعدہ خانقاہ سراجیہ کندیاں سے مشورہ بھی کیا۔ اس کے بعد مخالفت کا آغاز ہوا۔ سامنے قانون دان بھی تھے۔ وکیل بھی تھے، نواب اور وڈیرے بھی تھے، پولنگ کا دن آیا، تو آپ کو دھڑا دھڑ ووٹ ملے۔ نتیجہ کا اعلان ہوا۔ تو آپ ڈیرہ اسماعیل خان میں تھے چناں چہ بڑی اکثریت سے کامیابی ملی۔ اکثر مخالفین کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

صرف ایک مخالف امیدوار نواب زادہ فتح اللہ اپنی ضمانت بچانے میں کامیاب ہوا۔

۱۹۶۲ء کے الیکشن کے بعد کام یابی کے ملنے پر پورے پاکستان میں آپ کا نام

گرامی مشہور ہوا۔اس سے قبل صرف حلقہ جمعیت آپ سے واقف تھا۔تصویر کو بھی بہت کم لوگ جانتے تھے،قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد جانے لگے تو ملتان کے ریلوے اسٹیشن پر بڑی دل چسپ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔گاڑی میں ان کی سیٹ ریزرو تھی، لیکن جب ساتھیوں سمیت وہاں ڈبے میں داخل ہونے لگے تو ایک سپاہی نے رک کر کہا کہ یہ قومی اسمبلی کے ممبر کے لیے ریزرو ہے۔لہٰذا آپ دوسرے ڈبے کا رخ کریں یعنی آپ کا لباس اتنا سادہ اور عام سا تھا کہ سپاہی کو بھی آپ کے بارے میں صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔

قومی اسمبلی میں پہلا مقابلہ حلف وفاداری کے موقع پر ایوب خان مرحوم سے ہوا۔آپ نے غیر اسلامی، غیر جمہوری اور آمرانہ دستور کے خلاف بغاوت کا نعرہ بلند کیا،حلف نامے میں مندرج تھا۔

"دستور کو باقی رکھیں گے۔"

مولانا مفتی محمود صاحب نے اس کے آخر میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم محض تابع دار رہیں گے، بلکہ دستور کے دیے ہوئے اختیارات کو بروئے کار لا کر ان جملہ خرابیوں اور خامیوں کی جو کتاب وسنت یا جمہوری لحاظ سے اس میں ہوں گی ان میں ترمیم وتنسیخ کریں گے۔چناں چہ ان الفاظ کا حلف کی کارروائی میں باقاعدہ اندراج ہوا۔

مفتی محمود صاحب نے قانون ساز اسمبلی میں آزاد خارجہ پالیسی اور بجٹ پر یادگار تقریریں کیں، ان دنوں عائلی قوانین کا بڑا غلغلہ تھا۔مولانا مفتی محمود نے اس مسئلے پر زوردار معرکہ لڑا۔آپ نے اسمبلی میں اس آرڈیننس کو آڑے ہاتھوں لیا ایک تقریر بھی فرمائی جو ایک گھنٹہ دس منٹ تک جاری رہی۔

۱۹۶۵ء میں جب دوبارہ قومی اسمبلی کے انتخابات کا وقت آیا۔تو مولانا کو ناکام بنانے کے لیے خاص ہدایات جاری کر دی گئیں۔مفتی صاحب جہاں بھی ووٹ مانگنے جاتے وہاں پولیس پہلے سے موجود ہوتی تھی۔حلقہ کے بی ڈی ممبران کو تھانہ بلا کر

دھمکایا جاتا تھا اس کے باوجود مولانا مفتی محمود مرحوم نے الیکشن میں حصہ لیا۔بظاہر ناکامی ہوئی۔مگر یہ ایک بڑی کامیابی کا پیش خیمہ تھی۔

۱۹۶۸ء میں ایوبی حکومت دس سالہ جشن منانے کی فکر میں تھی۔چناں چہ ۳،۴،۵رمئی ۱۹۶۸ء کو لاہور کی تاریخی جلسہ گاہ میں عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی۔مشرقی اور مغربی پاکستان کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے تقریباً ۵ ہزار علما اور نمائندوں نے شرکت کی۔اس موقعہ پر انتخابات میں مفتی محمود صاحب پارٹی کے سیکرٹری جنرل مقرر کیے گئے۔

وقت گزرتا گیا، ملکی حالات نے کئی کروٹیں بدلیں، تا آنکہ مرحوم ایوب خان رخصت ہوئے، اور ان کی جگہ صدر یحییٰ خان نے لے لی۔صدر یحییٰ خان نے یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو عام انتخابی سرگرمیوں کی اجازت دی۔تو سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر میدان میں اتر آئے۔پاکستان کی ۲۳ سالہ تاریخ میں پہلے عام انتخابات ہو رہے تھے۔مفتی صاحب اپنے آبائی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان سے قومی اسمبلی کے لیے کھڑے ہو گئے، ان کے مقابلے میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے بھی یہاں سے کاغذات نامزدگی داخل کیے۔وہ بیک وقت چھ سیٹوں پر الیکشن لڑ رہے تھے۔۱۹۷۰ء میں ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک بڑے جلسۂ عام کا انتظام کیا گیا۔تقریر مفتی صاحب کی تھی، جب کہ اس سے پہلے بھٹو مرحوم تقریر کر چکے تھے۔مخالفین نے ایوب کی حمایت کے واقعے کو ہوا دی، لیکن بالآخر کامیابی ہوئی۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر مغربی پاکستان روٹی کپڑے اور مکان کی ایک زبردست لہر کی زد میں تھا۔ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے کے لیے لوگ سامنے آئے۔مگر ناکام ہوئے، لیکن پورے ملک میں صرف مفتی صاحب کی سیٹ ایسی تھی، جہاں پر مفتی محمود صاحب کو کامیابی ہوئی، ۱۳ ہزار ووٹوں سے فتح حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔یہاں تک کہ صدر یحییٰ نے کہا کہ ملک میں اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے مفتی صاحب کی کامیابی ضروری تھی۔۳۰۰ سیٹوں میں ۱۵۱ سیٹیں شیخ مجیب نے حاصل

کی تھیں، سیلاب کے باعث ۹ سیٹوں پر انتخاب ہونا باقی تھا۔ طاقت کا مرکز نہایت فیصلہ کن انداز میں اسلام آباد سے ڈھاکہ منتقل ہونے لگا۔ چناں چہ ایک ہنگامہ پھیلتا گیا، اور پھر مولانا مفتی محمود صاحب نے ساتھیوں سے مل کر حالات کے سنبھالنے میں نہایت بے مثال کردار ادا کیا۔

۳۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مسٹر بھٹو نے یحییٰ کی جگہ سنبھالی۔ اور قوم کو نئے پاکستان کی تعمیر کے لیے پکارا، آئینی طور پر یہاں تین جماعتیں ملکی سطح پر سیاسی وارث تھیں۔ پنجاب، سندھ میں بھٹو مرحوم تھے۔ سرحد اور بلوچستان میں نیپ (National Awami Party) اور جمعیت متوقع حکمران جماعتیں تھیں۔ بھٹو مرحوم نے ان کے خلاف گورنر مسلط کیے۔ جب اختلافات بڑھے۔ تو پھر پارلیمانی لیڈر کی حیثیت سے خان عبدالولی خان نے تجویز دی۔ کہ مفتی صاحب اس عہدے کو سنبھالیں، مسٹر بھٹو مرحوم نے جمعیت اور نیپ کے ارکان اسمبلی کو توڑ کر اپنے ساتھ ملانے کی بڑی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ دو دن بعد یکم مئی ۱۹۷۲ء کو مفتی صاحب اور سردار عطاء اللہ مینگل نے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے وزرائے اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ اسی طرح دونوں صوبوں میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط حکومتیں قائم ہوئیں۔

جب مفتی صاحب وزیر اعلیٰ سرحد بنے۔ تو چیف سیکرٹری صاحب نے رہائش کے لیے گیسٹ ہاؤس کو منتخب کیا۔ اور مفتی صاحب سے گذارش کی کہ انگریزوں کے دور کا سامان اور فرنیچر ہے اسے تبدیل کرانے کی کوشش کریں گے، لیکن مفتی صاحب نے فرمایا کہ اللہ کے بندے یہ تم کس چکر میں پڑ گئے، یہ فرنیچر ٹھیک ہے اس کے بدلنے کی ضرورت نہیں، میرے اپنے گھر عبدالخیل میں تو کوئی ٹوٹا پھوٹا صوفہ بھی نہیں۔

مفتی صاحب نے انتظامیہ کی پہلی میٹنگ کال کی، کیوں کہ آپ حالات کا اندازہ لگانا چاہتے تھے، سوٹوں اور چمکتے لباسوں میں جب سیکرٹری اور افسران تشریف لائے، تو سب مفتی صاحب سے مرعوب ہو گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ بنیاد پرست شخص ہیں، لہٰذا ان سے مرضی کا کام لینا بھی آسان نہیں ہے لیکن میٹنگ کے دوران رفتہ رفتہ

ان پر اس درویش صفت ہستی کے اسرار کھل گئے۔ مولانا مفتی محمود مرحوم نے جب وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھانے کے فوراً بعد صوبے میں چند اقدامات کیے، جس میں سرفہرست امتناع شراب کا مسئلہ تھا، اس حکم کی رو سے صوبے میں شراب بنانے، پینے، رکھنے، اور بیچنے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔

میٹنگ کے دوران یہ معاملہ بھی زیر بحث آیا کہ سالانہ شراب کی فروخت پر جو ایکسائز کی ڈیوٹی لگتی ہے اس سے ایک کثیر رقم ہاتھ آتی ہے، لیکن آپ نے فرمایا کہ اس حکم کی واپسی ناممکن ہے، آخرت میں مجھے جواب دینا ہوگا، میرے دور میں جتنی بھی شراب پی جائے گی، اس کا حساب کتاب کل قیامت کے دن مجھ سے لیا جائے گا۔ غیر ملکی مہمانوں کے لیے جب مرکزی حکومت نے اجازت چاہی، تب بھی آپ نے انکار فرمایا۔

اس کے علاوہ صوبہ سرحد کا سرکاری لباس شلوار قمیص قرار پایا، اس کے بعد یہ منظر سامنے آیا کہ بڑے چھوٹے تمام افسران اس لباس میں ملبوس نظر آئے۔ سرکاری دفاتر کا ماحول بھی بدل گیا۔ اب جس افسر سے عام آدمی کی ملاقات ہوتی تو وہ یہ سمجھتا کہ میں ایک عام انسان سے مل رہا ہوں۔

وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود بھی سادگی اور بے تکلفی تھی اور وہ بھی عجیب تھی، برسوں کا پرانا ساتھی آیا کھانے کا وقت آیا مہمان نے سوچا کہ آج مرغی کھائیں گے، لیکن جب پہلا ڈونگہ دیکھا تو دال تھا، دوسرے کو چھیڑا تو اس میں سبزی تھی۔ مفتی صاحب سے مذاقاً شکایت کی، تو آپ نے جواب دیا کہ قومی اسمبلی سے ۱۵۰۰ روپے ماہانہ الاؤنس ملتا ہے، تم ہی بتاؤ کہ اتنی رقم میں دال نہ کھاؤں تو کیا کروں۔ باقی اخراجات بھی آخر اسی رقم سے پورے کرنے ہیں۔

ایک دفعہ مولانا محمد امیر ''بجلی گھر'' صاحب کو مفتی صاحب نے فون پر آنے کے لیے کہا اس نے کہا کہ کھانے کا وقت ہے گھر میں کھانا کھا کر آؤں گا۔ مفتی صاحب فرمایا، کھانے کی میری طرف سے دعوت ہوگی، اکٹھا کھائیں گے لیکن بجلی گھر صاحب

کی تھیں، سیلاب کے باعث ۹ سیٹوں پر انتخاب ہونا باقی تھا۔ طاقت کا مرکز نہایت فیصلہ کن انداز میں اسلام آباد سے ڈھاکہ منتقل ہونے لگا۔ چناں چہ ایک ہنگامہ پھیلتا گیا، اور پھر مولانا مفتی محمود صاحب نے ساتھیوں سے مل کر حالات کے سنبھالنے میں نہایت بے مثال کردار ادا کیا۔

۳۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو مسٹر بھٹو نے یحییٰ کی جگہ سنبھالی۔ اور قوم کو نئے پاکستان کی تعمیر کے لیے پکارا، آئینی طور پر یہاں تین جماعتیں ملکی سطح پر سیاسی وارث تھیں۔ پنجاب، سندھ میں بھٹو مرحوم تھے۔ سرحد اور بلوچستان میں نیپ (National Awami Party) اور جمعیت متوقع حکمران جماعتیں تھیں۔ بھٹو مرحوم نے ان کے خلاف گورنر مسلط کیے۔ جب اختلافات بڑھے۔ تو پھر پارلیمانی لیڈر کی حیثیت سے خان عبدالولی خان نے تجویز دی۔ کہ مفتی صاحب اس عہدے کو سنبھالیں، مسٹر بھٹو مرحوم نے جمعیت اور نیپ کے ارکان اسمبلی کو توڑ کر اپنے ساتھ ملانے کی بڑی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ دو دن بعد یکم مئی ۱۹۷۲ء کو مفتی صاحب اور سردار عطاء اللہ مینگل نے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے وزرائے اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ اسی طرح دونوں صوبوں میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط حکومتیں قائم ہوئیں۔

جب مفتی صاحب وزیر اعلیٰ سرحد بنے۔ تو چیف سیکرٹری صاحب نے رہائش کے لیے گیسٹ ہاؤس کو منتخب کیا۔ اور مفتی صاحب سے گذارش کی کہ انگریزوں کے دور کا سامان اور فرنیچر ہے اسے تبدیل کرانے کی کوشش کریں گے، لیکن مفتی صاحب نے فرمایا کہ اللہ کے بندے یہ تم کس چکر میں پڑ گئے، یہ فرنیچر ٹھیک ہے اس کے بدلنے کی ضرورت نہیں، میرے اپنے گھر عبدالخیل میں تو کوئی ٹوٹا پھوٹا صوفہ بھی نہیں۔

مفتی صاحب نے انتظامیہ کی پہلی میٹنگ کال کی، کیوں کہ آپ حالات کا اندازہ لگانا چاہتے تھے، سوٹوں اور چمکتے لباسوں میں جب سیکرٹری اور افسران تشریف لائے، تو سب مفتی صاحب سے مرعوب ہوگئے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ بنیاد پرست شخص ہیں، لہٰذا ان سے مرضی کا کام لینا بھی آسان نہیں ہے لیکن میٹنگ کے دوران رفتہ رفتہ

ان پر اس درویش صفت ہستی کے اسرار کھل گئے۔ مولانا مفتی محمود مرحوم نے جب وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھانے کے فوراً بعد صوبے میں چند اقدامات کیے، جس میں سرفہرست امتناع شراب کا مسئلہ تھا، اس حکم کی رو سے صوبے میں شراب بنانے، پینے، رکھنے، اور بیچنے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔

میٹنگ کے دوران یہ معاملہ بھی زیر بحث آیا کہ سالانہ شراب کی فروخت پر جو ایکسائز کی ڈیوٹی لگتی ہے اس سے ایک کثیر رقم ہاتھ آتی ہے، لیکن آپ نے فرمایا کہ اس حکم کی واپسی ناممکن ہے، آخرت میں مجھے جواب دینا ہوگا، میرے دور میں جتنی بھی شراب پی جائے گی، اس کا حساب کتاب کل قیامت کے دن مجھ سے لیا جائے گا۔ غیر ملکی مہمانوں کے لیے جب مرکزی حکومت نے اجازت چاہی، تب بھی آپ نے انکار فرمایا۔

اس کے علاوہ صوبہ سرحد کا سرکاری لباس شلوار قمیص قرار پایا، اس کے بعد یہ منظر سامنے آیا کہ بڑے چھوٹے تمام افسران اس لباس میں ملبوس نظر آئے۔ سرکاری دفاتر کا ماحول بھی بدل گیا۔ اب جس افسر سے عام آدمی کی ملاقات ہوتی تو وہ یہ سمجھتا کہ میں ایک عام انسان سے مل رہا ہوں۔

وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود بھی سادگی اور بے تکلفی تھی اور وہ بھی عجیب تھی، برسوں کا پرانا ساتھی آیا کھانے کا وقت آیا مہمان نے سوچا کہ آج مرغی کھائیں گے، لیکن جب پہلا ڈونگہ دیکھا تو دال تھا، دوسرے کو چھیڑا تو اس میں سبزی تھی۔ مفتی صاحب سے مذاقاً شکایت کی، تو آپ نے جواب دیا کہ قومی اسمبلی سے ۱۵۰۰ روپے ماہانہ الاؤنس ملتا ہے، تم ہی بتاؤ کہ اتنی رقم میں دال نہ کھاؤں تو کیا کروں۔ باقی اخراجات بھی آخر اسی رقم سے پورے کرنے ہیں۔

ایک دفعہ مولانا محمد امیر ''بجلی گھر'' صاحب کو مفتی صاحب نے فون پر آنے کے لیے کہا اس نے کہا کہ کھانے کا وقت ہے گھر میں کھانا کھا کر آؤں گا۔ مفتی صاحب فرمایا، کھانے کی میری طرف سے دعوت ہوگی، اکٹھا کھائیں گے لیکن بجلی گھر صاحب

نے کہا نہ بابا میں مریض نہیں ہوں، آپ کے یہاں تو ''پرہیزانے'' ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب نے کہا کہ چلو گھر سے پکھلاؤ چناں چہ وہ ہوٹل سے کھانا لے کر وزیر اعلیٰ ہاؤس پہنچے۔

حضرت بنوریؒ صاحب پشاور تشریف لائے، انھیں پی ڈبلیو ڈی کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا، بنوری صاحب چائے کے معاملے میں بڑے نفیس ذوق کے مالک تھے۔ اہتمام سے ان کے لیے چائے بنی، مگر چائے میں چینی کم ہوتی، چناں چہ مفتی صاحب نے پشاور یونی ورسٹی کے شعبہ عربی کے چیئرمین مولانا محمد اشرف کے گھر کا نمبر ملایا، مفتی صاحب نے انھیں بتایا کہ آج چائے میرے ساتھ پیجیے، حضرت بنوری بھی بیٹھے ہیں، لیکن اپنے ساتھ تھوڑی سی چینی بھی لیتے آئے گا، ہمارے گھر میں ختم ہوگئی ہے۔

وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے پہلی بار اپنے آبائی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان پہنچے، تو پولیس کو اپنے ساتھ ساتھ آنے سے منع کیا۔ جس طرح وزارت سے قبل لوگوں کی دکانوں پر بیٹھ کر ان سے آزادانہ گپ شپ لگاتے تھے۔ اس دن بھی اسی طرح سب دوستوں سے جا کر باری باری گپ شپ لگائی اور ان سے چائے پی۔

شام کے وقت اپنے گاؤں عبدالخیل جانے لگے، تو ڈی سی جو سارا دن ان کے ساتھ رہ کر تھک چکا تھا۔ آگے بڑھا مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا، اچھا جناب! مجھے اجازت دیجیے، مفتی صاحب نے سر اٹھایا، اور فرمایا، اللہ کے بندے! میں یقیناً غریب ہوں، لیکن اتنا بھی نہیں کہ عبدالخیل میں تمھیں ایک پیالی چائے بھی نہ پلا سکوں، اب تم میرے مہمان ہو۔

مسٹر بھٹو مرحوم نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط وزارتوں کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ چناں چہ وہ شروع دن سے ہی ان کے خلاف محاذ بنانے میں مصروف تھے۔ مرکز کی طرف سے رکاوٹیں ڈالیں، مگر آپ ڈٹے رہے۔ فوراً مسٹر بھٹو نے بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط وزارت توڑ دی۔ اور

صوبہ سرحد کے گورنر ارباب سکندر خان خلیل کو برطرف کر دیا، یہ اقدام اس معاہدے کے سراسر خلاف تھا۔ جس پر ۲۷؍اپریل ۱۹۷۲ء کو پنڈی پریذیڈنسی میں نیپ، جمعیت اور بھٹو مرحوم نے دستخط کیے تھے۔ مولانا مفتی محمود نے اس غیر جمہوری اقدام پر احتجاج کیا۔ اور اس کے فوراً بعد وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دیا۔ مسٹر بھٹو مرحوم نے ان کی بہت زیادہ منت سماجت کی۔ طرح طرح کے لالچ بھی دیے کہ آپ تو ہمارے امام ہیں، آپ سے کوئی لڑائی نہیں، جیسا جی چاہے حکومت کیجیے، کوئی باز پرس نہیں ہوگی، لیکن ان باتوں سے مفتی مرحوم نے قطعاً اتفاق نہ کیا۔ اور فرمایا کہ سب سے پہلے آپ ہماری اس شکایت کا ازالہ کیجیے، جو استعفیٰ کا باعث بنی ہے۔

وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ کے بعد سب سے پہلا فون خواجہ زاہد صاحب نے کیا، مبارک باد دی، اس کے بعد ایک سلسلہ شروع ہوا، چناں چہ ایک اندازے کے مطابق اتنے فون وزارت ملنے پر نہیں ہوئے، جتنے کہ استعفیٰ کے بعد ملے۔

استعفیٰ کے بعد سی آئی ڈی کے کارکنوں نے آپ کا تعاقب شروع کیا آپ کو ہر طرح سے ہراساں کرنا شروع کیا، وزارت سے الگ ہونے کے بعد مولانا عبیداللہ انور صاحب مرحوم کی درخواست پر لاہور کی مسجد واقع شیرانوالہ گیٹ میں دورۂ تفسیر شروع کیا۔

سیاست میں مفتی صاحب کا نظریہ نہایت الگ تھلگ تھا۔ ناجائز سفارش نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مذہبی گھرانے کے دو صاحب زادگان آئے، جو بینک میں ملازمت کے خواہش مند تھے۔ آپ نے جب سنا تو ناراض ہو کر فرمایا، کہ میرے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ بینک کی ملازمت کو جائز نہیں سمجھتا اور اس کے لیے سفارش کرنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔

آپ نے سیاسی سفر میں ہر قسم کے تعصبات سے گریز کیا۔ کبھی اختلافی مباحث کو زیر بحث نہ بنایا، افغانستان کے مسئلے میں مفتی صاحب کا موقف غیر مبہم اور واضح تھا۔ وہ روسی تسلط کو انتہائی جارحانہ اور ظالمانہ اقدام سمجھتے تھے۔ افغان مجاہدین کے لیے

حمایت کا بانگ دہل اعلان فرمایا۔ انتہائی بیماری کے باوجود بھی دور دور تک تشریف لے گئے۔ لیڈروں سے ہمیشہ رابطہ جاری رکھا۔ اور انھیں اتحاد کا درس دیا۔ افغان لیڈر بھی اس زمانے میں آپ کے ہاں مشورے کے لیے تشریف لاتے۔

ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاسی امور پر آپ کی گہری نظر رہی۔ بیرونی ممالک کا دورہ کر کے یہ بات محسوس کی کہ اتفاق اور اتحاد کا کونسا طریقہ کارگر اور مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

مفتی صاحب کی یہ خصوصیت نہایت قابل ذکر ہے کہ آپ نے ہمیشہ دین و سیاست اور درس و تدریس کو ایک ساتھ چلایا، ایک طرف پارلیمنٹ میں قومی امور پر بحث کرتے اور دوسری طرف اپنے مدرسے میں حدیث کے طالب علموں کو چشمہ علم سے فیضیاب فرماتے۔ حدیث میں طلبا کو تقابل مذاہب کی تشفی بخش بحث نہایت غیر معمولی کام ہے، آپ حفظِ مراتب کا بہت خیال کرتے۔

آپ کا یہ مقام تھا کہ کبھی بھی سیاست میں تاویل سے اور الٹ پھیر سے کام نہیں لیا جو کیا کھلم کھلا کیا، کسی سابقہ فیصلے یا اقدام پر انھیں کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ کسی سابقہ بیان کی توجیہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مختلف مجالس، تقاریب، اور پبلک جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

سیاست میں لہجوں کا بدلنا ایک معمول بن گیا ہے، مگر ان کا لہجہ نہایت شستہ، زبان ستھری، گفتگو بے لاگ اور مدلل ہوتی تھی۔ اپنے بدترین مخالفوں کا نام بھی نہایت احترام سے لیتے تھے۔ اسی لیے ہر طبقے میں بھی ان کا نام پورے احترام سے لیا جاتا تھا۔ آپ کی سیاسی و غیر سیاسی گفتگو نہایت شائستہ ہوتی مفتی صاحب کی جماعتی عظمت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کے سچے پیروکار تھے اور ان کے پیروکاران بزرگوں کا نعم البدل آپ ہی کو سمجھتے تھے، وہ تو اپنے بڑوں کے جانشین بننے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن ان کا نعم البدل مشکل سے ہی پیدا ہوگا۔

آپ کو سیاسی معاملات میں خداداد بصیرت حاصل تھی، انھیں سیاسی مجالس یا

میٹنگز میں شرکت کے لیے کسی تیاری وغیرہ کی ضرورت نہ ہوتی، سیاسی الجھنوں کو بڑی بصیرت سے حل فرماتے، پاکستان قومی اتحاد نے بھٹو حکومت کے ساتھ مذاکرات کے لیے جو ٹیم مقرر کی تھی۔ اس کی قیادت بھی آپ ہی کے ذمے تھی۔ ملک اس وقت نہایت نازک دور سے گزر رہا تھا۔ مفتی صاحب نے اپنی اعلیٰ سیاسی بصیرت اور بے داغ کردار سے مذاکرات کے دوران قوم کی نمائندگی کا صحیح حق ادا کیا، سیاسی امور میں ہمیشہ جمہوری ذہن سے سوچتے تھے۔ اس مملکت خداداد میں اسلامی اقدار کے نفاذ کے ساتھ ساتھ جمہوری عمل اور جمہوری اداروں کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ سیاسی عمل کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد قوم کے سیاسی شعور میں خود بخود پختگی آجائے گی۔

حب الوطنی کا کمال یہ تھا کہ حکومت سے اختلاف کے باوجود بیرون ملک اختلافی مسائل پر گفتگو نہ کرتے، ساؤتھ افریقہ کے دورے کے دوران ایک اخبار نویس نے مفتی صاحب سے انٹرویو کی گذارش کی، لیکن آپ نے اسی بنا پر انکار کیا کہ ملکی حالات کے متعلق غیر ملکی لوگوں سے بحث مفید نہیں۔ جنس برگ کے ایئرپورٹ پر جہاز کی روانگی سے قبل بی بی سی، وایس آف امریکا، رائٹر اور کئی دوسری بین الاقوامی نیوز ایجنسیوں کے نمائندے گفتگو کے لیے آئے، تو آپ نے انھیں دوٹوک لہجے میں جواب دیا کہ میں اپنے ملکی معاملات و مسائل کی باتیں اغیار کے سامنے نہیں کہہ سکتا یہ تھا آپ کا ملک سے والہانہ لگاؤ۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ جو کہ ایک عظیم انسان گزرے ہیں۔ ان کے لائق فرزند مولانا قاری سعید الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

> ''میں آخر میں ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں، جس سے مفتی صاحب نے اپنی زندگی میں بیان کرنے سے منع فرمایا تھا۔ لیکن اب اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، وہ بات کیا تھی؟ وہ یہ کہ مدینہ منورہ میں ایک صاحب نسبت بزرگ نے خواب میں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

حمایت کا بانگ دہل اعلان فرمایا۔ انتہائی بیماری کے باوجود بھی دور دور تک تشریف لے گئے۔ لیڈروں سے ہمیشہ رابطہ جاری رکھا۔ اور انھیں اتحاد کا درس دیا۔ افغان لیڈر بھی اس زمانے میں آپ کے ہاں مشورے کے لیے تشریف لاتے۔

ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاسی امور پر آپ کی گہری نظر رہی۔ بیرونی ممالک کا دورہ کر کے یہ بات محسوس کی کہ اتفاق اور اتحاد کا کونسا طریقہ کارگر اور مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

مفتی صاحب کی یہ خصوصیت نہایت قابل ذکر ہے کہ آپ نے ہمیشہ دین و سیاست اور درس و تدریس کو ایک ساتھ چلایا، ایک طرف پارلیمنٹ میں قومی امور پر بحث کرتے اور دوسری طرف اپنے مدرسے میں حدیث کے طالب علموں کو چشمہ علم سے فیضیاب فرماتے۔ حدیث میں طلبا کو تقابل مذاہب کی تشفی بخش بحث نہایت غیر معمولی کام ہے، آپ حفظِ مراتب کا بہت خیال کرتے۔

آپ کا یہ مقام تھا کہ کبھی بھی سیاست میں تاویل سے اور الٹ پھیر سے کام نہیں لیا جو کیا کھلم کھلا کیا، کسی سابقہ فیصلے یا اقدام پر انھیں کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ کسی سابقہ بیان کی توجیہہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مختلف مجالس، تقاریب، اور پبلک جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

سیاست میں لہجوں کا بدلنا ایک معمول بن گیا ہے، مگر ان کا لہجہ نہایت شستہ، زبان ستھری، گفتگو بے لاگ اور مدلل ہوتی تھی۔ اپنے بدترین مخالفوں کا نام بھی نہایت احترام سے لیتے تھے۔ اسی لیے ہر طبقے میں بھی ان کا نام پورے احترام سے لیا جاتا تھا۔ آپ کی سیاسی وغیر سیاسی گفتگو نہایت شائستہ ہوتی مفتی صاحب کی جماعتی عظمت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کے سچے پیروکار تھے اور ان کے پیروکار ان بزرگوں کا نعم البدل آپ ہی کو سمجھتے تھے، وہ تو اپنے بڑوں کے جاں نشین بننے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان کا نعم البدل مشکل سے ہی پیدا ہوگا۔

آپ کو سیاسی معاملات میں خداداد بصیرت حاصل تھی، انھیں سیاسی مجالس یا

میٹنگز میں شرکت کے لیے کسی تیاری وغیرہ کی ضرورت نہ ہوتی، سیاسی الجھنوں کو بڑی بصیرت سے حل فرماتے، پاکستان قومی اتحاد نے بھٹو حکومت کے ساتھ مذاکرات کے لیے جو ٹیم مقرر کی تھی۔ اس کی قیادت بھی آپ ہی کے ذمے تھی۔ ملک اس وقت نہایت نازک دور سے گزر رہا تھا۔ مفتی صاحب نے اپنی اعلیٰ سیاسی بصیرت اور بے داغ کردار سے مذاکرات کے دوران قوم کی نمائندگی کا صحیح حق ادا کیا، سیاسی امور میں ہمیشہ جمہوری ذہن سے سوچتے تھے۔ اس مملکت خداداد میں اسلامی اقدار کے نفاذ کے ساتھ ساتھ جمہوری عمل اور جمہوری اداروں کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ سیاسی عمل کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد قوم کے سیاسی شعور میں خود بخود پختگی آجائے گی۔

حب الوطنی کا کمال یہ تھا کہ حکومت سے اختلاف کے باوجود بیرون ملک اختلافی مسائل پر گفتگو نہ کرتے، ساؤتھ افریقہ کے دورے کے دوران ایک اخبار نویس نے مفتی صاحب سے انٹرویو کی گذارش کی، لیکن آپ نے اسی بنا پر انکار کیا کہ ملکی حالات کے متعلق غیر ملکی لوگوں سے بحث مفید نہیں۔ ہنس برگ کے ایئر پورٹ پر جہاز کی روانگی سے قبل بی بی سی، وائس آف امریکا، رائٹر اور کئی دوسری بین الاقوامی نیوز ایجنسیوں کے نمائندے گفتگو کے لیے آئے، تو آپ نے انھیں دو ٹوک لہجے میں جواب دیا کہ میں اپنے ملکی معاملات و مسائل کی باتیں اغیار کے سامنے نہیں کہہ سکتا یہ تھا آپ کا ملک سے والہانہ لگاؤ۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ جو کہ ایک عظیم انسان گزرے ہیں۔ ان کے لائق فرزند مولانا قاری سعید الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

> ''میں آخر میں ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں، جس سے مفتی صاحب نے اپنی زندگی میں بیان کرنے سے منع فرمایا تھا۔ لیکن اب اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، وہ بات کیا تھی؟ وہ یہ کہ مدینہ منورہ میں ایک صاحب نسبت بزرگ نے خواب میں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

زیارت کی۔ اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مفتی صاحب کو ان الفاظ میں پیغام بشارت دیا گیا۔

قل له منی السلام بتقوی باللہ ولا یقول الا الحق واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل.

اس کا ترجمہ یہ ہے: ''کہ میری طرف سے آپ کو سلام کہیں، ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے قوت وطاقت کے طلب گار رہیں، ہمیشہ حق بات کہیں، اللہ تعالیٰ سچ اور حق لیتا ہے، اور وہی صحیح راستہ کی راہنما کرتا ہے۔''

اسی طرح شیخ عبدالمحسن عباد جو سعودی عرب کے ایک ممتاز عالم دین اور مدینہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جب مفتی صاحب یونی ورسٹی کے دورے پر تشریف لے گئے، تو دوران گفتگو شیخ عبدالمحسن عباد نے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

واللہ انا اشکرہ وکل مسلم یشکرہ.

''خدا کی قسم! میں مفتی صاحب کا شکر گزار ہوں۔ اور ہر مسلمان کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔''

مفتی صاحب، جب امام مسجد نبوی شیخ عبدالعزیز صالح سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے اور مفتی صاحب نے اٹھنے کی اجازت چاہی، تو امام صاحب نے فرمایا:

واللہ ھذا المجلس لایمل.

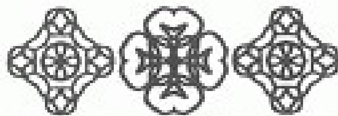
''خدا کی قسم! اس مجلس سے دل نہیں بھرتا، تشنگی باقی رہتی ہے۔''

اسی طرح عمر محمد فلاطہ جو مدینہ منورہ یونی ورسٹی کے سیکرٹری جنرل تھے انھوں نے دوران ملاقات کہا کہ:

''میں آپ کو دیکھ کر اس لیے خوش ہو رہا ہوں کہ آپ ایک بلند مقام پر فائز ہیں اور آپ نے دین وسیاست کو اکٹھا کر کے دکھایا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر سارے اسلاف کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گزر جاتا تھا۔ لیکن آج ایسا کون ہے کہ جو آپ کا نقشہ پیش کرے۔ مٹی کے ان بنے انسانوں میں کبھی ایسے جوہر بھی نظر آتے ہیں۔ جو مٹی کے اس عالم میں ضوئے خورشید کی تابانی پیدا کرے، چارپائی سے صوفے اور صوفے سے وزارت کی کرسی پر جانا بہت آسان کام ہے۔ لیکن وزارت کی کرسی کی موجودگی میں اتنی پرانی چارپائی پر بیٹھنا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ زمانے میں ایسے زمانہ ساز اور تاریخ ساز رجال سینکڑوں سالوں بعد بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔ رونے کی بات ہے کہ جوں جوں قیامت کی گھڑی قریب آتی ہے، تو ایسے لوگوں کا ملنا بھی مشکل ہوتا چلا جارہا ہے۔ میں کون سا دیپ لاؤں، کون سا چراغ لاؤں کہ ایسے رخ زیبا کا مشاہدہ کرسکوں۔

نرالی وضع ہے، دستور ان کے ہی نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں



پرتوِ افکار

مقالاتِ مفتی محمودؒ سمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۹

مفتی محمودؒ کے اقتصادی نظریات

مفتی مسعود تحسین صاحب

رئیس الافتاء جامعہ قاسم العلوم

ملتان

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۹)

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا وہ تحمل اور قوت برداشت ہے کہ زمانہ جس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، بعض حضرات کی جانب سے حضرت کو سوشلسٹ اور اشترا کی جیسے ناروا خطابات بھی ملے مگر حضرت تھے کہ تحمل و برداشت کا ایک پہاڑ! یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے قبول کیا، اپنے پرایوں کے ان زہر خند سلاموں کا جواب، اپنے شگفتہ ہونٹوں پہ دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ دیتے، گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں ؎

بندہ پرور آپ ہی فرمایئے
ہم برے ٹھہرے تو اچھا کون ہے

عالم اسلام کی عظیم شخصیت، عالی مرتبت، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے احقر کا تعلق ایک استاذ اور شاگرد کا تعلق تو نہیں کہ اس سعادت سے محروم رہا ہوں لیکن ایک عقیدت مند ضرور ہوں اور عقیدت مند بھی ایسا کہ جسے اس سے قبل عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔

آج کی اس نشست میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے اقتصادی نظریات پر لب کشائی کی جسارت کر رہا ہوں اور اس سے قبل کہ کچھ عرض کروں، چند گذارشات گوش گذار کرنا ضروری سمجھتا ہوں، نظریات کسی بھی شخصیت کے ہوں ان کے بارے میں کما حقہ واقفیت کا دعویٰ کرنا کسی کے لیے بھی درست نہیں کہ عموماً کسی کے نظریات پوری طرح کبھی آشکار نہیں ہوتے اور خصوصاً معاشی نظریات، پھر وہ بھی حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے!! کہ کہیں بھی یہ یک جا نہیں ہیں، منتشر اور بکھرے بکھرے ہیں۔

احقر کے کام میں سب سے بڑی مشکل یہ حائل تھی کہ حضرت کے اقتصادی نظریات یوں تحریری صورت میں موجود نہیں ہیں، آپ کے ارشادات کا بڑا حصہ وہ تقاریر ہیں جو آڈیو کیسٹوں میں محفوظ ہیں، بقیہ کچھ انٹرویوز ہیں جو ''اذان سحر'' کے نام سے چھپ چکے ہیں اور علاوہ ان کے ایک بہت بڑا ذخیرہ حضرت کے وہ فتاویٰ جات ہیں جو دارالافتاء جامعہ قاسم العلوم ملتان کے تبویب کے رجسٹروں میں محفوظ ہے۔ ان سے استفادہ کیا جا سکتا تھا مگر کچھ ذاتی مصروفیات اور کچھ دارالافتاء کے مشاغل نے موقع فراہم نہیں کیا، بایں ہمہ جو ہو سکا اور جتنا ہو سکا، بتوفیقہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ ایک طالب علمانہ حقیری کاوش ہے

گر قبول افتذ زہے عزو شرف

اس مقالہ میں احقر نے حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے تین ایسے اقتصادی نظریات کا انتخاب کیا ہے، جن کی وجہ سے اس دور میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں، اور ایک طویل عرصہ تک وطن عزیز کے درودیوار میں انہی کی صدائے بازگشت گونجتی رہی۔

دراصل کسی کی بات، صحیح طور پر لوگوں تک نہ پہنچ پائے یا پہنچانے کا کوئی معقول ذریعہ نہ ہو تو ایسے میں لوگوں کے درمیان غلط فہمیوں کا پیدا ہو جانا کوئی انہونی بات نہیں، حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ درپیش ہوا۔

بعض ہم عصر علمائے کرام جن کے علم، تقویٰ، دیانت اور للّٰہیت کے بارے میں کوئی کلام نہیں، انھوں نے حضرت علیہ الرحمہ سے اختلاف کیا اور اختلاف کا اظہار بھی، اس دوران بسا اوقات ماحول میں قدرے تلخی نے بھی اپنا رنگ جمایا، لیکن یہ سب کچھ نظریاتی اختلافات کا ایک حصہ ہے، جو تاریخ کے ہر دور میں ظہور پذیر ہوتا رہا اور ہر نئے دور میں تاریخ اپنے پرانے صفحات الٹتی رہی۔

البتہ! اس ساری داستان کا قابل تعریف پہلو، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا وہ تحمل اور قوت برداشت ہے کہ زمانہ جس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، بعض حضرات کی جانب سے حضرت کو سوشلسٹ اور اشتراکی جیسے ناروا خطابات بھی ملے مگر حضرت تھے کہ تحمل و برداشت کا ایک پہاڑ! یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے قبول کیا، اپنے پرایوں کے ان زہر خند سلاموں کا جواب، اپنے شگفتہ ہونٹوں پہ دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ دیتے، گویا زبان حال سے کہہ رہے ہوں ؎

بندہ پرور آپ ہی فرمایئے
ہم برے ٹھہرے تو اچھا کون ہے

......☆......☆......☆......

مسئلہ احیاارض میتۃ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک واضح ارشاد "من احیا ارضا میتۃ فھی لہ" کی روشنی میں، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ فتویٰ دیا کرتے تھے کہ

"غیر آباد زمین کو، آباد کرنے والا شرعاً اس کا مالک ہو جاتا ہے"

نیز فرماتے تھے کہ

"اس اصول کے مطابق تمام وہ زمینیں جو عن قریب آباد ہوئی ہیں، موجودہ آبادکار مزارعین، ان زمینوں کے مالک قرار دیے جائیں"

ایک ضابطہ:

حضرت علیہ الرحمہ کے اس موقف کی تفصیلات میں جانے سے قبل ایک ضابطہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس کی بنیاد ہی کسی زمین کو آباد کرنے سے ہے، آبادکار اس کا شرعاً مالک بن جاتا ہے، وہ شرعی ضابطہ یہ ہے کہ

"اگر کسی شخص کو بنجر زمین سربراہ حکومت عطا کردے اور وہ تین سال تک اسے آباد نہ کر سکے تو حکومت یہ زمین واپس لے سکتی ہے۔"

مذکورہ قاعدہ سے درجہ ذیل امور مستفاد ہوئے

(۱) زمین حکومت کی جانب سے، اسے ملی ہو، ورنہ تو ملکیت نہیں آئے گی، جیسا کہ مختصر الطحاوی میں تصریح ہے:

ولا یملکہ الا بتملیک الامام.

(۲) مذکورہ شخص کے لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ تین سال کی مدت میں اس زمین کو آباد کردے چناں چہ فرمان رسول سے یہی بات ثابت ہے:

ولیس لمحتجر حق بعد ثلاث سنین.

(کتاب الخراج لابی یوسف)

(۳) مذکورہ فرمان رسول سے یہ بھی واضح ہوا کہ محض طویل مدت تک اس زمین کو روکے رکھنا ملکیت کا باعث نہیں، مطلب یہ کہ سال ہا سال تک بھی اگر ایسی زمین بے آباد رہی تو شخص مذکور کا قبضہ، اس کا مالک ہونا ثابت نہیں کرتا کہ ملکیت کے لیے احیاء ارض میتہ ضروری ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا مؤقف:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن مزارعین کو مالک بنا دینے کا فرماتے تھے، وہ ایسی زمینوں کے مزارعین تھے کہ جن میں مذکورہ تینوں شرائط میں سے کوئی ایک شرط مفقود تھی۔ آپ کے اس مؤقف پہ جہاں احادیث رسول اور فقہائے کرام رحمہم اللہ کی تصریحات شاہد ہیں، وہاں خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فعل بھی مؤید و موثق ہے۔

حضرت بلالؓ کی جائیداد کا مسئلہ:

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال بن حارث مزنیؓ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے عطا کردہ، ایسی زمین کی واپسی کا مطالبہ کر دیا تھا کہ جسے حضرت بلال آباد نہیں کر سکے تھے، اور تین سال گذرنے پر ان کا حق آبادکاری بھی ختم ہو گیا تھا۔ (تفصیل کے لیے واضح ہو کتاب الخراج یحیٰی بن آدم، حدیث ۲۹۴)

پس انہی احادیث و واقعات کی بنیاد پر، فقہائے کرام رحمہم اللہ نے تین سال تک آباد نہ کرنے والے سے زمین واپس لے لینے کا ضابطہ وضع فرمایا، چناں چہ صاحب ہدایہ تحریر کرتے ہیں:

ومن حجر ارضا ولم یعمر ثلاث سنین اخذھا الامام ودفعھا الی غیرہ لأن الدفع الی الاول کان لیعمرھا

فتحصل المنفعة للمسلمین من حیث العشر والخراج، فاذا لم یحصل یدفعه الی غیره تحصیلا للمقصود و لان التحجیر لیس باحیاء یملکه به لان الاحیاء انما هوا العمارة. (ہدایہ جلد رابع)

''اور جو شخص کسی زمین کو پتھروں سے گھیرے اور تین سال تک اسے آباد نہ کرے تو سربراہ حکومت اس سے لے کر وہ زمین کسی دوسرے کو دے دے، اس لیے کہ پہلے شخص کو زمین دینے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے آباد کرے تا کہ اس کے عشر و خراج ادا کرنے سے مسلمانوں کو منفعت حاصل ہو، لیکن جب یہ حاصل نہ ہوئی تو امام یہ زمین اسی مقصد کے لیے، دوسرے کو دے دے، اور یہ اس لیے بھی درست بات ہے کہ محض پتھر لگا لینے سے کوئی اس کا مالک نہیں بن جاتا کہ یہ کوئی احیا نہیں ہے، احیا کا مطلب تو زمین کو آباد کرنا ہے۔''

حضرت مفتی صاحبؒ کا طرز استدلال:

ان تفصیلات کی روشنی میں حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کا مؤقف بڑا واضح ہو جاتا ہے کہ جب ایک زمین، صحابی رسول کے پاس ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عطا کی ہو اور فاروق اعظمؓ جیسا احکام شریعت کا پاسبان و محافظ خلیفہ اس رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ زمین کا محض اس بنیاد پہ واپسی کا مطالبہ کرتا ہے کہ صحابی رسول کی ضرورت سے زاید ہے اور یہ صحابی اتنی زمین کے آباد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو آج اس وطن عزیز میں اس قانون کے جاری کرنے میں کونسی شرعی دلیل حائل ہے؟ آج یہ کیوں ممکن نہیں کہ اللہ کی ساری زمین کو کاشت میں لا کر، وطن عزیز سے غربت و افلاس کے سائے دور کیے جا سکیں؟ رزق خداوندی کو عام کر دیا جائے تا کہ ہر کس و ناکس کی اس تک رسائی ہو، بے روزگاروں کو روزگار میسر آ جائے

اور یہ بندگان خدا غیروں کی محتاجی سے محفوظ ہو جائیں۔

چناں چہ ممتاز صحافی محمود شام کے اس سوال کے جواب میں کہ زراعت کو ملکی خوش حالی کا سرچشمہ بنانے اور ترقی یافتہ زرعی ملکوں کے برابر لے جانے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے؟

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اعتماد سے بھرپور آواز میں جواب دیا تھا کہ:

''زراعت کو عام کیا جائے، غیر آباد علاقوں کو آباد کیا جائے، زمینوں کو ناجائز طور پر سیاسی رشوتوں کے لیے الاٹ نہ کیا جائے، زمینیں، بے زمین لوگوں میں الاٹ ہوں، آب پاشی کے ذرائع کی توسیع ہو، مشینی آلات کے ذریعے بھی، ملکی زراعت کو ترقی دی جاسکتی ہے بشرطیکہ مشینی آلات کے تمام ذرائع اجتماعی طور پر استعمال ہوں، صرف ایک ہی شخص کو یہ اختیارات حاصل نہ ہوں کہ اس طرح مزدور و کسان بے کار ہو جائیں گے۔'' (اخبار جہاں، کراچی ۲۲ر ستمبر ۱۹۶۹ء)

نہایت مختصر مگر جامع مانع جواب اس سے بڑھ کر کیا ہوگا، کتنے مختصر پیرائے میں پوری سرزمین کو سرسبز و شاداب اور گل رنگ کرنے کا پروگرام بیان فرمادیا اور ساتھ ہی ساتھ مزدور و کسان کی محرومی، بے کاری اور اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم و ناانصافی اور بے اعتدالی کا احساس کرتے ہوئے اس کی اشک شوئی بھی فرمادی کہ ان سہولیات میں اسے بھی شریک کیا جائے۔

جناب محمود شام کے بقول، حضرت مفتی صاحب نے یہ جواب اس حالت میں دیا کہ ان کے چہرے پہ تھکن اور آنکھیں بے خوابی کی چغلی کھا رہی تھیں بایں ہمہ ملک و ملت کا یہ ہمدرد اور بہی خواہ یوں جواب دے رہا تھا کہ انٹرویو کر چکنے کے بعد یہ معزز صحافی جب اپنے تاثرات لکھنے بیٹھا تو اس کی آنکھوں میں اس عظیم المرتبت ہستی کا سراپا یوں سمٹ آیا کہ گویا یہ معصوم شخصیت قرون اُولیٰ کے مسلمانوں کی کوئی بھٹکتی روح ہے۔

معزز صحافی حضرت قدس سرہٗ کی صورت اور آپ کے لہجے کو یاد کرتے ہوئے

ان پر خاموش زبان کو حرکت دیتا ہے:

''سر پر ایک سکی رومال عمامے کا منصب ادا کرتا ہوا، گھنی داڑھی قرون اُولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتی ہوئی، آنکھوں میں تدبر کی گہرائیاں، چہرے پہ گذرے ماہ و سال کے نقوش، کھلا کرتا اور شلوار، آواز میں سنجیدگی اور متانت کا آہنگ، نیچے ایک دری پہ آلتی پالتی مارے، گاؤ تکیے کا سہارا لیے، مولانا مفتی محمود صاحب کو معتقدین کے سامنے سیاست و مذہب کے رموز کھولتے دیکھا تو مجھے کوئی ایسا سیاسی راہ نما یاد نہ پڑا، جسے اس درویشی کی حالت میں ایک مسجد کے حجرے میں دیکھا ہو، البتہ میرے ذہن کے گوشوں میں تاریخ کے بعض اوراق انگڑائیاں لے کر اٹھے اور میری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے جب مذہب و سیاست یک جا تھے اور مسجد سیاست کا بھی مرکز تھی، صرف عبادت گاہ نہیں تھی۔''

(ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۳۹، ۲۲ر ستمبر ۱۹۶۹ء)

دوسرا مشہور مسئلہ- جاگیروں کو چھین کر کاشت کاروں میں تقسیم کر دینا:

ملکیت زمین سے متعلق حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کا ایک دوسرا نقطہ نظر جس کا اس دور میں بہت چرچا کیا گیا اور سیاسی حریفوں نے خصوصیت کے ساتھ انتخابی جلسوں اور جلوسوں میں بطور ہتھکنڈہ استعمال کیا، اخبارات، اور پوسٹروں کے ذریعے بڑے وسیع پیمانے پر اس کی تشہیر کی اور اس مؤقف کو بنیاد بنا کر وہ دھاچوکڑی مچائی کہ پناہ بخدا! یہاں تک کہ بعض وہ اصحاب علم کہ جن کے اخلاص و عمل اور حمیت دینی میں ذرہ بھر کلام نہیں، بدقسمتی سے وہ بھی اس پروپیگنڈے کے زیر اثر آگئے۔

وضع کردہ افسانہ:

لوگوں کے بقول وہ نقطہ نظر یہ تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے نزدیک ''موجودہ

جاگیرداروں کے پاس، جتنی بڑی بڑی جاگیریں ہیں، اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان زمینوں کو، ان لوگوں سے چھین کر، ملک کے غریب کاشت کاروں اور کسانوں میں تقسیم کر دے۔"

بالفرض! اگر حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کا مؤقف بغیر کسی دوسری تفصیل کے بعینہٖ یہ ہوتا تو ایک مفتی صاحب ہی کیا کوئی بھی بڑے سے بڑا صاحب علم یہ مؤقف کیوں نہ اپنا لے، اس کی تائید نہیں کی جاسکتی کہ یہ مؤقف قرآن وسنت، اجماع امت اور فقہاء اسلامی کی تصریحات کے سراسر خلاف ہے۔

مملوکہ زمین چھیننا جائز نہیں:

علمائے اسلام اور ائمۂ کرامؒ نے تصریح کی ہے کہ زمین بھی دوسرے اموال کی طرح ایک مال ہے اور جس طرح بقیہ اموال وراثت، عطیہ اور بیع وشراء جیسے جائز طریقوں سے کسی کی ملکیت میں آئیں تو وہ شخص اُن اموال کا مالک ہوجاتا ہے، بعینہٖ یہ حکم زمین کا بھی ہے اور جس طرح دوسرے اموال کا کسی شخص کی ملکیت میں آچکنے کے بعد اس سے بلا معاوضہ چھین لینا جائز نہیں، بالکل اسی طرح زمین کے مالک کی ملکیت اگر شرعی اعتبار سے جائز ہو اور وہ شخص اپنے املاک پر عائد ہونے والے تمام واجبات بھی ادا کرتا ہو تو سربراہ حکومت یا کسی بھی شخص کو یہ اختیار نہیں کہ وہ ایسی مملوکہ زمین بغیر کسی معاوضہ کے جبراً اس سے چھین لے، کہ یہ بات قرآن وسنت کے واضح احکامات اور فقہائے امت کی روشن تصریحات کے بالکل منافی ہے، چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ. (سورۂ انبیاء:۲۹)

ایک دوسرے کے اموال کو باطل طریقے سے مت کھاؤ۔

اموال میں زمین اور دوسری سبھی جائیداد شامل ہیں، زمین کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔

دلائل:

نیز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مہاجرین مکہ جو کہ مدینہ میں خالی ہاتھ آئے تھے اور انصار مدینہ زمین، جائیداد کے مالک تھے اور ان کے پاس ان کی ضروریات سے زائد زمینیں موجود تھیں، اگر دوسروں کی زمینیں چھین کر غرباء میں تقسیم کر دینا بھی کوئی حکم الٰہی ہوتا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اس پر عمل فرماتے اور انصار مدینہ کی زائد از ضرورت زمینیں لے کر مہاجرین مکہ میں ضرور تقسیم فرمادیتے کہ ایک تو حکم الٰہی پر عمل ہوجاتا اور دوسرے مہاجرین کا معاشی مسئلہ بھی پوری طرح حل ہوجاتا۔ لیکن وہاں حالت یہ تھی کہ ایک مرحلے پر انصار مدینہ کی اس پیش کش کے باوجود کہ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ہمارے کھجوروں کے باغات، ہمارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم فرمادیجیے۔" اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس پیش کش کو قبول نہیں فرمایا اور مہاجرین کو انصار کی زمینوں کی بٹائی اور شراکت کی بنیاد پر کام کرنے کی تجویز قبول فرمائی۔

پس اس وقت کہ جب مسلمانوں کی معاشی حالت بالکل ناگفتہ بہ تھی، اللہ کے نبی نے انصار کی مملوکہ زمینوں کو، مہاجرین کے باوجود مستحق ہونے کے، ان میں تقسیم نہیں فرمایا تو آج اس صورت پر عمل کیوں کر ممکن ہے، لہٰذا حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کا مؤقف یہ تو بالکل نہیں تھا۔

دلیل نمبر۲:

ایک مرتبہ اسی طرح کا سوال، خلیفہ وقت ہارون الرشید نے حضرت امام یوسفؒ سے کیا تھا، جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا کہ سربراہ حکومت کو ایسی مملوکہ زمینیں واپس لینے کا قطعاً اختیار نہیں، خواہ ان مالکوں نے یہ زمینیں اصل مالکوں سے خریدی ہوں یا انھیں بطور وراثت ملی ہوں، ان کے قبضہ سے انھیں نہ نکالا جائے۔ بلکہ اگر کوئی سربراہ حکومت ایک شخص سے زمین لے کر، دوسرے کو دیدے تو یہ بالکل غصب کے حکم

میں ہے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کتاب الخراج للامام ابی یوسف، فصل فی ذکر القطائع)

دلیل نمبر۳:

نیز حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا یزول ملک المالک الا ان یشاء و لا یملک رجل شیئا الافی المیراث۔ (کتاب الام للامام الشافعی، جلد۳)

''کسی مالک کی ملکیت زائل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود نہ چاہے اور کسی شخص کو کسی چیز کا زبردستی مالک نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ وہ خود نہ چاہے، البتہ اس میں صرف میراث کا مال مستثنیٰ ہے۔''

دلیل نمبر۴:

کسی کی جائز ملکیت کو اگر یوں چھین لیا جائے تو اس سے معاشی طور پر کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں؟ اس فلسفہ پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:

اعلم ان العدوان علی الناس فی اموالهم ذاهب بآمالهم فی تحصیلها و اکتسابها لما یرونه حینئذ من ان نمایتها و مصیرها انتهابها من ایدیهم و اذا ذهبت آمالهم فی اکتسابها و تحصیلها انقبضت ایدیهم عن السعی فی الاکتساب..... والعمران ووفوره ونفاق اسواقه انما هو بالاعمال وسعی الناس فی المصالح والمکاسب ذاهبین وجائین، فاذا قعد الناس عن المعاش وانقبضت ایدیهم عن المکاسب کسدت اسواق العمران۔ (مقدمہ ابن خلدون، فصل نمبر۳۶)

''جان لو! لوگوں کی جائیدادوں پر تجاوز کرنے سے مال کی تحصیل اور

اکتساب کی خواہش لوگوں کے دلوں سے جاتی رہتی ہے کیوں کہ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم جتنا بھی مال حاصل کر لیں، ہمارے ہاتھوں سے بہر حال چھین لیا جائے گا اور کسب مال کے بارے جب ان کی خواہش ٹھنڈی پڑ جاتی ہے تو کمانے کی سعی بھی نہیں رہتی، نیز یہ آبادی اور بازاروں میں مل چل فی الحقیقت لوگوں کو معاشی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، پس جب لوگوں میں یہ جدوجہد سرد ہو جاتی ہے اور ان کے ہاتھ کسب سے کھینچنے لگتے ہیں تو یہ آباد بازار ویران اور سنسان ہو جاتے ہیں۔''

خلاصہ بحث:

الغرض! کسی بھی شخص کی ملکیت، کسی زمین پر جائز طریقے سے ثابت ہو، تو اس سے یہ زمین بلا معاوضہ زبردستی چھین لینا قطعاً جائز نہیں، قرآن وسنت اور فقہائے کرام رحمہم اللہ کی تصریحات کی روشنی میں اس مؤقف کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ تو ایک ایسا نظریہ کہ جو قرآن وسنت اور اجماع امت کے ساتھ کھلم کھلا متصادم ہو، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ جیسی نادر روزگار شخصیت کہ فقاہت جن کے مزاج میں رچ بس چکی تھی کیسے اپنا سکتے ہیں، لہٰذا حضرت علیہ الرحمہ کا مؤقف سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس سے قبل چند باتیں تمہید کے طور پر جان لینا ازبس ضروری ہیں۔

مفتی صاحبؒ کا مؤقف:

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا کہ زمین یا کسی بھی جائیداد کے ملک میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ وراثت، عطیہ اور خرید وفروخت جیسے جائز طریقوں سے حاصل ہو، ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ جائیداد کی ملک ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا اگر کسی شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے فلاں جائیداد ناجائز طریقے سے حاصل کی ہے تو اسلامی حکومت تحقیق وتفتیش کے بعد یہ جائیداد اس سے لے کر اصل مالکوں کو

لوٹادے اور اگر مالک معلوم نہ ہوں تو بحق سرکار ضبط کرلے۔

پس اس اسلامی اصول کی روشنی میں حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ:

"قدیم زمینوں کے متعلق یہ تحقیقات کی جائیں کہ آیا یہ اراضی کسی جائز طریقے سے حاصل کی گئی تھیں یا انگریز نے بطور جاگیر کے حق الخدمت میں کسی کو عطا کی ہیں اور اگر ایسا ہے تو یہ اراضی فوری طور پر واپس لے کر، بے زمین لوگوں میں تقسیم کردی جائیں۔"

(ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۲۴ ستمبر ۱۹۶۹ء)

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہے کہ اگر یہ اراضی کسی جائز طریقہ سے حاصل کی گئی تھیں تو حضرت موصوف علیہ الرحمہ کو بھی اعتراض نہیں، حضرت نے ان زمینوں کے واپس لینے کی بات کی ہے کہ جو ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی تھیں، اور یہ مؤقف بلاشبہ احق بالصواب ہے

دلیل نمبر ا:

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا ایک واقعہ کتب تاریخ میں محفوظ ہے کہ آپ نے اپنے بعض گورنروں مثلاً حضرت عمرو بن العاص، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت حارث رضی اللہ عنہم کی ذاتی املاک میں سے آدھا حصہ ضبط کر کے بیت المال میں داخل کرلیا، وجہ یہ تھی کہ آپ کی رائے میں ان حضرات نے یہ جائیداد، اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے حاصل کی تھی، چناں چہ امیر المومنین کے دریافت کرنے پر جب ان حضرات نے بتلایا کہ ہم اپنی تنخواہ کی بچت سے ذاتی تجارت بھی کرتے تھے تو فاروق اعظمؓ اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور جواب میں صرف یہ فرمایا! کہ تم لوگوں کو وہاں بھیجنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تجارت کرتے پھرو" یہ کہہ کر جائیداد ضبط کرلی۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس عمل کی کوئی بھی توجیہ کرلی جائے تو بھی یہ اصول بہرحال ملتا ہے کہ سربراہ حکومت کی نظر میں، حصول جائیداد کے ذرائع اگر مشکوک ٹھہریں تو ایسی جائیداد کا ضبط کرلینا اس کے لیے جائز ہے، خواہ اس اصول کی زد میں آنے والے لوگ عمال حکومت ہی کیوں نہ ہوں۔

دلیل نمبر ۲:

اسی زریں اصول کی روشنی میں علامہ ابن فرحون مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ان للامام ان یاخذ من قضاته وعماله ماوجد فی ایدیهم زائد اعلی ماارتزقوه من بیت المال وان یحصی ما عندالقاضی حین ولایته ویاخذ منه مااکتسبه زائدا علی رزقه. (تبصرۃ الحکام لابن فرحون، جلد۲)

"امام کو حق ہے کہ اگر اپنے قاضیوں اور کارندوں کے پاس ایسا مال پائے کہ جو ان کی اس تنخواہ سے زاید ہو جو انھیں بیت المال سے ملتی ہے تو اس مال کو ضبط کرلے نیز اسے چاہیے کہ جب قاضی کا تقرر کرنے لگے تو اس کی جائیداد کا شمار کرلے اور آیندہ اس کے پاس اگر اس کی تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ مال نظر آئے تو اسے ضبط کرلے۔"

دلیل نمبر ۳:

نیز صاحب درمختار، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اسی مذکور فعل سے استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ان مصادرة السلطان لارباب الاموال لاتجوز الالعمال بیت المال مستدلا بان عمر رضی الله عنه صادر ابا هريرة. (ملاحظہ ہو درمختار، کتاب الکفالۃ)

''بلا معاوضہ صاحب مال لوگوں کی جائیدادیں ضبط کرلینا، سربراہ حکومت کے لیے جائز نہیں لیکن بیت المال کے کارندوں کے پاس اگر ایسا مال ہو تو اس کا ضبط کرلینا جائز ہے، دلیل اس کی سیدنا عمرؓ کا حضرت ابو ہریرہؓ کے مال کو ضبط کرنا ہے۔''

پاکستانی جاگیرداروں کی زمینیں:

پس مذکورہ بالا فقہی اصول وضوابط اور فعل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوا کہ مالی بے ضابطگی جس سے بھی سرزد ہو، اس کا سدباب ہونا ضروری ہے، سربراہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ صاحب اموال لوگوں کی چھان بین کرے اور اگر کسی شخص کے بارے میں ثابت ہوجائے کہ اس نے فلاں جائیداد ناجائز ذرائع اور بدعنوانیوں کے راستے سے حاصل کی ہے تو اسے ضبط کرلے یہی بات حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ ارشاد فرماتے تھے اور آج بھی اگر اس بات کو عملی جامہ پہنا دیا جائے تو تحقیق وتفتیش کے نتیجہ میں یہ حیران کن حقیقت منکشف ہوگی کہ اس مادر وطن پر برسر اقتدار جاگیردار طبقہ نے انہی ناجائز ذرائع کو استعمال کیا، جاگیریں بنائیں اور بالآخر آج یہ طبقہ اس سطح کو آپہنچا کہ وطن عزیز کے سیاہ وسفید کا مالک ہے، انا ولا غیری کا فرعونی نعرہ لگاکر، غریب عوام کے ساتھ وہی سلوک کررہا ہے جو صدیوں پہلے اس کے روحانی باپ نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا، ایسے وقت میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی آواز، صدائے موسیٰ کی وہی بازگشت ہے، جس نے اس خدا کے باغی کو للکارا تھا، مفتی صاحب رحمہ اللہ بھی اپنے وقت کے فرعونوں کو للکارتے رہے، ان کی جائیدادیں ضبط کرنے پر اصرار کرتے رہے آپ چاہتے تھے کہ سنت فاروقی زندہ ہو، معاشی ناہمواری ختم ہوجائے اور اہالیان وطن اپنی آنکھوں سے اس خوش حالی دامن کا مشاہدہ کریں جس کی نوید قرآن حکیم نے وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا کے مسحور کن الفاظ سے دی ہے، آپ کے یہ الفاظ کتنے حقیقت پسندانہ ہیں۔

''بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ جو لوگ دس کروڑ بھوکے عوام کے مسائل کو حل کیے بغیر یہ سمجھتے ہیں کہ چند سرمایہ داروں سے امن قائم ہوجائے گا وہ جنت الحمقاء میں بستے ہیں، غریبوں کے مسائل حل کیے بغیر نہ پاکستان ترقی کرسکتا ہے اور نہ کوئی مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔''

(ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۔ ۲۷ر ستمبر ۱۹۶۹ء)

☆ ☆ ☆

مسئلہ مزارعت

نفس مزارعت جائز ہے:

مزارعت کا معاملہ فی نفسہ ایک جائز اور مفید معاملہ ہے، اس میں زمین دار، کاشت کار دو فریقوں کی طرح ہوتے ہیں اور دونوں کی حیثیت مساوی ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ معاہدہ اگر نیک نیتی سے کیا جائے تو زمین دار، کاشت کار کا آپس میں یہ باہمی تعاون، ہمدردی وغم خواری کی ایک بہترین شکل ہے چناں چہ زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی یہ معاملہ بین الناس جاری رہا، مہاجر صحابہ کرامؓ اپنے انصاری بھائیوں کی زمینوں پر بحیثیت کاشت کار، سال ہا سال تک کام کرتے رہے اور اس کی اجازت خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرحمت فرمائی تھی، ازاں بعد یہی معاملہ آپ نے اہل خیبر کے ساتھ کیا اور آپ کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق وسیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس معاملہ کو اسی طرح باقی رکھا، چناں چہ فی نفسہ یہ معاملہ بالکل جائز ہے۔

مفتی صاحب کا موقف:

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ فی زمانہ اس معاملہ کو ناجائز خیال فرماتے تھے موجودہ حالات میں، حضرت قدس سرہٗ کا موقف یہ تھا کہ اسلامی حکومت، ضرورت کے تحت مزارعت کے سسٹم کو ناجائز قرار دے، اپنے اس موقف کی حمایت میں حضرت فرماتے تھے کہ:

''امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ تینوں امام اس بات پر متفق ہیں کہ مزارعت کا معاملہ جائز نہیں، پس چوں کہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، ائمہ میں اختلاف رہا ہے، اس لیے ضرورت کے تحت اس کو ممنوع قرار

دینا، کسی بھی طرح قابل اعتراض نہیں ہوسکتا۔''

(اخبار جہاں کراچی، ۲۴ستمبر ۱۹۶۹ء)

پس حضرت علیہ الرحمہ کے اس بیان کی روشنی میں مسئلہ مزارعت کے بارے قدرے تفصیل سے گفتگو کی ضرورت ہے۔

مزارعت سے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا مسلک:

واضح رہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں یہ بات مشہور کر دی گئی کہ آپ کے نزدیک مزارعت کا معاملہ مطلقاً ناجائز ہے، اور اس بات کو اس قدر شہرت ملی کہ صاحب ہدایہ جیسی شخصیت (جو کہ مسلک احناف میں ایک مستند ومعتبر نام ہے) نے دوٹوک الفاظ میں لکھ دیا کہ لاتجوز المزارعة والمساقاة عند ابی حنیفة، مزارعت اور مساقات دونوں عقد امام ابوحنیفہ کے نزدیک ناجائز ہیں۔

(ہدایہ باب المزارعۃ)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت الامام کے بارے یہ شہرت کہ آپ عقلاً مزارعت کو مطلقاً ناجائز اور ممنوع فرماتے ہیں، درست نہیں، صحیح بات وہ ہے جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب حاوی القدسی میں بیان کی گئی کہ:

وكرهها ابوحنيفة ولم ينه عنها اشد النهي.

(حاوی القدسی از فیض الباری)

''یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مزارعت کو ناپسند کیا مگر سختی کے ساتھ اس سے منع نہیں فرمایا تھا۔''

پس معلوم ہوا کہ حضرت الامام رحمہ اللہ کا مسلک مزارعت کے عدم جواز کا نہیں، حاوی القدسی کے اس قول کی ترجیح دو باتوں سے ہوتی ہے۔

(۱) مزارعت کے بارے، بہت ساری جزئیات ہیں جو امام موصوف رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہیں، ظاہر ہے کہ ایک چیز جوان کے مسلک میں مطلقاً ناجائز ہے اس

کے بارے میں تفصیلات وجزئیات بیان کرنے کی کیا ضرورت، معلوم ہوا کہ حقیقت وہ نہیں جو مشہور کی گئی۔

(۲) مزارعت کے باب میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث مختلف ہیں، بعض سے مزارعت کا جواز اور بعض سے عدم جواز معلوم ہوتا ہے، ذخیرۂ احادیث میں اگر خوب جانچ پڑتال کی جائے تو تقریباً تین راوی ایسے ملتے ہیں کہ جن کی روایات سے مزارعت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے اور وہ تینوں یہ ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ

علاوہ ازیں ممانعت کی جو روایات حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مروی ہیں وہ فی الحقیقت انہی اصحاب ثلاثہ کی تائید وتوثیق کرتی ہیں، لہٰذا انھیں مستقل طور پر الگ سے شمار نہیں کیا گیا۔

ممانعت کی جتنی بھی روایات ہیں ان پر اگر غور کیا جائے تو ایک بات بڑی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس مزارعت کو ناجائز قرار نہیں دیا بلکہ مزارعت کی وہ خاص صورتیں جن کا نتیجہ صاحب زمین اور کاشت کار کے مابین باہمی نزاع وفساد کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا، آپ نے ان سے منع فرمایا مثلاً

(۱) معاملہ کرتے وقت صاحب زمین کا کسی خاص حصے کی پیداوار کو متعین کردینا کہ یہاں کی پیداوار میرے لیے۔

(۲) یا پیداوار کا کچھ حصہ مستثنیٰ کرکے بقیہ پر معاملہ کرنا مثلاً پیداوار میں سے اتنے من صاحب زمین کا اور بقیہ میں شراکت۔

(۳) یا اس شرط پر معاملہ کرنا کہ نہر اور نالیوں کے قریب والی زمین کی پیداوار صاحب زمین کی ہوگی بقیہ کاشت کار کی۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں میں چوں کہ ایک فریق کی حق تلفی لازمی ہے، لہٰذا جناب

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمام صورتیں ممنوع قرار دے دیں اور جن صورتوں میں باہمی مناقشت اور حق تلفی کے اندیشے موجود نہیں انھیں ناجائز نہیں فرمایا، پس جب صورت حال یہ ہے تو حضرت امام اعظم رحمہ اللہ نفس مزارعت کو ممنوع کیوں کر فرما سکتے ہیں؟ اس صورت میں کہ جب ہمارے پاس حضرت الامامؒ کے دو قول موجود ہیں تو اس قول کو کیوں نہ ترجیح دی جائے جو احادیث کے زیادہ قریب اور دلائل کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے نیز اس طرح احادیث رسول میں مطابقت کی صورت بھی نکل آتی ہے جو کہ فقہ حنفی کا طرۂ امتیاز ہے۔

اب آتے ہیں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے مؤقف کی جانب! حضرت مفتی صاحب ”موجودہ حالات میں مزارعت کے پورے سسٹم کو ناجائز وممنوع قرار دینے کی بات فرماتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مزارعت کی وہ صورت بھی کہ جس میں مذکورہ بالا تینوں ممنوعہ شکلیں موجود نہیں ہیں، موجودہ حالات میں ناجائز قرار دینا چاہیے۔

بظاہر حضرت کا یہ مؤقف بلاشبہ احادیث رسول سے متصادم نظر آتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاص صورت کو ممنوع نہیں فرمایا۔ لیکن واضح رہے کہ مزارعت کے مسئلہ میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی اپنی ایک منفرد رائے تھی، جس میں اجتہادی رنگ نمایاں تھا، حضرت علیہ الرحمہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ:

”اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کی جن صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے، اگر ان میں غور کیا جائے تو اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ان تمام صورتوں میں کاشت کار کی حق تلفی ہوتی تھی، پس کاشت کار کے اس استحصال کی وجہ سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کی ایسی تمام صورتیں ناجائز فرما دیں۔“

گویا ان صورتوں کے عدم جواز کی علت کاشت کاروں یا کسی بھی فریق کا استحصال وحق تلفی ہے، پس موجودہ حالات میں جب کہ سسٹم ہی کچھ ایسا ہے کہ زمین

داروں کی بدعنوانیوں پر قابو پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، کاشت کار کی نہ صرف یہ کہ حق تلفی ہوتی ہے بلکہ اس کی عزت بھی محفوظ نہیں، زمین دار اسے اپنا غلام سمجھتا ہے تو ان حالات میں مزارعت کو ممنوع قرار دے دینا کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں، قرونِ اُولیٰ کے اس دور میں امدادِ باہمی کی یہ شکل ایسی نہ تھی کہ کسی کاشت کار کے ساتھ ظلم و زیادتی کا اندیشہ کیا جاتا، بلاشبہ فی نفسہٖ مزارعت نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ زمین دار کاشت کار کا ایک دوسرے کے ساتھ یہ باہمی تعاون، ہمدردی و غم خواری کی ایک بہترین شکل ہے لیکن اگر کوئی زمین دار محض ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لیے یہ معاملہ کرے (جس کا لازمی نتیجہ کاشت کار کا استحصال ہے) اور کاشت کار کی مجبوری و بے بسی اس کے لیے زیادتی دولت کا باعث ٹھہرے یا اس کی مفلوک الحالی اس کی خوش حالی کا ذریعہ ہو تو جبر کے ان حالات میں اسلام قطعاً مزارعت کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ ایسے حالات میں فقہ اسلام کا ضابطہ یہ ہے:

فلهذا ينبغي تحذير الناس من المزارعة التي يترتب عليها حرمان العادل من كده و استغلال المالك اياه لحاجة. (عالم گیری)

''مزارعت کی ان شکلوں سے منع کر دینا ہی مناسب ہے جو کاشت کاروں کو ان کی محنت کے پھل سے محروم کر دیں اور صاحب زمین کو کاشت کار کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کریں۔''

اسلام نے مزارعت کی جن صورتوں کو ناجائز قرار دیا ان کا فلسفہ ہی یہ تھا کہ ان میں کسی ایک کی حق تلفی یا دو فریقوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر کسی بھی حیثیت سے فوقیت یا برتری حاصل نہ ہو، اس بارے میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا یہ قول بھی قابل ذکر ہے، فرمایا:

وهو عندي جائز على ما اشترط عليه على ما جائت به الآثار. (کتاب الخراج لابی یوسف)

''میرے نزدیک مزارعت انہی شرائط کے ساتھ جائز ہے جو آثار سے ثابت ہیں۔''

خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے دور میں پیش آنے والے انہی خطرات اور اندیشوں کے پیش نظر صحابہ کرامؓ کو مفت زمین دینے کی جانب ترغیب دلائی تھی، یعنی اس کا معاوضہ وصول ہی نہ کیا جائے، کرایہ کی شکل میں نہ ہی بٹائی کی صورت میں، چناں چہ آپ نے فرمایا:

من كانت له ارض فليزرعها او يمنحها اخاه.

(مسلم وابوداؤد وغیرہ)

''جس شخص کے پاس زمین ہو وہ خود اس میں زراعت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دے دے۔''

پس حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا یہ موقف موجودہ حالات کے مطابق تھا اور یوں بھی مزارعت کو اسلام نے جائز تو کہا ہے لیکن اسے فرض یا واجب قرار نہیں دیا نہ ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی ایسا مثالی طریقہ تجویز کیا ہے کہ اسے بہر صورت باقی رکھنا ضروری تصور کیا جائے بلکہ اسے مثالی طریقہ قرار بھی کیسے دیا جا سکتا ہے کہ جس میں بقول حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ:

''ایک عام مسلمان تو محنت کرنے کے باوجود، اپنے بچوں کا پیٹ بھی نہ پال سکے، بھوک اور فاقے کی زندگی گذارتا رہے، جب کہ چند انسان یہاں خرمستیاں کرتے پھریں، اسلام کی روح تو یہ ہے کہ جیسے سیدنا فاروق اعظمؓ نے فرمایا تھا: ''لو مات كلب على شاط الفرات جوعا، لكان عمر مسئولا عنه يوم القيامة. ''یعنی اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے دن اس کے متعلق بھی عمر سے باز پرس ہوگی۔''

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين.

تذکارِ محمود

۱۰

عربی زبان پر عبور
اور
ادیبانہ حیثیت

مولانا لطافت الرحمان صاحب
جامعہ احسن العلوم ۔ کراچی

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۱۰)

"حضرت مرحوم، عام علوم وفنون کے علاوہ عربی ادب کے بھی ماہر تھے اور عربی زبان کے استعمال اور عربی میں گفتگو پر ان کو امتیازی قابو اور عبور حاصل تھا، اور مصر وحجاز کے علما تک ان کی عربی دانی اور عربی تحریر وتقریر کی روانی اور صحت وفصاحت کا اعتراف کرتے رہے ہیں، حال آں کہ بعض علمائے عرب، علمائے عجم کے فضل وکمال کا اعتراف نہیں کرتے ہیں۔"

حضرت مفتی صاحب مرحوم جہاں محدث عظیم تھے تو ساتھ ہی زبردست عربی ادیب بھی تھے، کیوں کہ "عربی ادب" کا جاننا، ہر محدث وعالم کے لیے ضروری ہے، اس لیے کہ قرآن کریم اور احادیث کے افہام وتفہیم میں اس کا بڑا دخل ہے، اور اس بات کا اندازہ اس قول سے بھی ہوتا ہے جو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہے:

انہ قال علیکم بدواوین العرب فانها تعلمکم القران.

"اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ عربی دیوانوں کو پڑھو، سیکھو، یہ تم کو قرآن کے علم میں مددگار ثابت ہوں گے۔"

خلاصہ یہ کہ حضرت مرحوم، عام علوم وفنون کے علاوہ عربی ادب کے بھی ماہر تھے اور عربی زبان کے استعمال اور عربی میں گفتگو پر ان کو امتیازی قابو اور عبور حاصل تھا، اور مصر وحجاز کے علما تک ان کی عربی دانی اور عربی تحریر وتقریر کی روانی اور صحت و فصاحت کا اعتراف کرتے رہے ہیں، حال آں کہ بعض علمائے عرب، علمائے عجم کے فضل وکمال کا اعتراف نہیں کرتے ہیں، مگر پھر بھی

ومليحة شهدت لها ضراتها

والفضل ما شهدت به الاعداء

"اور بسا اوقات ایک خوب صورت عورت کے حسن کی گواہی، اس کی سوکن بھی دیتی ہے اور دراصل فضل وکمال وہ ہوتا ہے جس کا اعتراف دشمن کو بھی کرنا پڑے۔"

یہ بھی حقیقت ہے کہ مرحوم کتب و مطالعہ اور علم و معلومات کے حصول میں منہمک رہا کرتے تھے، اور عربی ادب کی مہارت تو ان کی ایک علمی ذوق اور صفت تھی، جب کہ علمی طلب و جستجو، درس و مطالعہ، علمائے کبار کا مشغلہ رہتا ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں

ہیچ گہہ ذوق طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ مے چیدم درآں روزے کہ خرمن داشتم

مرحوم کی معیاری عربی:

اگرچہ مفتی صاحب مرحوم کثیر التصنیف عالم تو نہ تھے، تاہم آپ کے قلم جواہر رقم سے عربی شروح و حدیث پر مختلف کتابوں کی عربی تقریظات اور تحریرات موجود ہیں، جن میں سے ایک عربی کتاب بنام ''المتنبی القادیانی'' بھی ہے جو استنبول ترکی میں چھپ گئی ہے، جس کا ایک مختصر اقتباس درج ذیل کرتا ہوں، کیوں کہ یہ مرحوم کے عربی ادیب ہونے کا ایک وثیقہ ہے اور رد قادیانیت کے بارے میں مرحوم کی یادگار، جو مرحوم کی یاد دلاتا ہے۔

قالت الخنساء

یذکرنی طلوع الشمس صخرا
واذکرہ بکل مغیب شمس

''یعنی طلوع آفتاب مجھے صخر (شاعرہ کا متوفی بھائی) کی یاد دلاتا ہے اور میں اس کو ہر غروب آفتاب کے وقت بھی یاد کرتی ہوں۔''

اقتباس:

مندرجہ ذیل ہے:

وکنت متحیرا فی ان الرجل المتملق الذلیل بین

ابدی الانکلیز یسب سیدنا عیسی علیہ السلام لانی کنت اظن ان ھذا السب ھو السبب القوی لسخط الفرنجیین العیساسئین فکیف یباشرہ ھذا الذی ھو مھین. ثم انی ظفرت علی مکتوب مندرج فی تالیفہ ''تریاق القلوب'' صفحہ ۳۰۸ کتبہ ھذا المتنبی الی الحکومۃ البریطانیہ فی ذالک الوقت وعنونہ باقتراح العاجز الی حضرۃ الحکومۃ العالیۃ فازاح عنی ھذا المکتوب ما اجدہ واظہر ھذا المتنبی ان بذاتہ وسبہ فی حق سیدنا عیسی علیہ السلام حکمہ عملیہ وناعیہ سیاسیہ یرید بہ ایراد غضب عامہ الملمین علی الافرنجین لاسما المبشرین منھم.

(بحوالہ ''المتنبی القدیانی'' من کتاب ھدیۃ المھدیین صفحہ ۱۴ طبع استنبول ترکی)

''اور میں اس بارے میں حیران تھا کہ یہ خوش آمدی اور ذلیل آدمی انگریز کے سامنے کس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گالی دیتا ہے، جب کہ میرا یہ گمان تھا کہ اس طرح کرنا اقوی سبب ہے فرنگی کو ناراض کرنے کا، تو یہ ذلیل آدمی کس طرح یہ کام کرتا ہے، پھر مجھے اس کی ایک تصنیف ''تریاق القلوب'' صفحہ ۳۰۸ پر ایک خط ملا، جس میں اس جھوٹے بناوٹی نبی نے حکومت برطانیہ کو اس وقت لکھا تھا، اور اس کا عنوان یہ تھا کہ ''یہ ایک عاجز کی عرض داشت ہے حکومت عالیہ سے'' اس خط نے میرے دل سے وہ اشتباہ رفع کیا، جس کو میں محسوس کر رہا تھا اور صاف معلوم ہوا کہ اس جھوٹے نبی کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہرزہ گوئی ایک حکمت عملی اور سیاسی باعث کے تحت تھی کہ اس کے ذریعہ سے عامۃ

المسلمین کے اس غیض وغضب کو ٹھنڈا کرتا تھا جو مسلمانوں کو فرنگیوں پر اور خاص کر ان کے مبشرین پر ہوتا تھا۔''

اسی طرح ذیل میں حضرت مفتی صاحب کا یہ عربی ادبی قصیدہ ہے جو ان کے ادیب ہونے کی ایک جھلک ہے یہ قصیدہ مرحوم نے ۱۹۵۳ء کو ملتان جیل میں لکھا تھا جسے الفاروق شمارہ ماہ شوال وذی قعدہ، ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ صفحہ ۱۵ پر شائع کیا۔

قصیدہ یہ ہے:

وانی فی دارهنا مسكن اللذى
اعان على اعلاء دين مقوم
ففيها ابن اسرائيل يوسف نازل
عليه سلام الله ليس باجذم
وقد سكنت فيها ائمه ديننا
وفيها ابوفقه كثير التكرم
وفيها ابن تيميه تراه موثقا
مقام كريم اشجع متلثم
وشيخ ب "سرهند" المبارك منزلا
بها صار شيخا قطب فضل معمم
هناك رشيد جاء بالفضل والعلى
وعرف محمود هناك بضغم
كفايه مولانا وفخر زماننا
فكل سما فيها مدارج سلم
وفيها حسين احمد تراه توطنا
لذاك تراه اليوم خير ميمم
وفيها قضى عمرا امير شريعه

وفيها امام الهند جا يتقدم
فلولا ارى فيها مآثر سارةً
ولولم اظن الدار دار تنعم
ولولم اجد فيها معارج ذروة
ولم ارتقب فيها حصول التكرم
ولو ارج فيها النيل نيل سعادة
ولم انتظر فيها نزول الترحم
ولم احتسب ذاك الودود فريضه
رضا لنبي ماجد ومكرم
وحفظا لدين قيم واماطتهِ
لكذب رجيم خادع وغليم
فلولم يكن ها ذاك ماسرت نحوها
بقلب حريص مشرئب متيم
ولم افترق اهلى وداری بساعة
ولم ادخل البيت المقفل فاعلم
ولم ترنى المحبوس في السجن لحظةً
وكنت معيا بالرفيق المعظم
وما كنت في رمضان مونس غربه
ولم تدر ما حال الاسير الجمجم
ولم ترنى قاسيت كابة عزلة
وما كان لحظى دفعه بمحرم
وما كان فى قلبى حريق تشوق
وما كان جسمى للعدى بمسلم

فارجو الکریم الرب حسن تقبل
عسی اللہ یطنابہ خیر مقدم

علم وسیاست:

حضرت مفتی صاحبؒ جہاں فقیہ، محدث اور عربی زبان کے ادیب تھے، وہاں وہ سیاسی میدان کے بھی زبردست شہ سوار اور اپنے اسلاف کبار مثلاً شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مدنی رحمہ اللہ کے جانشین تھے، فرق صرف اتنا ہے کہ ان بزرگوں نے برطانیہ کی جابر وقاہر حکومت کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کردیا اور مرحوم نے اپنے دور وزارت میں مملکت پاکستان کے غیر اسلامی نظریات کو یا تو نکال دیا یا ان کی بنیادوں کو کھوکھلا کردیا۔

ایں کار از تو آمدو مرد آن چنین کند

غرض یہ کہ مرحوم بیک وقت عالم جلیل، علوم عربیہ کے ماہر اور عظیم سیاست دان تھے اور اگر وہ اس طرح جامع الکمالات، مرد قلندر اور سیاست کے شیر ببر نہ ہوتے تو سرحد جیسے بارودی صوبے کے وزیر اعلیٰ کس طرح بنتے، جنھوں نے سرحد اسمبلی میں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔

صوبہ میں ام الخبائث کو ممنوع قرار دیا وغیرہ وغیرہ، جب کہ مملکت پاکستان کے ہر دور میں دین اسلام کا کوئی کام کرنا، اکبر الہ آبادی والی بات ہے جو کہہ چکے ہیں کہ

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مفتی صاحب سے میرا سابقہ:

مرحوم سے میرا سابقہ دو چار ملاقاتوں پر محدود ہے اور خود دیدو شنید کے علاوہ

موصوف کے حالات وخیالات اوصاف وکمالات اور خاص طور عربی ادب اور عربی زبان کے ادیب کامل اور تمام علوم وفنون کے حامل ہونے کی باتیں میں نے حضرت مولانا زر ولی خان صاحب رئیس الجامعۃ العربیہ احسن العلوم سے سنی ہیں، کیوں کہ جس دور میں مفتی صاحب، مولانا بنوری صاحب اور مفتی شفیع صاحب (مرحومین) کی یک سہ رکنی محفل جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں جمتی تھی اور اس میں علوم ومسائل کے دریا بہتے تھے اسی دوران میں مولانا زر ولی خان صاحب مدرسہ بنوری ٹاؤن میں زیر تحصیل تھے، فرماتے ہیں کہ ان تینوں اماماں علوم وادب میں جب عربی میں گفتگو ہوتی تھی تو بقول مولانا شیر علی شاہ صاحب مدنی، مفتی صاحب مرحوم کی عربی گفتگو فائق ہوتی تھی۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

دلیل عمومی:

حضرت مفتی صاحب مرحوم کے عربی ادیب ہونے کی ایک عمومی دلیل یہ بھی ہے کہ تمام محدثین کرام چاہے عجمی کیوں نہ ہوں، وہ عربی ادب کے بھی شیوخ وائمہ ہوتے ہیں مثلاً صاحب قاموس مجد الدین فیروز آبادی امام الفقہ والادب تھے اور ساتھ ہی محدث عظیم بھی۔ انھوں نے اپنے شیخ الحدیث علامہ ابن جہبل سے اپنے سند حدیث کو متصل کرنے کے لیے صحیح مسلم صرف تین نشستوں میں ان کو جامع دمشق میں سنائی۔ فرماتے ہیں۔

قرات بحون اللہ جامع مسلم
بجوف دمشق الشام جوف لاسلام

''میں نے اللہ کی توفیق سے جامع مسلم کو پڑھا، شام کے دمشق کی فضا میں،
جو اسلام کی فضا ہے۔''

علی ناصر الدین الامام ابن جهبل
بحضرة حفاظ مشاهیر اعلام

"ناصر الدین امام ابن جہبل کے سامنے، مشہور علما و حفاظ کی موجودگی میں۔"

وتم بتوفیق الا لہ وفضلہ
قراءة ضبط فی ثلثة ایام

"اور اللہ کی توفیق اور فضل سے، تین دن میں قراۃ ضبط مکمل ہوگئی۔"

اور یہ صاحب قاموس عربی ادب کے اس قدر عظیم امام تھے کہ انھوں نے اپنی طرف منسوب ایک شعر میں فارسی الفاظ کو لغۃ الیمن والے چشمانہ و مژگانہ سے بلند و بالا اور بہتر اسلوب ترکیب دے کر فرمایا ہے

ان الا ناگیر ساهت بعدما سبزت
واشر ورنت بعدما کانت تراشیشا

اس بیت میں انگور کی جمع اناگیر اور لفظ سیاہ کو ماضی بنا کر ساہت کر دیا، اور لفظ سبز کو بھی ماضی بنا کر سبزت کر دیا، اور لفظ شیریں کو افعوعل ثلاثی مزید فیہ بنایا اور لفظ ترش کو صیغہ منتہی الجموع بنا کر تراشیش کر دیا، فللّٰہ درہ ثم للہ درہ

اب میں اس مقالے کا اختتام اس عربی قصیدہ پر کرتا ہوں جو میں نے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مرثیہ میں کہا ہے، قصیدہ دالیہ ہے، بحر بسیط کے ضرب اول سے ہے اور قافیہ متواتر ہے۔

القصیدہ الرثائیہ:

واحسرتا فزعیم القوم مفقود
وذالك العالم المغفور محمود

"افسوس کہ قوم کے عظیم راہ نما موجود نہیں رہے اور وہ مرحوم و مغفور عالم،

مفتی محمود تھے۔"

قد کان جامع علم والتقی وهدی
وفیہ حسن وقار العلم موجود

"وہ علم و تقویٰ اور راہ نمائی کے اوصاف کا سرچشمہ تھے اور ان میں علمی وقار مکمل طور پر موجود تھا۔"

فسودد وجلال والمروة من
اوصافه وهو فی الاقرن محسود

"پس سرداری اور جلال و مروت ان کے اوصاف تھے اور ان کے حریف ہم عصر ان سے حسد کرتے تھے۔"

قدفاق مجدا وفضلا فی مناقبه
علی الجمیع ففیهم ذاك مسعود

"وہ مجد و بزرگی اور کمالات میں تمام پر فائق تھے اور سب میں سعادت مند تھے۔"

قد کان یحوی علوم الشرع ان له
محامد ومزایا والله مسجود

"وہ علوم شرعیہ پر کامل عبور رکھتے تھے اور دوسرے اوصاف و خصوصیات کے حامل تھے اور خدا ہی ان کا مسجود تھا۔"

فذاك حبر وحید فی فضائله
مفکر لرفاه القوم مشهود

"وہ ایک عالم جلیل تھے اور اپنی فضیلتوں میں یکتا تھے، قومی سہولتوں کے لیے فکر مند رہا کرتے تھے۔"

ان الفقید وزیرا کان فی حشم
وحکمة هیبة یقفوهما جود

''موصوف بڑی حشمت وہیبت اور جود وسخاوت کے اوصاف کے حامل وزیر رہے تھے۔''

فالمفتی الحر مولانا وقدوتنا
والمفتی الحر مدفون و مجهود

''پس وہ شریف انسان مفتی محمود ہمارے مولانا اور پیشوا تھے اس وقت وہ مدفون اور رحمت زدہ ہیں۔''

ینوبه ابنه فی کل معرکه
ففضل رحمان نعم النجل مولود

''ہر میدان میں ان کے صاحب زادے ان کی نیابت کرتے ہیں گویا فضل الرحمن صاحب ان کے اچھے بچے اور اچھی اولاد ہیں۔''

اقام موتمرا فیه القلیل من ال
مفاخر للمحمود معدود

''انھوں نے ایک کانفرنس مرتب کی جس میں مفتی صاحب کے تھوڑے سے مفاخر کو گنا گیا۔''

وذکر اسلاف قوم دیدن لهم
فهم بعظمة عزم فی الدنی نودو

''اور کسی قوم کا اپنے اسلاف کو یاد کرنا ان کا قومی دستور رہا ہے اور سب اسلاف عظمت وعزیمت سے پکارے جاتے ہیں۔''

والحق ان لمولانا العظیم بنا
لحق ذکر له والذکر ممدود

''اور حق یہ ہے کہ مولانا مرحوم کا ہم پر، مسلسل اور طویل طور پر یاد کرنے کا حق ہے۔''

مولی کریم جلیل القدر ذوهمم
مفتی مسائل دین الله مودود

''وہ ایک شریف جلیل المرتبہ اور عظیم الہمت بزرگ تھے، مسائل دین کے مفتی اور رب کے پسندیدہ تھے۔''

حر شریف سمی الشان منهله
من المناهل مود و مورود

''وہ آزاد منش شریف اور بلند انسان تھے ان کی سیر گاہ سے آنے جانے والے تمام لوگ سیراب ہوئے تھے۔''

هو المحدث والمفتی ولیس له
باب من العلم مشدود مسدود

''وہ محدث اور مفتی تھے اور ان کے لیے علم کا کوئی دروازہ بندھا ہوا اور بند نہ تھا۔''

لکنه فات والاموات نذکرهم
فالناس باکون والمرحوم مود

''مگر وہ فوت ہوگئے اور ہم اپنے مردوں کو یاد کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ روتے ہیں اور مرحوم آسودہ ہیں۔''

والموت غایة حی کیف ماکانا
وابن ماکان فالانسان ملحود

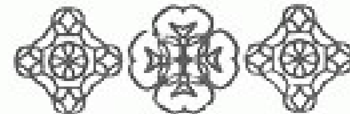
''اور موت ہر جان دار کا انجام ہے جیسا بھی ہو اور جہاں بھی ہو، انسان کو لحد میں دفن ہونا ہے۔''

ان السبوزیم نعم المحفل الحاوی
علی تذکر من فی الناس محمود

’’مفتی محمود میموریل میوزیم بہت اچھی محفل ہے اور اس شخص کے بار بار یاد کرنے پر یاد کرنے پر حاوی ہے جس کی تمام لوگ تعریف کرتے ہیں۔‘‘

ثم اللطافة عبد مذنب و به
حبل الذنوب محيط ثم مشدود

’’پھر لطافت الرحمن ایک گناہ گار بندہ ہے جس پر گناہ کی رسی محیط اور بندھی ہوئی ہے۔‘‘



خدمات

مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم ۱۹۹۶ء

تذکارِ محمودؒ

۱۱

مفتی محمودؒ بحیثیت صحافی

مولانا سخی داد بے نوا خوستی

ژوب۔ بلوچستان

مفتی محمودؒ اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۱۱)

''لسانیات میں مفتی صاحبؒ کو ایسی مہارت تھی کہ پانچ زبانوں میں آپ بغیر تکلف کے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتے تھے خصوصاً عربی و اردو میں جب بیان کرتے تو کسی کے وہم میں بھی یہ نہ گذرتا کہ یہ ان کی مادری زبان نہیں، غرض یہ کہ معیاری صحافت کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب مفتی صاحبؒ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس لیے آپ کی تحریر دلچسپ ہوتی تھی جس سے قاری مطمئن ہو جاتا تھا جو لوگ دل میں خدشات کے سمندر رکھتے تھے وہ بھی جب آپ کا بیان پڑھتے تو سارے خدشات زائل ہو کر تشفی ہوتی۔''

اللہ جل جلالہ نے حضرت مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ علیہ کو بہت سی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں جن کی بنا پر وہ جامع صفات شخصیت کے مالک تھے وہ بیک وقت حافظ بھی تھے، قاری بھی، مفسر بھی، محدث بھی، فقیہ بھی، مفتی بھی، مجاہد بھی، مبلغ بھی، مدرس بھی، مرشد بھی، بے لاگ مقرر بھی، حوصلہ مند لیڈر بھی، مفکر اسلام بھی، بین الاقوامی سیاست دان بھی، قائد عوام بھی، راہ نمائے علما بھی، اور حلم و وفا، عفت و حیا، صبر و تحمل، تواضع و انکساری، استقلال و استقامت، بہادری و اصول پرستی کے تو گویا وہ ایک مجسمہ تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ میں یہ مذکورہ صفات اتنے کمال کے ساتھ موجود تھیں کہ اگر تفصیل کے ساتھ ضبط کی جائیں تو ہر ایک صفت کے لیے الگ دفتر کی ضرورت پڑے گی لیکن یہاں صرف ان کی صفت صحافت کا تذکرہ ہوگا۔

مولانا موصوفؒ کی صحافت پر تفصیلی تبصرہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صحافت کی تعریف ارتقا، تاریخ، ضرورت، اور معیار کا اجمالی تذکرہ کیا جائے تاکہ صحافت سے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم کماحقہ یہ اندازہ لگا سکیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا صحافیانہ پہلو کتنا درخشاں تھا۔

صحافت کسے کہتے ہیں؟

صحافت اور صحافی عربی زبان کے الفاظ ہیں جو صحیفہ سے ماخوذ ہیں اور صحیفہ کے معنی ورق یا چھوٹی کتاب کے ہیں جن کی جمع صحف ہے جیسے قرآن مجید میں صُحُفٌ مُکَرَّمَۃ اور صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ وَمُوْسٰی آیا ہے مگر جدید عربی و اردو میں صحافت

اخباری کاروبار اور صحافی اخبار نویس کو کہتے ہیں اور انگریزی میں صحافت کو جرنل ازم اور صحافی کو جرنلسٹ کہتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے ہر اس صاحبِ قلم کو صحافی کہتے ہیں جو وقایع، احوال اور پیغامات لوگوں تک تحریر کے ذریعے پہنچاتے ہیں خواہ وہ خط کی شکل میں ہوں یا تصنیف کی صورت میں مگر اصطلاح میں صحافی اس آدمی کو کہتے ہیں جس کا تعلق اخبار و رسائل سے ہو خواہ مدیر ہو یا نمائندہ، انچارج ہو یا ترتیب دہندہ مضمون نویس ہو یا کالم نگار ان سب پر صحافی کا اطلاق ہوتا ہے۔ چوں کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے مکاتیب بھی ارسال کیے ہیں اور کتابیں بھی لکھی ہیں اور مضامین و اداریے بھی تحریر فرمائے ہیں اس لیے لغت و اصطلاح دونوں کے اعتبار سے وہ صحافی ہیں۔

صحافت کا ارتقاء:

قدیم زمانے میں نہ پریس تھا نہ بجلی نہ ڈاک کے انتظامات تھے نہ موجودہ دور کی مشینی سواریاں اس وقت حالات وواقعات سے لوگوں کو مطلع کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ پیغام و اخبار کو ہاتھ سے لکھ کر رقعہ کی صورت میں بھیجتے، قرآن پاک میں حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک مکتوب کا ذکر ہوا ہے جو انھوں نے ہدہد کے ذریعے بلقیس کو بھیجا تھا۔ اور کتب احادیث میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات گرامی بہت اہتمام کے ساتھ محفوظ ہیں۔ آپ نے صحابہ کرامؓ کے ہاتھ سلاطین و زعماء کو جو خطوط برائے دعوتِ اسلام ارسال فرمائے ہیں ان کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

(۱) مکتوب گرامی بدست عمرو بن عبسہؓ ضمیری بنام نجاشی شاہ حبشہ۔

(۲) مکتوب گرامی بدست دحیہ کلبیؓ بنام قیصر شاہ روم۔

(۳) مکتوب گرامی بدست شجاع بن وہبؓ بنام کسریٰ شاہ فارس۔

(۴) مکتوب گرامی بدست حاطب بن ابی بلتعہؓ بنام مقوقس شاہ اسکندریہ۔

(۵) مکتوب گرامی بنام بکر بن وائل۔

(۶) مکتوب گرامی بہ اہل نجران۔

(۷) مکتوب گرامی بنام بنی جذامہ، تفصیل...... حیاۃ الصحابہ جلد اول صفحہ ۱۲۵،

بعد میں شعبہ ڈاک وجود میں آیا پھر لیتھو پریس اور ازاں بعد خودکار مطبع ایجاد ہوا اور اب کمپیوٹر کا زمانہ ہے اسی وجہ سے پہلے زمانے میں جو کام مہینوں میں ہوتا تھا وہ اب دنوں میں ہوتا ہے ان ایجادات کے ساتھ ساتھ صحافت بھی ترقی کرتی رہی چناں چہ فصلی (سہ ماہی) مجلات، ماہ نامہ رسائل، ہفت روزہ جراید اور روزنامہ اخبارات نکلنے لگے اور اس وقت ہر بڑے مدرسے ہر انجمن اور ہر ادارے سے رسائل شایع ہوتے ہیں۔

صحافت کی تاریخ:

تحریر کے ذریعے سے احوال و پیغامات پہنچانے کو اگر صحافت کہا جائے تو اس کی تاریخ بہت قدیم ہے کم از کم سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوتی ہے اور اگر جدید متعارف اصطلاح کا اعتبار کیا جائے تو پھر اس کی تاریخ مغرب میں اگر چہ قدیم معلوم ہوتی ہے مگر مشرقی ممالک میں پونے دو سو سال کے لگ بھگ پرانی ہے کیوں کہ عربی میں سب سے پہلے مجلہ ''الواقع المصریہ'' ۱۸۲۸ء میں رفاعہ ابن رافع طہطاوی کی ادارت میں مصر سے جاری ہوا۔ اور فارسی میں سب سے پہلا رسالہ ''جام جہاں نما'' ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے نکلا۔ اردو کا سب سے اول اخبار ''اردو دہلی اخبار'' ۱۸۳۶ء میں محمد حسین آزاد نے جاری کیا اور پشتو میں سب سے پہلا اخبار ''طلوع افغان'' غلام محی الدین نے قندھار سے غالباً ۱۸۹۹ء میں نکالا اور برصغیر میں فارسی، اردو اور پشتو کے علاوہ دیگر زبانوں میں صحافت ماضی قریب میں شروع ہوئی ہے۔

صحافت کی ضرورت:

اللہ تعالیٰ نے خلقت انسانی کے ساتھ ساتھ قوت بیانیہ کو بھی بطور نعمت ذکر کیا

ہے فرمایا **خلق الانسان علمه البیان** انسان کو پیدا کیا اس کو قوت بیانیہ عطا کی۔ اور قوت بیانیہ میں زبان وقلم دونوں شامل ہیں اور بیان کا سلیقہ اس انداز سے کہ اپنی بات کو واضح اور دل نشین کر سکے یہ ایک طاقت ہے اور یہ طاقت جس ذہنیت کے حامل لوگوں کو ملتی ہے وہ اسے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں اگر وہ لوگ ضالین ومظلین ہیں تو وہ اس قوت سے انسان کے عقائد سے لے کر اخلاق تک سب کو فاسد کر دیتے ہیں اور اگر یہ ہادی ومصلح لوگوں کو عطا کی گئی تو وہ اس کے ذریعے سے پوری انسانیت کو خیر کی طرف مایل کر دیتے ہیں اور اس امت کے لیے اس قوت کو حاصل کرنا خصوصاً ضروری ہے کیوں کہ ختم نبوت کے طفیل دین کی دعوت وتبلیغ کا کام اس امت کو سونپا گیا ہے اور دعوت وتبلیغ بنیادی طور پر دو ہی چیزوں سے ہوتی ہے زبان وقلم یعنی تقریر وتحریر سے باقی سارے ذرایع ابلاغ جس کو آج کل میڈیا کہتے ہیں ان دو کے لیے اسباب ہیں۔

صحافت جو میڈیا کا اہم حصہ ہے، انسان کی ذہن سازی، جذبات ابھارنے، احساسات صحیح رخ پر ڈالنے، معاشرہ میں اسلامی اقدار کی ترویج اور صحیح معلومات فراہم کرنے کا ایک زبردست مؤثر ذریعہ ہے نیز باطل قوتوں کے ناپاک عزایم سے امت مسلمہ کو آگاہ کرنے، ان کے گم راہ کن پروپیگنڈہ کی تردید کرنے ان کے اعتراضات کے جوابات دینے، ان کے فاسد نظریات کی روک تھام کرنے اور ان کے خطرناک منصوبوں کو بے نقاب کرنے کے لیے ایک قوی ہتھیار ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ صحافت اشاعت دین کے لیے مؤثر ذریعہ بھی ہے اور دشمنانِ اسلام کے مقابلے کے لیے ایک مضبوط اسلحہ بھی جیسے ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' اور ''کامریڈ'' کے ذریعہ سے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا اسی ضرورت کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کے اہل حل وعقد نے عربی واردو میں رسایل جاری کیے اور مجاہد کبیر شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ نے ہفت روزہ خدام الدین کی داغ بیل ڈالی اس کے بعد مولانا عبدالحق صاحبؒ نے ماہ نامہ ''الحق''، مولانا محمد یوسف بنوری صاحبؒ نے ماہ نامہ ''بینات''، مولانا مفتی محمد

شفیع صاحبؒ نے ماہ نامہ ''البلاغ''، مولانا حامد میاں صاحبؒ نے ''انوار مدینہ''، حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم نے ماہ نامہ ''الفاروق'' جاری کیا۔ غرض یہ کہ آج میڈیا کا دور ہے نظریاتی جنگوں میں میڈیا خطرناک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ذرایع ابلاغ ہی وہ طاقت ہے جس سے بغیر عسکری قوت استعمال کیے قوموں اور ملکوں کو فتح کیا جاتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس وقت عالمی میڈیا یہود ونصاریٰ کے قبضے میں ہے اور ان کا نشانہ بہرحال اسلام اور مسلمان ہیں۔ آج مغرب میڈیا ہی کی قوت سے ہمارے ذہنوں پر حکومت کر رہا ہے اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ کوئی بھی اسلامی ملک اپنے مؤقف میں کتنا ہی حق بجانب کیوں نہ ہو لیکن عالمی سطح پر عذر خواہانہ رویہ اپنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ یاد رکھیے کہ ذہنی غلامی جسمانی غلامی سے بدتر ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس ضرورت کی بنا پر صحافت میں حصہ لیا اور اسلام ومسلمانوں کی کما حقہ وکالت کے ساتھ ساتھ دشمنانِ دین کے حملوں کا کام یاب دفاع بھی کیا۔

صحافت کا معیار:

معیاری صحافت کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے:

ذہانت، قوی حافظہ، علوم ادب (لغت، صرف، نحو، معانی، بدیع، بیان وغیرہ) میں مہارت اور تاریخ پر عبور، نیز جو بات لکھی ہو کہ، واضح اور پر مغز ہو اور بیان مربوط ومدلل ہو۔ سو اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو فہم کی عمدہ صلاحیت پیدائشی طور پر اعلیٰ درجے کی عطا فرمائی تھی جس کا اندازہ ہم ان کی حاضر جوابی سے لگا سکتے ہیں چند نمونے یہاں ذکر کیے جاتے ہیں، جناب محمد ادریس صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''۱۳۹۶ھ میں جب مولانا مفتی محمود صاحبؒ مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ دروازہ لاہور میں دورۂ تفسیر پڑھا رہے تھے تو ایک دن سورہ انعام کی آیت نمبر ۶۸ کی مناسبت سے اپنا ایک واقعہ سنایا فرمایا ہم اپوزیشن میں تھے اور

ہم نے ایک دفعہ اسمبلی سے واک آؤٹ کیا تو مولانا غوث ہزاروی صاحبؒ اٹھ کر کہنے لگے کہ اپوزیشن والے واک آؤٹ کررہے ہیں ان میں مفتی محمود بھی ہے وہ یہ بتائیں کہ آخر اسلام میں یہ کہاں جائز ہے؟ میں نے فوراً اس آیت کا پہلا حصہ پڑھا جس کا ترجمہ ہے: ''جب آپ ان لوگوں کو ہماری آیتوں (احکام) سے مذاق کرتا ہوا دیکھیں تو ان سے الگ ہو جائیں'' تو مولانا ہزاروی صاحبؒ چپ ہو گئے، بعد میں جب ہم قومی اسمبلی کے اجلاس میں پھر شریک ہوئے تو مولانا ہزاروی صاحبؒ نے فرمایا کہ اب پھر آگئے؟ تو میں نے اسی آیت کا باقی حصہ پڑھا جس کا ترجمہ: ''یہاں تک کہ وہ دوسری بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر شیاطین آپ کو بھلا دیں تو یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھیں۔'' (روزنامہ وفاق مفتی محمود نمبر)

نیز جناب شعیب الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ کراچی میں ایک نوجوان آئے، مفتی صاحب سے کہنے لگے میرے والد صاحب بہت سخت ہیں مجھے اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے منع کرتے ہیں، حضرت مفتی صاحب نے پوچھا کہ وہ کس کے مرید ہیں نوجوان نے کہا حضرت تھانویؒ کے، مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے ارتجالاً فرمایا مرید تھانوی ہیں اس لیے تھانے سے ڈرتے ہیں۔''

(حوالہ مذکور)

اسی طرح ڈاکٹر احمد حسین کمالؔ رقم طراز ہیں:

''دیوبند کی صد سالہ تقریب کے موقع پر ایک نیوز ایجنسی کے ہندو ڈائریکٹر نے مفتی صاحب سے پاکستان کے سیاسی حالات کے متعلق کچھ ترچھے سوالات کر کے اپنے مطلب کا مواد تیار کرنا چاہا مگر مفتی صاحب نے پہلے ہی سوال کے جواب میں نہایت متانت سے فرمایا میں دیارِ غیر

میں اپنے وطن کی بات نہیں کروں گا، آپ میرے ساتھ لاہور چلیں وہاں میں آپ کو کھل کر اپنے ملک کی سیاست پر انٹرویو دوں گا۔'' (حوالہ مذکور)

نیز جب کمبائنڈ ملٹری ہسپتال راول پنڈی میں ڈاکٹر معروف الدوالبی حضرت مفتی صاحب سے ملنے گئے اور مسئلہ رجم کے بارے میں مخالفین کے اعتراضات کا تذکرہ کیا تو حضرت والا نے شاندار دلائل کے اتنے انبار لگا دیے اور پورا مسئلہ اس دل نشین انداز سے سمجھایا کہ ڈاکٹر صاحب ان سے لپٹ کر کہنے لگے:

''میں نے اس مسئلہ پر ایسے دلائل آج تک نہیں سنے۔''

(قومی ڈائجسٹ لاہور خصوصی نمبر)

اور لسانیات میں مفتی صاحبؒ کو ایسی مہارت تھی کہ پانچ زبانوں میں آپ بغیر تکلف کے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتے تھے خصوصاً عربی و اردو میں جب بیان کرتے تو کسی کے وہم میں بھی یہ نہ گذرتا کہ یہ ان کی مادری زبان نہیں، غرض یہ کہ معیاری صحافت کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب مفتی صاحبؒ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس لیے آپ کی تحریر دلچسپ ہوتی تھی جس سے قاری مطمئن ہو جاتا تھا جو لوگ دل میں خدشات کے سمندر رکھتے تھے وہ بھی جب آپ کا بیان پڑھتے تو سارے خدشات زائل ہو کر تشفی ہوتی۔

صحافت میں خطوط کا مقام:

صحافت کی اصناف میں مکتوبات کو بہت ہی اہمیت حاصل ہے اور خطوط نگاری ادب کی ایک مستقل شاخ ہے چوں کہ مکتوبات ایک عام اور فوری ذریعہ ابلاغ ہے اس لیے ہمارے اکابرین نے ان کی اہمیت کی بناء پر خاص توجہ فرمائی ہے چناں چہ بہت سے مشاہیر اعلام کے دینی، علمی، روحانی اور سیاسی مکاتیب کے مجموعہ جات طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں جیسے مکتوبات مجدد الف ثانیؒ، مکتوبات شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، مکتوبات شیخ التفسیر حضرت لاہوریؒ وغیرہ اور یہ مکتوبات امت کے لیے بہترین راہ نما

ثابت ہوئے ہیں اور ان سے تشنگانِ علم کا ایک بڑا طبقہ سیراب ہو رہا ہے۔

مفتی صاحب کے خطوط:

خطوط کے آئینے میں صاحب خط کی شخصیت اور اس کے طبعی وجبلی رجحانات بآسانی معلوم کیے جا سکتے ہیں اسی بنا پر ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مفتی صاحبؒ کے مکتوبات سے ان کی عمیق صحافت کے ساتھ ساتھ ان کی عظیم شخصیت بھی جھلکتی نظر آتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف میدانوں میں شبانہ روز مختلف سرگرمیوں کی طرح ان کے خطوط بھی اشاعت دین اور ترقی اسلام کے لیے تھے ان کے ایک ایک خط کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا مطمحِ نظر صرف نفاذِ شریعت تھا اور اسی کے لیے تمام تر صلاحیتوں کو وقف کر رکھا تھا، جیسے کہ آپ اپنے رفیق خاص نواب زادہ نصر اللہ خان کے نام ۲۰ رستمبر ۱۹۸۰ء کے تحریر شدہ خط میں لکھتے ہیں:

”میں بہت معذور ہوں لیکن طبیعت حساس ہے اور کوشش کرتا ہوں کہ میری زندگی کسی کام لگ جائے ورنہ درحقیقت میں حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔“

اسی طرح رفقا کار کو غلبہ دین کے لیے قربانی دینے کی ترغیب اور دینی تعلیمات کی پیروی کرنے اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے خطوط تحریر فرماتے تھے۔ مثلاً سرگودھا کے ایک نوجوان محمد طارق جو تحریک ختم نبوت کے دوران قید کر لے گئے تھے کو یوں لکھتے ہیں:

”عزیز محمد طارق صاحب! نوجوانی میں قربانی کا موقع اللہ تعالیٰ نے بخشا،

ایں سعادت بزور و بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دین کی سربلندی کی راہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کوئی بھی جدوجہد جہاد ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق بخشی ہے، انسان کی جان

و مال ویسے بھی اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے انھیں حوصلہ دلانے کے لیے ان سے جنت کے بدلہ میں خرید لی ہے، اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ کتنا ارزاں سودا ہے کہ چیز ان کی تھی اور بڑی سے بڑی قیمت (جنت) دے کر خود خرید لی۔ گھبرایئے نہیں ایک ایک ساعت نیک ہے موجب اجر و حسنات ہے۔ سعید ہیں وہ لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ استقامت سے رہیں اور یہ وقت سکون، اطمینان اور صبر سے گذاریں۔ تشویش اور پریشانی کو قریب نہ آنے دیں۔ رہائی کی کوشش خود بالکل نہ کریں اور نہ اس میں دلچسپی لیں نہ گھر والوں کو آمادہ کریں۔ ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے گا، میرے لیے بھی دعا کریں میں آپ لوگوں کی دعاؤں کا محتاج ہوں، وقت ضایع نہ کریں تہجد کی نماز بلا ناغہ پڑھیں تلاوت بہت کریں بہت بہت شکریہ۔“

دیکھیے مفتی صاحبؒ نے یہ خط کتنے بہترین الفاظ اور شاندار انداز سے لکھا ہے جس کے ایک ایک فقرے سے فصاحت اور للّٰہیت ٹپکتی ہے، باقی ان کے سارے خطوط اس خط پر قیاس کریں۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

مفتی صاحب کے مضامین:

مفتی صاحبؒ نے کل کتنے مضامین لکھے ہیں اور کن کن جرائد میں شایع ہوئے ہیں ان کا احاطہ تو میں نہ کر سکا البتہ ان کے تین مضامین میرے نظر سے گذرے ہیں ایک ”سائنس اور اسلام“ جو ماہ نامہ ”انوار مدینہ“ لاہور میں ۱۳۹۳ھ میں قسط وار شایع ہوا، دوسرا ”دار العلوم دیوبند، تحفظ و احیائے اسلام کی عالم گیر تحریک“ جو ماہ نامہ ”الرشید“ لاہور دیوبند نمبر میں شایع ہوا، تیسرا علامہ بنوریؒ کے مناقب پر ”میدان علم و

عمل کا شاہ سوار'' کی سرخی سے ماہ نامہ ''بینات'' بنوری نمبر میں شائع ہوا۔ ان مضامین کے مطالعے سے دو باتیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں ایک یہ کہ مفتی صاحب اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے جو استدلال پیش کرتے ہیں وہ اس انداز سے ہوتا ہے کہ قاری کو تسلیم کیے بغیر اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا مثلاً سائنس اور اسلام کے مضمون میں ان کا مدعا یہ ہے کہ سائنس نے وحی الٰہی کے فیصلوں کی تائید کی اور ان فیصلوں کو خلاف عقل اور ناممکن سمجھنے والوں کی تغلیط کی اس پر انھوں نے جو دلائل پیش کیے ہیں خوفِ طوالت کی وجہ سے اقتباسات کی بجائے خلاصہ پر اکتفا کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں:

دنیائے کفر اس پر متفق ہے کہ اعمال کا تولنا، شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر جانا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں میں رہنا، تخت سلیمانی کا ہوا میں اڑنا اور وحی کی وہ قسم جو گھنٹی کی طرح ہوتی تھی اس سے فصیح کلام کا بننا یہ سب خلاف عقل اور ناممکن ہیں تو مفتی صاحبؒ نے سائنسی ایجادات کی مثالیں دے کر عقل کے اندھوں کو بتا دیا کہ یہ سب عقلاً بھی ممکن ہیں وہ اس طرح کہ سائنس نے اعراض تولنے کے لیے میزان بنائی ہے مثلاً حرارت کی مقدار مخصوص آلات سے معلوم کی جاتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک ترازو بنایا ہے جس سے اعمال تولے جائیں گے۔ نیز چاند پر انسانوں کے پہنچ جانے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیام علی السماء والا اعتراض ختم ہو گیا اور ہوائی جہاز جو بلاشبہ ایک ثقیل چیز ہے کے ہوا میں اڑنے سے تخت سلیمانی کی پرواز ثابت ہوئی۔ اسی طرح ٹیلی گرام آفس میں ایک شخص کے سامنے محض ٹک ٹک ہوتا رہتا ہے جس سے وہ بامعنی کلام لکھ لیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کچھ رموز ہوتے ہیں جنھیں تار دینے والا اور وصول کرنے والا ہی سمجھتا ہے ایسے ہی وحی بھیجنے والے اور وحی وصول کرنے والے کے درمیان رموز ہوتے ہیں جن سے نبی فصیح کلام سمجھ لیتا ہے تو ان مثالوں سے متلاشیان حق کے لیے حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے اور ضد کا تو کوئی علاج ہے ہی نہیں۔ دوسری بات جو ان کے مضامین سے معلوم ہوتی ہے وہ فصاحت، بلاغت اور ادبی طرز انداز

ہے نمونے کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

دارالعلوم دیوبند اور تحفظ و احیائے اسلام کی عالم گیر تحریک میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اور جب بھی گلشن اسلام کو پامال کرنے کی کوئی کوشش ہوئی تو جو لوگ سینہ سپر ہو کر سامنے آئے اور اندرونی و بیرونی فتنوں کو دبا کر گلشن اسلام کی تازگی کو قائم رکھا وہ بھی یہی بوریہ نشین، مسند نشینانِ علم و فقر تھے۔''

ایک دوسری جگہ یوں رقم طراز ہیں:

''دشمن مطمئن تھا کہ اس نے ہندوستان کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کرا لیا لیکن جو خطہ ارض ابتدا سے آسمانی رشد و ہدایت سے نوازا گیا اس سے آثار دینی مٹانا کسی کے بس میں نہیں تھا اور قدرت اغیار کی ریشہ دوانیوں پر مسکرا رہی تھی۔''

اور حضرت بنوریؒ کے متعلق مضمون ''علم و عمل کے شاہ سوار'' کو ان کلمات پر ختم کرتے ہیں۔

''ان کی وفات سے پیر و جوان سبھی متاثر تھے اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ مرحوم وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا، جانا سب نے ہے لیکن بعض جانے والوں کا سلسلہ بعض دوسروں سے مختلف ہوتا ہے اور مولانا موصوف انہی خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو مدتوں کے بعد دنیا میں آتے ہیں۔''

غرض یہ کہ مفتی صاحب کے مضامین معنوی حسن کے ساتھ ساتھ ادبی خوبیوں سے بھی مزین تھے۔

مفتی صاحب کی تصانیف:

تصنیف و تالیف تنہائی اور خلوت کا تقاضا کرتی ہے اور آج کل کی مروج

سیاست کے ساتھ شور و ہنگامہ لازمی ہوگیا ہے۔ یہ مفتی صاحب کی کرامت سمجھیں کہ انھوں نے ضدین کو یک جا کر دیا تھا وہ شب و روز سیاست کی دھن میں بھی لگے ہوئے تھے اور سلسلہ تصنیف کو بھی جاری رکھا بلکہ مزاجاً وہ تصنیف کو سیاست سے زیادہ اہمیت دیتے تھے جیسے کہ سردار عبدالقیوم صاحب لکھتے ہیں:

''مفتی صاحب نے فرمایا میں ترمذی شریف کی شرح لکھ رہا ہوں اور وہ مکمل نہیں ہو پائی اور سیاست میں تو وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آگیا تھا اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے اس ادھورے کام کو مکمل کر ڈالوں کیوں کہ اس کی سیاست سے زیادہ اہمیت ہے۔''

چناں چہ ان کو سہالہ کیمپ جیل میں جتنا وقت بھی ملتا اس میں ترمذی شریف کی شرح لکھتے تھے۔ (روزنامہ وفاق مفتی نمبر)

اور سیاست کے علاوہ اسفار کی کثرت، مہمانوں کا ہجوم، وفود سے ملاقاتیں اور درس و تدریس کے اشتغال کے ساتھ تصنیف کا کوئی امکان نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحب کو ایسا عزم مصمم اور بلند ہمتی عطا فرمائی تھی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سب مشاغل کے ساتھ تصنیف کا کام بھی انجام دیا آپ کی تصانیف میں سے ''المتنبی القادیانی'' بہت مشہور ہے جو مختصر ہونے کے باوجود مرزائیت کے موضوع پر عربی زبان میں بہت جامع کتاب ہے اس میں انھوں نے کلمہ کے عنوان سے چھ باب قائم کیے ہیں جن کی فہرست کچھ یوں ہے، پہلا کلمہ اس فتنہ کی تاریخ اور ابتدائی حالات میں، دوسرا مرزا قادیانی کے حکم جہاد کو منسوخ کرنے اور حکومت برطانیہ کی تائید کرنے میں، تیسرا کلمہ مرزا کی زبان درازی اور فحش گوئی میں، چوتھا کلمہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو گالی دینے میں، پانچواں کلمہ قرآن پاک میں مرزا کی تفسیری تحریفات کرنے میں، چھٹا کلمہ مرزا کی بداخلاقی اور بدکرداری میں، تو اس طویل بحث کو سمیٹ کر صرف چھ باتوں میں بند کر دینا گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کا حقیقی مصداق ہے۔

مفتی صاحب کے ادارتی شذرات:

مفتی صاحب نے ۱۳۹۳ھ سے ۱۳۹۶ھ تک ہفت روزہ خدام الدین لاہور میں رئیس التحریر کی حیثیت سے بہت سے اداریے تحریر فرمائے جو اس وقت عالمی مسائل کے حل پر مشتمل ہونے اور حکومت وقت کی پالیسیوں پر بے لاگ تبصرہ کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں کے دائمی مفاد اور راہ نمائی کے لیے بھی مشعل راہ ہیں نمونے کے طور پر چند شذرات کے سرخیوں کی فہرست پیش خدمت ہے جن سے مفتی صاحب کی دینی، سماجی، ملکی اور سیاسی مسائل پر عمیق نظر رکھنے اور ان کے حل کے لیے دور رس اور مفید تجاویز پیش کرنے کا پتہ چلتا ہے، فہرست یہ ہے:

(۱) آزادانہ غیر جانب دارانہ انتخاب ۲۵/ ذی القعدہ ۱۳۹۳ھ

(۲) قومی اسمبلی قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہے ۲۷/ رجب ۱۳۹۴ھ

(۳) ۱۴۴ اس سیاہ ترین دفعہ سے ملک کو نجات دلائیں ۶ ذی القعدہ ۱۳۹۴ھ

(۴) وزارت امور مذہبیہ آئین کی صریح خلاف ورزی ہے ۲۸/ ذی القعدہ ۱۳۹۴ھ

(۵) عمل اور مسلسل عمل ۳۰/ صفر ۱۳۹۵ھ

(۶) معاہدہ ۶/ فروری ۷/ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ

(۷) نظام شریعت کانفرنس کا التوا ۱۴/ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ

(۸) فیصل الشہید ۲۸/ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ

(۹) مہنگائی کی عفریت ۵/ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ

(۱۰) امن عامہ کی بگڑتی ہوئی حالت ۴/ جمادی الاول ۱۳۹۵ھ

(۱۱) شریعت الٰہیہ کا نفاذ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے ۱۱/ جمادی الاول ۱۳۹۵ھ

(۱۲) ہمارے تعلیمی ادارے ۱۸/ جمادی الاول ۱۳۹۵ھ

(۱۳) متحدہ محاذ کا قومی کنونشن ۲ر جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ

(۱۴) محکمۂ اوقاف ۹ر جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ

(۱۵) حج پالیسی، فلم اللہ اکبر، پاکستان طبی کمیشن ۲۲ر رجب ۱۳۹۵ھ

(۱۶) اسلامی مشاورتی کونسل کی سفارشات ۲۹ر رجب ۱۳۹۵ھ

(۱۷) رمضان اور پاکستان ۱۴ر رمضان ۱۳۹۶ھ

(۱۸) آئین پاکستان اور ترامیم کی گرم بازاری ۲۱ر رمضان ۱۳۹۶ھ

(۱۹) عید کا پیغام ۲۸ر رمضان ۱۳۹۶ھ

اداریوں کی اس فہرست سے مفتی صاحب کے جذبات، خیالات اور ان کا صحافتی وادبی مقام کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، انھوں نے ان اداریوں میں حکومت کے بعض ایسے کاموں پر بھی تنقید فرمائی جو عام لوگوں کی نظر میں نیک کاموں میں سے شمار ہوتے تھے مثلاً ''وزارت امور مذہبیہ کا قیام'' عام لوگ اسے دین کی خدمت سمجھتے تھے اور حکومت کا ایک بڑا کارنامہ گردانتے تھے مگر مفتی صاحبؒ نے اسے دین بے زاری قرار دیا اور بتایا کہ ایک ہی محکمہ دینی امور سے متعلق مان کر باقی تمام محکموں کو دینی احکام سے آزاد قرار دیا گیا ہے جو کہ بہت خطرناک عمل ہے۔ جیسے کہ وہ فرماتے ہیں:

''وزارت امور مذہبیہ کا قیام اور حج اور اوقاف، مدارس ومساجد کی تنظیم جیسے چند امور مختص کرکے اس وزارت کی ذمہ داری قرار دینا اسلام سے متعلق کاملیت وجامعیت کے نظریہ کی واضح تردید کے ساتھ ساتھ آئین کی متعدد دفعات کی صریح خلاف ورزی ہے جب ہم نے آئین میں واضح کردیا کہ مملکت کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا تو گویا ہم نے یہ عہد کیا کہ تمام تر مسائل کا حل اسی چشمہ کے ذریعے کیا جائے اس عہد کے بعد ملک کا پورا ڈھانچہ تمام وزارتیں، سیکرٹریٹ، عدلیہ، انتظامیہ وغیرہ پابند ہیں کہ وہ اسلامی روح برقرار رکھیں اور اسلامی نظریہ سے کسی صورت انحراف نہ کریں، جب یہ صورت ہے تو الگ وزارت کا قیام چہ معنی دارد؟''

مفتی صاحب کے دورِ حکومت میں صحافت کی آزادی:

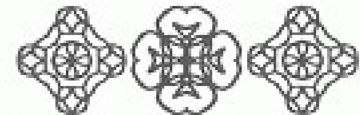
اخبارات ورسائل ابلاغ عامہ کا ایک موثر اور مفید ذریعہ ہیں کیوں کہ قوم کو احوال واقعی سے آگاہ کرنا، مختلف الخیال گروہوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنا، کسی فرد یا جماعت کے کارناموں کو سراہنا، ان کی غلط روش کا محاسبہ کرنا، حکومت وقت کے غلط اقدامات پر کھل کر تنقید کرنا یہ سب اخبارات ورسائل کے فرائض ومقاصد میں سے ہیں جب تک یہ اپنے فرائض صحیح معنوں میں انجام دیتے رہیں گے تو قوم میں بے داری، روشن خیالی، تعمیری جذبات اور اچھی صفات پیدا ہوں گی، خدانخواستہ اگر ان ذرائع نے اس کے برعکس حقایق کی پردہ پوشی کرنا، مختلف مکاتب فکر کے درمیان تفرقہ ڈالنا، مخالفین کی کردارکشی کرنا اور ان کے دامن پر کیچڑ اچھالنا اور حکومت وقت کی بے جا مدح سرائی کرنا اپنا نصب العین قرار دیا تو پھر قوم حقایق سے بے بہرہ ہوجائے گی قومی سطح پر نت نئے مسائل پیدا ہوجائے گے اور جو مسائل درپیش ہیں ان میں مزید الجھاؤ آئے گا شکوک وشبہات کی عمومی فضا بنے گی۔ اس لیے صحت مند معاشرہ کے لیے صحافت کی آزادی انتہائی ضروری ہے۔ مگر آزادی صحافت کا یہ معنی نہیں کہ انبیا علیہم السلام، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور قرآن مجید یا دین اسلام کے دیگر مسائل کے متعلق جو چاہے بلا روک ٹوک بکواس کریں ہرگز نہیں بلکہ حقایق واضح کرنا، غلط پالیسیوں پر لب کشائی کرنا، اچھے کارناموں کی تشہیر کرنا سماجی کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرنا وغیرہ آزادیٔ صحافت ہے۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان کے ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے اخبارات وجراید کو دین کے معاملے میں تو شتر بے مہار چھوڑ دیا جس کی وجہ سے مرزائی، پرویزی، کمیونسٹ، اور شیعہ تو بے شمار گندے اور زہریلے لیٹریچر کی اشاعت کرتے ہیں ان پر کوئی پابندی نہیں مگر حقایق کو واضح کرنے اور غلط پالیسیوں کی اصلاح کرنے والوں پر ہر قسم کی پابندی لگادی۔ بعض آزاد اخبارات نے ان پابندیوں سے اعراض کیا تو اس کی پاداش میں حکومت نے بعض کے پریس ضبط کیے اور بعض کے ڈیکلریشن منسوخ کیے اور ایڈیٹروں پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے۔ لیکن مفتی

صاحب نے صوبہ سرحد میں اپنی حکومت کے دوران کسی اخبار پر پابندی نہیں لگائی نہ کسی صحافی کو گرفتار کیا اور نہ ہی کسی پریس کو نوٹس دیا بلکہ انھوں نے ان تمام اخبارات و رسائل کے ڈیکلریشن بحال کرنے کا اعلان کیا جنھیں سابق حکم رانوں نے جبری طور پر منسوخ کردیا تھا۔ نیز اس وقت کی پنجاب وسندھ کی حکومتوں کی طرف سے اخبارات پر لگائی گئی پابندیوں اور صحافیوں کی گرفتاریوں کی مفتی صاحب نے برملا مذمت کی ان تمام اقدامات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب آزاد صحافت کے علم بردار تھے۔

ستارہ صحافت کا طلوع وغروب:

صحافت کا یہ روشن ستارہ ۶ ربیع الاول ۱۳۳۸ھ کو پٹیالہ سے طلوع ہوا اور دنیائے صحافت میں ترقی کرتے ہوئے بام عروج پر پہنچا اور ۶۳ سالہ سفر کے بعد اوائل ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ میں جہاں سے طلوع ہوا تھا وہیں آکر پنہاں ہوا اور اپنے رفقا کو داغ فراق دے کر اداسی میں چھوڑ دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب وہ ہم میں واپس نہیں آئیں گے مگر ان کے خطوط ومضامین، تصانیف وادارے ہمارے پاس محفوظ ہیں جن پر عمل کرکے دارین کی سعادت ہمارا مقدر بن سکتی ہے اور حقیقی محبت بھی یہی ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چلیں۔ اللہ پاک ہم سب کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

آمین



بہ حضور مفتی محمود

مذکورہ صفات کے چند موتیوں کو آج سے اکیس سال پہلے بندہ نے پشتو اشعار کے دھاگے میں پرویا تھا اور جناب اکرام القادری صاحب نے ان پشتو اشعار کا اردو منظوم ترجمہ ترجمان اسلام ۲۶ رذی الحجہ ۱۳۹۵ھ کے شمارے میں آخری صفحہ پر شائع کیا وہ پشتو اردو نظم بعنوان ''بحضور مفتی محمود'' درج ذیل ہے:

په میدان ده سیاست کی پهلوان دی
په مسجد کی لوئی عالم او خطبه خوان دی
میدان سیاست میں ہے تو شیر شناور
اور عالم بے مثل ہے تو برسر ممبر
په ماحول د خانقاه کی پیر کامل دی
فراست لری قومی سیاست دان دی
تو صوفی و صافی ہے تو راہ بر کام
ہے قومی سیاست میں فراست تری برتر
حل ده هری مسئلے کوی مفتی دی
الفاظ سمریانی قاری هم ده قران دی
حل تو نے مسائل کیے اے مفتی اعظم
کیا قاری قرآن ہو تجھ سے کوئی بہتر
په خطه ده صحافت کی لوئی ادیب دی
پر ممبر پوخ مقرر شعله بیان دی
شہرہ ہے صحافت کا تری تیرے ادب کا
تقریر تری جیسے برستے ہوں جواہر

داب خیال ساتی پہ ھر مجلس کی
پہ لباس قلندری پہ خیال سلطان دی
ہر مجلس و محفل میں ہے تو پیکرِ آداب
پرواز تری شاہوں سے آگے اے قلندر

پہ فارسی و عربی کی شہ ماهر دی
پشتو سکوی هغه ئے خپل زبان دی
عربی ہو کہ ہو فارسی، تو ماہر کامل
پشتو کی تو کیا بات ہے پشتو تجھے ازبر

دہ اردو شان نی دہ اولس پہ خواهش لوړکی
داسی نہ چہ لہ انگلش ځخه ناتوان دی
اردو کو تو بخشی ہے بہت تو نے بلندی
انگلش سے بھی واقف ہے تو اے وقت کے بوذر

طالبان چہ بلبلان غوندی پر گرزی
معلومیږی چہ د علم گلستان دی
مانند عنادل ہیں فدا تجھ پہ طلبا
تو علم کا گلتا ہے گلستان سراسر

صرف یو پہ پاکستان کی مشهور نه دی
پہ مسلم مملکتو کے نوم روشان دی
شہرہ ہی نہیں تیرا فقط اپنے وطن میں
روشن ہے ترا نام بہت ملک سے باہر

بے نوا جمال الدین مړ نه دی ژوندی دی
چہ پر زائے باندی مفتی غوندی افغان دی

(یہ آخری شعر ترجمان اسلام کے مذکورہ شمارہ میں شائع نہ ہوسکا تھا)

تذکارِ محمودؒ

۱۲

داعیٔ اتحادِ ملی

محمد فاروق قریشی
ایم اے (معاشیات)، ایم اے (سیاسیات)، ایل ایل ایم
سابق ناظم عمومی جمعیت طلبا اسلام - پاکستان
مینیجنگ ڈائریکٹر مفتی محمود اکیڈمی - پاکستان
(کراچی)

مفتی محمودؒ اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۱۲)

"ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اور سیرت کی ایک بلند خوبی ان کی بلند نگاہی تھی وہ ان علماء بے تدبیر اور فقیہان بے توفیق کے ہمیشہ مخالف رہے جنھوں نے ملت اسلامیہ کو فرقوں میں تقسیم کیا اور اس کی رگوں میں گروہی عصبیت کا زہر بھر دیا تھا اور محبت و اخوت کی جگہ بغض اور عداوت کو رواج دیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی یہی وہ خوبی تھی جس نے ان کی شخصیت کو اتحاد ملت کی علامت بنا دیا تھا۔"

مولانا مفتی محمود علیہ الرحمہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، ان کی شخصیت، اوصاف وکمالات کا ایک آئینہ خانہ تھی۔ وہ ایک نگینے کی مانند تھے جس کا ہر پہلو جاذب نظر اور دل کشی میں اپنی مثال آپ تھا۔

ان کی شخصیت اور سیرت کے فضائل و محامد کے مختلف دل آویز رنگ ایک سانچے میں ڈھل کر حسن کا ایسا مرقع بن گئے تھے جسے دیکھنے والا مسحور اور ان کی شخصیت کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ وہ ایک ایسی ہمہ گیر اور بوقلموں شخصیت کے مالک تھے کہ افکار کی وسعت و بلندی ان کے اعمال صالحہ کی جلوہ آرائی اور خدمات کی وسعت اور تنوع کے ہر پہلو پر الگ الگ کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور کوئی مفروضہ یا محض حسن عقیدت نہیں بلکہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ ان کا کوئی ہم عصر عالم دین اور سیاست دان ان کی ہم سری نہیں کر سکتا۔

ان کے افکار و نظریات، شخصیت و کردار اور ملی خدمات پر نصف درجن کتابیں اور اتنے ہی رسائل کے مستقل ایڈیشن اور پھر پورے سولہ برس میں ہر سال اخبارات کے خصوصی ضمیمے شائع ہوتے رہے ہیں جو خواص و عوام میں ان کی مقبولیت و محبوبیت کا بین ثبوت ہے۔

ان کو ہم سے جدا ہوئے پورے سولہ برس بیت چکے ہیں لیکن ان کی عقیدت و احترام کے نقوش قوم کے پردۂ ذہن پر ثبت ہیں۔ اور ہر سال اکتوبر میں دل کی کیفیت بہ قول رام ریاض کچھ اس طرح ہو جاتی ہے کہ

کھیتوں میں پھر سرسوں کی رت آ پہنچی
آج تجھے بن دیکھے پورا سال ہوا

گذشتہ پندرہ برسوں میں جب بھی قوم کسی آزمائش سے دوچار ہوئی وہ ہمیں ضرور یاد آئے۔ قومی زندگی کے ایسے ہی نازک لمحات میں ہمیں ان کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ جس ملت کی شیرازہ بندی کے لیے انھوں نے اپنی حیاتِ مستعار کے قیمتی لمحات اور ذہن وفکر کی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں وہ شیرازۂ ملت آج ہمارے عاقبت نااندیش سیاست دانوں کی بنا پر منتشر ہو رہا ہے لیکن وہ راہنما جس نے ابتلا و آلام سے صحیح سلامت نکالا تھا نظر نہیں آتا۔

وہ وقت کے ایک عظیم مدبر اور ممتاز سیاست دان تھے لیکن انھوں نے سیاست کو نہ صرف خدمت بلکہ عبادت کے مترادف بنا دیا تھا۔

مفادات کی آلودگی سے ان کا دامن ہمیشہ صاف رہا وہ ایک صوبے کی حکم رانی کے منصب پر بھی فائز رہے لیکن ذاتی اور جماعتی اغراض سے ان کا دامن آلودہ نہیں ہوا، وہ ملک کے واحد راہنما اور ایک صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے جن کے کردار پر کوئی انگشت نمائی کی جرأت نہیں کر سکا۔

وہ ایک غیرت مند، خوددار اور بلند مرتبہ عالمِ دین تھے۔ انھوں نے ایک شانِ استغناء سے زندگی بسر کی تھی اور اگرچہ دنیا نے وہ سب پچھ ان کے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہا جس کے لیے عام طور پر آرزو کی جاتی ہے لیکن ان کے سامنے حضرت سلمانؓ کا فقر اور ابوذرؓ کا توکل تھا۔

ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اور سیرت کی ایک بلند خوبی ان کی بلند نگاہی تھی وہ ان علماء بے تدبیر اور فقیہان بے توفیق کے ہمیشہ مخالف رہے جنھوں نے ملت اسلامیہ کو فرقوں میں تقسیم کیا اور اس کی رگوں میں گروہی عصبیت کا زہر بھر دیا تھا اور محبت و اخوت کی جگہ بغض اور عداوت کو رواج دیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی یہی وہ خوبی تھی جس نے ان کی شخصیت کو اتحاد ملت کی علامت بنا دیا تھا۔

ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کی تقسیم زبان، نسل، وطن خواہ کسی بنیاد پر ہو وہ

اسلام کی بجائے باطل کی قوت کا باعث بنتی ہے اس لیے ان کی جدوجہد کا محور ہمیشہ اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کا اتحاد تھا۔

وہ اسلام اور وطن دشمن قوتوں کے لیے شمشیر برہنہ کا درجہ رکھتے اور کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرتے، ان کا عقیدہ بہ قول اقبال یہی تھا کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر

قیام پاکستان کے بعد ملت اسلامیہ کو مفتی محمودؒ کی شکل میں ایک عظیم مفکر اسلام اور قائد میسر آیا تھا جس نے ملت کے منتشر اجزاء کو جمع کرنے کی سعیٔ مشکور کی تھی۔ اتفاق اور اتحاد بظاہر ایک لفظ ہے لیکن یہ ایک لفظ ہوتے ہوئے بھی اس قدر آسان نہیں بلکہ معنوی طور پر بسیط اور عملی طور پر اس سے زیادہ دشوار ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ مشکل پسند طبیعت کے مالک تھے انھوں نے اس بھاری پتھر کو صرف چوم کر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے اٹھایا اور تعمیر ملت کی بنیاد بنا دیا۔

انھوں نے دورِ طالب علمی میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ شاہی مراد آباد میں طلبا کو منظم کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جس قوم کے طلبا منظم و متحد ہو جائیں اس کی آنے والی نسل ازخود منظم مستحکم ہوگی۔

جمعیۃ الانصار کے نام سے طلبا کو منظم کرنے کی کوشش سے انھوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس انقلابی تنظیم کے بانی حضرت شیخ الہندؒ اور ناظم حضرت کے نامور اور انقلابی شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے جنھیں عام طور پر امامِ انقلاب کہا جاتا ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ نے دینی تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد صوبہ سرحد خصوصاً اپنے علاقے میں ترویج دین کے ساتھ ساتھ سماجی خدمت اور سیاسی بے داری کے لیے جدوجہد شروع کی۔ قومی سیاست میں انھوں نے ۱۹۴۲ء میں قدم رکھا تھا جب برٹش سامراج کے خلاف ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک شروع ہوئی تھی اس کے بعد وہ ہمیشہ اپنے ذوق وفکر کے مطابق ملت اسلامیہ کی خدمت اور راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے

رہے۔ ان کی سیاسی قیادت کا اصل دور قیام پاکستان کے بعد شروع ہوا۔

ایک زمانے تک انھوں نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو محدود رکھا تھا اور اسلامی علوم کی تعلیم وتدریس ان کی توجہ کا خاص مرکز تھی۔ ان کی بہترین علمی وفقہی صلاحیتوں کا اظہار اسی زمانے میں ہوا حتیٰ کہ ''مفتی'' ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا۔

آج اگر نام کے اظہار کے بغیر کسی شخص کو ''مفتی صاحب'' کہا جائے تو صرف انھی کی شخصیت گرامی سمجھی جاتی ہے۔

پاکستان کے حکمرانوں نے جب مملکت کے مقصدِ قیام سے اعراض کی پالیسی اختیار کی تو مولانا مفتی محمودؒ نے علمائے اسلام کی قوت کو یکجا کرنے کے لیے شبانہ روز جدوجہد کی۔ محسنِ پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد جمعیت علمائے اسلام بے آسرا ہوگئی تھی اور حکمران اسلام کے بارے میں زیادہ جری ہوگئے تھے۔ مولانا مفتی محمودؒ نے حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی معیت میں ملک کے کونہ کونہ کا دورہ کیا اور علما کو وقت کی نزاکت اور ان کے فرائض کے بارے میں احساس دلایا۔

بالآخر جمعیت علمائے اسلام کو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہٗ کی امارت میں حیات نوبخشی اور اسے پاکستان کے علمائے حق کی جدوجہد کا عنوان بنا دیا۔ ۱۹۵۳ء میں پنجاب میں قادیانیت کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو مسلم لیگ حکومت نے لاہور کے شہریوں پر بلاجواز فائرنگ کرکے سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کردیا، بالآخر لاہور میں پاکستان کی تاریخ کا پہلا مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔

ان حالات میں مولانا مفتی محمودؒ نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی قیادت میں بھرپور جدوجہد کی اور اسلامیانِ پاکستان کو مرزائیت اور اس کی پشتبان حکومت کے خلاف متحد ویکجا کرنے کے لیے تاریخی کردار ادا کیا جس کے صلے میں انھیں پسِ دیوارِ زنداں کردیا گیا۔

۱۹۵۸ء میں ایوب خانی مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ملک میں عوام کے بنیادی

حقوق معطل کردیے گئے اور ہرسو آمریت کا دور دورہ اور بنیادی جمہوریت کے نام سے ایک نئے نظامِ سیاسی کا تجربہ کیا جارہا تھا اور وقت کے بڑے بڑے سیاست دان یا تو آمریت کے ہم نوا بن گئے تھے یا حکومت کے خوف سے گوشہ نشین ہوگئے تھے۔

اچانک ملکی سیاست میں ارتعاش پیدا ہوا اور ملک کی معروف سیاسی جماعتوں نے آمریت کے خلاف اتحاد کا اعلان کیا، ملک کی آٹھ مؤثر سیاسی جماعتوں میں مولانا مفتی محمودؒ کی جماعت پیش پیش تھی۔ مولانا مفتی محمودؒ نے جرأت مومنانہ کی بدولت اپنے سیاسی رفقاء کے تعاون سے ملت پاکستان کو ایک متفقہ اسٹیج فراہم کیا جس سے وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے منظم جدوجہد کرسکتے تھے اور بالآخر ۸/جنوری ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں جمہوری مجلسِ عمل قائم ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ بھی پاکستان کے ہر باشندے کے دل کی آواز بن گئی۔ جمعیت علمائے اسلام اس جمہوری مجلسِ عمل کی سب سے اہم رکن اور حضرت مفتی صاحبؒ اس کے ایک بڑے اور مؤثر راہنما تھے۔

عوامی اتحاد کے سامنے اپنے وقت کی مضبوط حکومت ریت کی دیوار ثابت ہوئی اور چشم فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ وہ حکمران جو ''لمن الملک الیوم'' کا ناقوس بجاتے تھے ان کے تاجِ شہی گلی گلی طفلان شہر اچھالتے پھر رہے تھے۔

۱۹۷۰ء میں ملت اسلامی ایک نظریاتی یلغار کی زد میں آگئی جب کمیونزم، سوشلزم اور کیپٹل ازم کے عفریت نے سر اٹھایا۔ کم سواد وکم نگاہ علما نے سوشلزم کے خوف سے ملت کو کیپٹل ازم کی گود میں عافیت دکھانا شروع کردی۔

اس نازک مرحلے پر بھی مولانا مفتی محمود اور ان کے جانباز ساتھیوں نے اعتدال کا دامن نہیں چھوڑا اور بصیرت افروز راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے قوم کو یہ حقیقت افزاء پیغام دیا کہ:

''پاکستان میں مارکس اور لینن کے سوشل ازم کے علم برداروں کے لیے کوئی جگہ نہیں، امیر اور غریب کی جنگ کو کفر واسلام کی جنگ بنانے سے گریز کیا جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوجائے تو سوشل ازم کا کوئی نام

نہیں لے گا۔ سرمایہ داروں نے اپنی تجوری کی حفاظت کے لیے فتویٰ جاری کرالیا ہے۔ سرمایہ داری اور سامراج کی حفاظت کے لیے اسلام کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ سامراجی اثرات کے خاتمہ کے بغیر پاکستان کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔"

(روزنامہ امروز، ملتان۔۱۹۷۰ء)

مولانا مفتی محمودؒ اور ان کی جماعت نے مومنانہ بصیرت اور مسلسل مساعی سے سامراج کی اسلام دوستی کو سوشلزم کے مقابلے میں لاکر سرمایہ درانہ نظام کو تحفظ دینے کی سازش کو ناکام بنادیا۔ اگرچہ اس مشن کی تکمیل کے لیے بڑے بڑے تسبیح بدست خرقہ بردوش ممتاز علما کو سرگرم عمل کردیا گیا تھا، لیکن اس تندئ بادِ مخالف سے وہ شکستہ دل یا آبلہ پا نہیں ہوئے بلکہ فرازِ حق کے لیے مزید مستعد ہوگئے۔

فلک پیر نے یہ منظر بھی دیکھا کہ مفتی محمودؒ ایسے مردِ قلندر کی راہ روکنے کے لیے خلاء میں اڑنے والے بھی بر سرزمین قریہ قریہ تبلیغ دین کی صعوبت برداشت کرتے نظر آنے لگے۔ لیکن ان ڈولتی فضاؤں میں ریشم کی پینگ سے زمین پر اترنے والوں کے نصیب میں سوائے چکر کے کچھ نہیں تھا۔ ۱۹۷۱ء میں جب عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی میں اقتدار کی رسہ کشی کا میچ جنرل یحییٰ خان کی سرپرستی میں شروع ہوا تو مولانا مفتی محمودؒ نے اس نازک مرحلے پر بھی صدر یحییٰ اور شیخ مجیب الرحمان سے ملاقاتیں کیں تاکہ دشت وچمن زار کے فاصلے کم کرنے کے لیے لالہ وگل کے سامان بہم کردئے جائیں لیکن طبقاتی اور علاقائی مفادات کی خلیج اس قدر وسیع ہوچکی تھی کہ ملکی استحکام اور ملی مفادات اس میں نابود ہوکر رہ گئے۔

مولانا مفتی محمود نے ملک کے دونوں بازوؤں کو متحد رکھنے کے لیے حتی المقدور کوششیں کیں لیکن نشۂ اقتدار میں بدمست حکمرانوں کی بے تدبیری آڑے آتی رہی، حضرت مفتی صاحبؒ نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں سے یک جہتی اور حکمرانوں کو صراطِ مستقیم دکھانے کے لیے مغربی پاکستان کی اقلیتی جماعتوں کا اتحاد قائم کیا جس

میں پاکستان پیپلز پارٹی اور قیوم مسلم لیگ کے علاوہ تمام قابل ذکر جماعتیں موجود تھیں۔ انھوں نے ملک کی سلامتی اور تحفظ کے لیے ہرچند کوشش کی لیکن بے بصیرت حکمرانوں اور طالع آزما سیاست دانوں کے غلط فیصلوں کی بنا پر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور یوں وطنِ عزیز دولخت ہوگیا۔

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد نئے پاکستان کے لیے دستور سازی کا مرحلہ انتہائی اہمیت کا حامل تھا اور قانون ساز اسمبلی دستور ساز اسمبلی کا درجہ اختیار کرگئی تھی۔

پاکستان میں اس سے قبل بھی یہ مراحل انتہائی کٹھن رہے تھے کیوں کہ مملکت کی اصل اور بنیاد لا الہ الا اللہ سے منہ موڑ کر جب علاقائی، صوبائی اور قومیتوں کے مفادات کی بات کی جانے لگی تو باہمی مفادات کا تعارض آئین کی تشکیل میں سدِ راہ بن گیا اور یوں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک یہ ملک سرزمین بے آئین رہا۔

۱۹۶۲ء میں ایوب خان نے ایک خانہ ساز دستور ملک میں نافذ کردیا جو یحییٰ خان کے مارشل لاء میں دم توڑ گیا اب پھر وہی مرحلہ سخت جاں درپیش تھا، گروہی اور علاقائی مفادات کے عفریت اس قدر توانا اور تنومند ہوچکے تھے کہ قومی مفادات اور ملکی سالمیت ان کے لیے خوانِ یغما کا درجہ اختیار کرگئی، مستزاد یہ کہ حکمران جماعت کا رویہ دوسری سیاسی جماعتوں سے خوش گوار نہیں تھا لیکن اس اہم موقع پر داعیٔ اتحادِ ملی حضرت مولانا مفتی محمودؒ جن کی جماعت کے سات ارکان پارلیمنٹ میں موجود تھے، نے دیگر رفقاء کے تعاون سے ملی مفاد کے تحت زیادہ سے زیادہ تعاون اور اتحاد کی فضاء سازگار بنانے میں مثالی کردار ادا کیا اور یوں پاکستان کی تاریخ میں پہلا متفقہ دستور ۱۹۷۳ء میں تشکیل پاسکا۔

دستور میں مندرج اسلامی دفعات اور صوبائی خودمختاری کی پوزیشن سے مولانا مفتی محمودؒ کلی طور پر مطمئن نہ تھے تاہم انھوں نے ملی اتحاد اور یکجہتی کے لیے اس دستور کو زیادہ سے زیادہ قابل قبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بقول محترم نوابزادہ نصر اللہ

خاں صاحب:

''ان کی سیاسی بصیرت اور حب الوطنی کا اس سے بڑا ثبوت فراہم نہیں کیا جاسکتا کہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ اس وقت کی مرکزی حکومت کے غیر جمہوری اقدامات کی وجہ سے دو صوبوں میں اقتدار سے محروم ہوچکے تھے اور اس کی وجہ سے رنج اور تلخی کا ہونا بالکل فطری امر تھا لیکن جب آئین سازی کا مرحلہ آیا تو ملک کو سیاسی استحکام بخشنے کے لیے اس حکومت سے بھی تعاون کرنا مناسب سمجھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اس آئین میں اسلامی دفعات جس قدر ہیں وہ مفتی صاحب اور ان کے رفقاء کی کوششوں کے نتیجے میں ممکن ہوئیں، اس کے علاوہ صوبائی خودمختاری کی حدود کے تعین کے سلسلے میں انھوں نے صرف ملک کے وسیع تر مفاد کو اور ملکی سالمیت کے تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے جائز حدود تک رکھنے کے لیے کوشش کی بلکہ اپنے رفقاء کو بھی اس امر پر آمادہ کیا۔'' (قومی ڈائجسٹ، مفتی محمود نمبر)

نیپ جمعیت پارلیمانی اتحاد نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مخلوط حکومتیں بنائیں اور مفتی صاحب صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کے منصب پر متمکن ہوئے تو بھی اپنے مشن سے روگردانی نہیں کی بلکہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے فکر کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ پاکستان میں چاروں صوبے اپنے علاحدہ کلچر اور زبان وثقافت کا شان دار پس منظر رکھتے ہیں لیکن اگر چاروں صوبوں میں وہاں کی مقامی یا علاقائی زبانوں کو سرکاری زبان قرار دے دیا جائے تو اس عمل سے ملی اتحاد کو ناقابل تصور ضعف پہنچ سکتا ہے۔

مولانا مفتی محمود پشتون تھے وہ عربی فارسی اور اردو کی طرح پشتو انتہائی روانی سے بولتے تھے کیوں کہ وہ ان کی مادری زبان تھی۔ پشتو زبان دیگر زبانوں سے کسی

طرح بھی کم تر نہیں بلکہ بے شمار محاسن سے مالا مال ہے۔ اگر مولانا مفتی محمود بہ طور وزیر اعلیٰ سرحد پشتو کو صوبائی سرکاری زبان قرار دے دیتے تو اس کا ان کو حق تھا اور مقامی طور پر ان کے اقدام کو یقیناً سراہا جاتا لیکن وہ سستی شہرت حاصل کرنے کے قائل نہیں تھے اور نہ ہی علاقائی اور لسانی عصبیت پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے پشتون صوبے میں محض قومی اتحاد و یگانگت کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر اردو کو صوبہ سرحد کی سرکاری زبان قرار دیا۔ ان کا یہ اقدام ہماری مرکزی اور دیگر صوبائی حکومتوں کے لیے بہترین مثال ہے۔

یہ بات اتنی عجیب ہے کہ آج آزادی کے ۴۸ برس بعد بھی ہم قومی اور صوبائی سطح پر مسلمانوں کے ازلی دشمن انگریز کی زبان کو اپنائے ہوئے ہیں لیکن اگر پاکستان کی قومی زبان کی بات کی جاتی ہے تو مقابلے میں صوبائی زبانوں کے تحفظ اور ترویج کا مسئلہ پیدا کردیا جاتا ہے اور یوں قوم کو اپنی ہی زبانوں کے بارے میں نزاع کا شکار کرکے انگریزی کے ''تقدس'' کو مجروح ہونے سے بچالیا جاتا ہے۔

''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کا جو اصول انگریز نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے وضع کیا تھا وہی اصول اس کے جانشین اس کی زبان کے اقتدار کے لیے اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں۔

مولانا مفتی محمود قافلہ حریت کے ان مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے انگریز کو برصغیر سے نکالنے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کردیا تھا اور ان کے نام لیوا ہر میدان میں اس کو ہزیمت اٹھانے پر مجبور کرتے رہے۔ انگریز دشمنی ان کے رگ وریشے میں رچی بسی ہوئی تھی اس لیے انھوں نے اقتدار کو اپنی ذاتی اغراض کا نہیں بلکہ اعلیٰ قومی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔

انگریز کی زبان کے ساتھ ساتھ اس کا لباس بھی دور غلامی کی یادگار ہے جسے ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات لاشعوری طور پر بڑے فخر سے زیب تن کیے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے مقابل کسی قومی لباس میں ملبوس شہری کو کم تر اور حقیر تصور

کرتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نے قومی اتحاد اور ملی یکجہتی کے لیے انگریز کی زبان کے ساتھ ساتھ اس کے لباس کو بھی دیس نکالا دینے کا حکم صادر فرمایا کہ صوبہ سرحد کا سرکاری لباس پاکستان کا اپنا قومی لباس شلوار قمیص ہوگا۔

سرکاری دفاتر میں تمیز بندہ و آقا ختم کردی گئی۔ ''صاحب'' اور ان کے ماتحت ایک ہی لباس میں دفتر آنے لگے۔

بیوروکریسی کے بزرجمہروں نے مفتی صاحب سے شکایت کی کہ انھوں نے انتہائی قیمتی سوٹ (کوٹ پتلون) سلوائے ہیں اور سرکاری فیصلہ کی بنا پر وہ بے کار ہوگئے ہیں اس طرح ان کا سرمایہ ضائع ہوگیا ہے اور اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔

اس عجیب سوال پر حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ:

''میں نے دفتر کی یونی فارم قومی لباس قرار دی ہے۔ دفتر کے باہر کوئی پابندی نہیں۔ جو لوگ کوٹ پتلون پہنے بغیر نہیں رہ سکتے وہ بے شک اپنے گھروں میں یہ لباس پہنیں بلکہ اس کو شب خوابی کا لباس بھی بنالیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

حضرت مفتی صاحب کے اس جرأت مندانہ اقدام نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ پورے ملک میں اس کا چلن ہوگیا یہاں تک کہ مرکزی حکومت کو بھی ان فیصلوں کی تائید کرنا پڑی۔

مولانا مفتی محمودؒ کی وزارت علیا سے قبل اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے پاکستان میں ہفتہ وار تعطیل انگریزوں کے اتباع میں اتوار کو ہوتی تھی۔ جمعہ کے روز سرکاری ملازمین کے لیے جمعہ کی تیاری اور جامع مسجد میں جانا ایک مستقل مسئلہ تھا اگرچہ جمعہ کو ''ہاف ڈے'' (نصف تعطیل) ہوتا تھا تاہم مسلمانان پاکستان جمعہ کے شایان شان تیاری نہیں کرسکتے تھے۔ مفتی صاحب نے فوراً قومی مزاج اور دینی تقاضے کے پیش نظر صوبہ میں تعطیل جمعہ کی سفارش کی جس کو مرکزی حکومت نے بھی تسلیم کیا اور

یوں وطن عزیز میں تعطیل جمعہ کا اجراء ہوا جس کی بنا پر ہفتہ وار نماز جمعہ کے اجتماعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا جو یقیناً ملی یکجہتی کہ حسین مقصد کی طرف ایک خوش آیند قدم ہے۔

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

اگرچہ مفتی صاحب نے اپنے مختصر دور حکومت میں بہت قابل قدر اقدامات کیے اور حتیٰ المقدور صوبہ میں اسلامی قوانین کا نفاذ کیا لیکن سردست وہ ہمارا موضوع نہیں، یہاں صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے پاکستان کے حکمرانوں کے علی الرغم نہایت ہی باوقار اور آئینی خودمختاری کی حدود میں رہتے ہوئے انتہائی خوددارانہ انداز میں حکومت کرکے ثابت کردیا کہ اقتدار عوام کی خدمت، تحفظ اور سلامتی کے لیے ہوتا ہے ان کو ٹکڑوں میں بانٹ کر خود کو مستحکم کرنے کے لیے نہیں۔

جمعیت نیپ مخلوط حکومت کے اس قدر جان دار اور مؤثر اقدامات سے مرکزی حکومت خوش نہیں تھی، بالآخر بھٹو حکومت نے بلوچستان حکومت اور صوبہ سرحد کے گورنر کو برطرف کرنے کے احکامات صادر کردئے۔

اگرچہ مفتی صاحب کی حکومت برقرار رکھی گئی لیکن مفتی صاحب نے اولاً تو اس اقدام کو جمہوری روایات اور سیاسی اقدار کے منافی قرار دیا ثانیاً یہ کہ نیپ جمعیت کی مخلوط حکومت قائم تھی اگر نیپ کی حکومت برطرف کردی جائے تو جمعیت کے حکومت کرنے کا اخلاقی جواز نہیں رہتا۔ مفتی صاحب کے نزدیک یہ کھلی بداخلاقی اور منافقت کا مقام تھا لہٰذا انھوں نے بلاتامل اقتدار میں رہنے کی بجائے اپنی حلیف جماعت سے اتحاد کو برقرار رکھنے کو ترجیح دی اور حکومت سے مستعفی ہوگئے، بھٹو مرحوم نے مفتی صاحب سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی لیکن مفتی صاحب نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی سے انکار کردیا۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا یہ پہلا اور شاید آخری واقعہ ہے کہ کسی نے محض اصولوں کی خاطر اقتدار کو ٹھکرا دیا

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے تیرے سر بلند کیا کرتے

اس سلسلے میں جمعیت کی حلیف جماعت کے سربراہ جناب خان عبدالولی خان صاحب کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

"بلوچستان حکومت کی برطرفی کی خبر آئی تو میں اس دن پشاور میں تھا۔ پارٹی کا کوئی جلسہ تھا اس سے پہلے صوبہ سرحد کے گورنر اپنے عہدے سے برطرف ہو چکے تھے، مفتی محمود سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا "یہ تو انھوں نے صوبائی حقوق پر ڈاکا ڈالا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھے وزارت سے استعفیٰ دے دینا چاہیے۔"

ان کا سیاسی مسلک اور سوچ اتنی واضح اور صاف تھی کہ اس فیصلے تک پہنچنے میں انھیں دو منٹ بھی نہیں لگے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا استعفیٰ لکھا اور وزارت اعلیٰ کو ٹھوکر مار کر حکومت سے الگ ہو گئے۔ اکیس میں سے چودہ ممبروں کے دستخط میں نے خود اپنے ہاتھ سے بھٹو صاحب کو بھیجے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بہت بڑا کردار تھا، اجتماعی طور پر اس حکومت کا اور انفرادی طور پر مفتی محمود کا۔

ان کی سوچ یہ تھی کہ وزارت ہم نے حکومت کی خاطر نہیں خدمت کی خاطر لی تھی اگر ہمیں خدمت کا موقع نہیں ملتا تو پھر حکومت میں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر خدمت ہو سکتی ہے تو حکومت کریں گے، خدمت نہیں ہو سکتی، تو پھر چھٹی کریں گے۔" (قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر)

اس صورت حال کی وضاحت آزاد کشمیر کے وزیر اعظم اور پاکستان قومی اتحاد اور حکومت میں رابطہ کا کردار ادا کرنے والے سردار محمد عبدالقیوم خان اس طرح بیان

کرتے ہیں۔

"جب بھٹو حکومت نے بلوچستان میں نیپ کی وزارت کو دھونس اور دھاندلی سے توڑ دیا تو مفتی صاحب بھی صوبہ سرحد کی وزارت سے مستعفی ہو گئے۔

مسٹر بھٹو چاہتے تھے کہ مفتی صاحب کام کرتے رہیں اور انھیں دوبارہ راضی کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ انھی کوششوں کے دوران بھٹو نے مجھے کہا کہ آپ مفتی صاحب کو سمجھائیں ہم نے ان سے کوئی تعارض نہیں کیا تو وہ ہم سے کیوں تعارض کرتے ہیں اور آرام سے حکومت کیوں نہیں کرتے؟ میں نے ہنستے ہنستے برسبیل تذکرہ مفتی صاحب سے بات کی تو وہ انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگے "صوبہ سرحد میں میری وزارت دراصل دو جماعتوں کے اتحاد اور معاہدے کا نتیجہ تھی، جب ایک صوبہ میں بھٹو صاحب نے حکومت توڑ دی ہے تو اس کا کوئی جواز نہیں کہ میں صرف بھٹو صاحب کی خواہش پر حکومت کروں" میں نے پوچھا کیا نیپ جمعیت کے درمیان ہونے والے معاہدے میں یہ شرط شامل ہے؟

اس پر مفتی صاحب نے فرمایا "ہمارے درمیان معاہدے میں یہ شرط شامل ہو یا نہ ہو، اسلام میں تو یہ بات موجود ہے کہ ان سے بے وفائی نہ کی جائے۔ یہ لوگ آخر مجھ سے اس بات کی توقع کیوں رکھتے ہیں کہ میں وزارت کی خاطر اپنے دوستوں کو چھوڑ دوں گا۔ ایسا نہیں ہوگا، کبھی نہیں ہوگا۔"

میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہوں کہ مفتی صاحب کے کردار کے اس پہلو نے مجھے بے حد متاثر کیا۔" (قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر)

۱۹۷۴ء میں ایک ناخوشگوار واقعہ کی بنا پر اچانک ملک میں قادیانیت کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے اور ریاستی طاقت کے بل بوتے پر مظاہرین پر تشدد کیا

جانے لگا۔ قوم اس مرحلہ پر اپنے فرض کی پکار اور حالات کی سنگینی کے دوراہے پر کھڑی تھی کہ ملی اتحاد کے نقیب مولانا مفتی محمود نے قوم کو اتحاد اور تنظیم کے سانچے میں ڈھال دیا اور عوامی احتجاج کو مظاہروں کی منظم شکل دی اور علامہ محمد یوسف بنوری کی زیر قیادت قوم کو مجتمع کر دیا اور یوں ملکی تاریخ کی ناقابل فراموش تحریک ختم نبوت شروع ہوئی۔ ایک طرف عوامی سطح پر تمام ملی جماعتوں کو متحد کر کے عام جلسے، مظاہرے اور گرفتاریاں پیش کیں جب کہ دوسری طرف پارلیمنٹ میں جسے بھٹو مرحوم نے اس مسئلہ پر خصوصی کمیٹی کا درجہ دے دیا تھا، اسلام کا مقدمہ انتہائی مہارت سے پیش کیا اور بالآخر متفقہ طور پر پارلیمنٹ نے ۷ر ستمبر ۱۹۷۵ء کو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

اور یوں نوے سال کے بعد ملت اسلامیہ کے جسد کو اس ناسور سے نجات دلا دی گئی۔ یہ مولانا مفتی محمود کی قیادت اور تعلق کا نتیجہ تھا کہ نیشنل عوامی پارٹی جیسی سیکولر نظام کی داعی جماعت نے بھی اس مذہبی مسئلہ میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے حق میں ووٹ دیا۔

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں:

''تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء کی کامیابی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس تحریک میں بلاشبہ دوسرے تمام مکاتیب فکر کے علما طلبہ اور کارکن شامل تھے ان تمام مجاہدین نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کی قیادت میں بڑی بے جگری سے ختم نبوت کی جنگ لڑی لیکن پارلیمانی محاذ پر دشمنان ختم نبوت کی شکست مفتی صاحب کی بے پناہ علمی، سیاسی اور فکری کوششوں کا نتیجہ تھی، صرف یہی نہیں کہ وہ قومی اسمبلی میں قادیانیوں سے آئینی جنگ اور قادیانی جماعت کے سربراہ سے علمی مباحثوں میں مصروف رہے، قومی محاذ پر بھی وہ تقریر و خطابت کے ذریعہ ملت اسلامیہ

کے دلوں کو گرماتے اور جذبوں کو بیدار کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ملک بھر میں ہونے والے تمام بڑے اجلاسوں میں وہ بنفس نفیس شریک ہوئے۔'' (قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر)

۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت نے جب قوم کو سیاسی طور پر منتشر دیکھا تو اچانک عام انتخابات کا اعلان کر دیا، حضرت مفتی صاحب اس وقت قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہے تھے، انھوں نے ملک میں سیاسی انارکی اور حزب اختلاف کی کمزور پوزیشن کے باوجود اس چیلنج کو قبول کرنے کا مردانہ وار اعلان کیا۔

اس سلسلے میں انھوں نے قومی سیاسی جماعتوں کو اتحاد کی دعوت دی جس کو قومی راہنماؤں نے پذیرائی بخشی اور یوں ملک کی معروف نو سیاسی جماعتوں کا اتحاد بنام پاکستان قومی اتحاد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ قومی سطح پر حضرت مفتی صاحب کی غیر متنازعہ اور ہر دلعزیز شخصیت کی بنا پر پاکستان قومی اتحاد کا ان کو صدر منتخب کیا گیا۔ پاکستان کے معروف بزرگ سیاسی راہنما جناب نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب مفتی صاحب کے قومی کردار کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''مفتی صاحب کا تعلق اگرچہ مسلمانوں کے ایک خاص مکتبہ فکر سے تھا لیکن ان میں فرقہ وارانہ تعصب قطعاً نہیں تھا۔ ہر مرحلے پر ان کی کوشش رہی کہ قومی اور ملی مقاصد کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کی مختلف سیاسی اور دینی تنظیموں کا وسیع تر اتحاد ہونا چاہیے چناں چہ اس مقصد کے لیے وہ جمہوری مجلس عمل کے قیام میں پیش پیش رہے تھے اور بعد میں جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات کا اعلان ہوا تو نو جماعتوں کا جو اتحاد معرض وجود میں آیا اس میں بھی ان کی کوششوں کا بڑا دخل تھا یہ ان کی شخصی عظمت کا اعتراف تھا کہ انھیں پاکستان قومی اتحاد کا سربراہ منتخب کیا گیا۔''

(قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر)

مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں ووٹ کے تقدس کو مجروح کیا گیا اور نتائج

کو دھاندلی کے ذریعہ تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی تو پوری قوم شعلہ جوالہ بن گئی اور چند ہی دن میں ایک ملک گیر تحریک شروع ہوگئی بلاشبہ یہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کی سب سے بڑی منظم اور مؤثر تحریک تھی جس کی قیادت حضرت مولانا مفتی محمود نے کی۔ مفتی محمود کی قیادت میں عوام کے سیل بے پناہ کے سامنے ''مضبوط کرسی'' کے دعویدار حکمران کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور بالآخر مذاکرات کا ڈول ڈالنا پڑا۔

سرکاری وفد کی قیادت خود وزیر اعظم بھٹو مرحوم اور پاکستان قومی اتحاد کی ٹیم کی قیادت حضرت مولانا مفتی محمود کر رہے تھے۔

نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب اور پروفیسر غفور احمد صاحب مفتی صاحبؒ کے ساتھ مذاکرات کی اس جنگ میں میمنہ و میسرہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں نوابزادہ صاحب فرماتے ہیں:

''پاکستان قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم نے مفتی صاحب کی قیادت میں ۳۲ نکات کی بنیاد پر بھٹو صاحب اور ان کی ٹیم کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا اور انھوں نے اپنی اعلیٰ سیاسی بصیرت کی وجہ سے بھٹو صاحب سے ۳۲ میں سے ۳۱ نکات منوالیے۔

برصغیر کی تاریخ میں مختلف وقتوں میں اصلاحات کے نفاذ پر اقتدار منتقل کرنے کے سلسلے میں جو بھی مذاکرات ہوئے ہیں سیاسی تنظیموں میں سے کسی کو بھی ایک وقت میں اتنی بڑی کامیابی نصیب نہیں ہوئی جتنی پاکستان قومی اتحاد کی اس مذاکراتی ٹیم کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور بے پناہ عوامی تائید کی وجہ سے حاصل ہوئی اس مذاکراتی ٹیم کے سربراہ مفتی صاحب تھے۔'' (قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر)

مذاکراتی ٹیم کے دوسرے معزز رکن پروفیسر غفور احمد صاحب فرماتے ہیں:

''مفتی صاحب کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ سیاسی معاملات کو سیاسی معاملات کے طور پر دیکھتے اور پرکھتے تھے نہ مذہبی تعصبات کو ان پر اثر

انداز ہونے کی اجازت دیتے تھے اور نہ غیر سیاسی اقدامات کی تائید پر آمادہ ہوتے تھے انھوں نے پاکستان قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم کے لیڈر کی حیثیت سے اس بات کی مسلسل کوشش کی کہ سیاسی عمل جاری رہے لیکن افسوس مسٹر بھٹو نے تعاون نہ کیا۔ مفتی صاحب نے قومی اتحاد کے اندر بھی دباؤ کا سامنا کیا اور ائیر مارشل اصغر خان کے اس مؤقف سے اتفاق نہ کیا کہ مارشل لاء لگ جانا چاہیے۔ خان صاحب کہتے تھے کہ مسٹر بھٹو کی موجودگی میں انتخابات منصفانہ نہیں ہوں گے اس لیے مارشل لاء نافذ ہونا چاہیے۔ نوے دن کے اندر اندر انتخابات کرا کر مارشل لاء اٹھا لیا جائے گا۔ لیکن مفتی صاحب سیاسی عمل کے جاری رہنے پر اصرار کرتے تھے۔ اگر مسٹر بھٹو تعاون کرتے اور نکتہ آفرینیوں سے گریز کرتے تو سیاسی عمل جاری رہ سکتا تھا۔'' (قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر)

حضرت مولانا مفتی محمود بہر قیمت قوم کا اتحاد چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انھیں بسا اوقات اپنے مخالفین ہی سے نہیں بلکہ معاونین کے دباؤ کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی تھی۔ ذاتی طور پر وہ مارشل لاء حکومت سے تعاون اور اس کے تحت وزارتیں قبول کرنے کے حق میں نہیں تھے لیکن جب پاکستان قومی اتحاد میں شامل ایک جماعت نے بالا بالا وزارتیں قبول کر لیں اور دوسری پر تولنے لگی تو پھر قومی اتحاد کو بچانے کے لیے وزارتیں قبول کر کے مارشل لاء حکومت سے تعاون کا تلخ گھونٹ پی کر اتحاد کو بچا لیا۔

جب روسی استبداد نے سرزمین افغانستان میں اپنے پنجے گاڑنا شروع کیے اور اپنی فوجوں کو براہ راست افغانستان میں داخل کر دیا تو افغانستان کے مسلمانوں نے تحریک مزاحمت شروع کی۔ تو پاکستان میں بھی اس صورت حال پر خاصا اضطراب موجود تھا اور مسلمانان پاکستان نے اپنے افغان بھائیوں کی بھرپور امداد کی لیکن اس صورت حال کا المیہ یہ تھا کہ روسی سامراج سے ٹکرانے والی قوتیں باہمی تنازعات کا

شکار ہوگئیں جو یقیناً قابل تشویش بات تھی۔ یہ امر عالم اسلام کے اس عظیم و جلیل مفکر کے لیے وجہ اضطراب بنا رہا اور اس نے اپنی علالت اور جماعتی مصروفیات کے باوجود مسلمانوں کی مزاحمتی قوتوں کی یکجا کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

اس سلسلے میں حضرت مفتی مرحوم کے رفیق خاص نواب زادہ نصر اللہ خان کہتے ہیں:

> ''جب روسی افواج افغانستان میں جارحیت کا ارتکاب کر کے وہاں داخل ہوئیں تو مفتی صاحب نے اپنی روایت کے مطابق اسلامیان پاکستان کی تمام سیاسی اور دینی تنظیموں کو اس عظیم خطرے کے پیش نظر متحد کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، ملتان اور آزاد کشمیر کے شہروں میں اجتماعات منعقد کیے گئے۔ مفتی صاحب اپنی پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود ان سب اجتماعات میں شریک ہوئے۔
>
> زندگی کے آخری سانس تک استقامت کے ساتھ ملی فریضے سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ ان پر مقدمات قائم کیے گئے جیل جانا پڑا لیکن ان کے جذبہ میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔
>
> اپنے آخری خط میں مجھے لکھا ''جو تھوڑی بہت زندگی باقی رہ گئی ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ملک اور قوم کے کام آئے۔''

درج بالا سطور میں ہم نے مولانا مفتی محمود کی ملی اتحاد کے لیے ان گراں قدر کاوشوں کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا ہے جن کا تعلق سیاسی جدوجہد سے تھا۔ چوں کہ مولانا مفتی محمود بنیادی طور پر ایک جید عالم دین تھے اس لیے آیئے ایک نظر ان کی ان خدمات پر بھی نظر ڈالتے چلیں جن کا تعلق دین و مذہب سے تھا۔

ختم نبوت کے صدقے میں اس امت کے علماء انبیاء کے وارث ہیں اور بلاشبہ وہ اپنے فرائض منصبی میں بنی اسرائیل کے انبیا کے برابر ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ملت کے اتحاد کو ہمیشہ اس طبقہ نے اپنی ناوک افگنیوں کا نشانہ بنایا ہے۔ کبھی فقہی مسائل

پر قوم کو لڑایا، کبھی فروعی مسائل میں الجھایا، الغرض ایک دین کے ماننے والوں کو باہمی اتحاد و یگانگت کا درس دینے کی بجائے انھیں فرقہ پرستی کی دو دھاری تلوار سے لخت لخت کردیا۔ ایک ''عالم دین'' کا ارشاد ہوتا ہے کہ فلاح فرقہ کے قمیع سے ہاتھ نہ ملاؤ ورنہ نکاح فسخ ہوجائے گا۔ دوسرے ''علامہ صاحب'' ارشاد فرماتے کہ اگر فلاں فرقے کا پیرو مسجد میں داخل ہوگیا تو مسجد پر غسل واجب ہوجائے گا۔ (العیاذ باللہ)

غرض یہ کہ فرقہ پرست علماء (الا ماشاء اللہ) ملت اسلامیہ کو کفر کے فتووں سے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں ہی اپنی نجات اخروی سمجھتے تھے بالآخر شاعر مشرق کو کہنا پڑا

امت کو بانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام ہے فقیہوں! ممنوں بہت تمہارا

ایسے ماحول میں کسی عالم دین کا ملی اتحاد کی بات کرنا گویا سوئی کے ناکہ میں ہاتھی کو گزرانے کے مترادف تھا لیکن مولانا مفتی محمود کہ مشکل پسند طبیعت کے مالک اور مزاج میں استقلال وافر رکھتے تھے اس اعلیٰ مشن کو لے کر آگے بڑھے اور بڑھتے ہی چلے گئے۔ وہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو یکجا کرنا چاہتے تھے اس انداز سے نہیں کہ وہ اپنے اپنے عقائد و نظریات سے دستبردار ہوکر ''کچھ لو اور کچھ دو'' کے اصول کے تحت چند مشترکہ عقائد مرتب کر کے ان کو تسلیم کرلیں، بلکہ وہ ان تمام فرقوں کو اپنے اپنے نظریات و عقائد پر پختگی کے ساتھ عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے اپنے قلب و نظر میں جگہ دینے کی بات کرتے تھے۔

مولانا مفتی محمود ایسے عالم دین نہ تھے کہ ان کا کسی مسلک، مشرب یا مذہبی فرقہ سے تعلق نہ ہو بلکہ وہ ازہر ایشیا دار العلوم دیوبند کے نامور اور قابل فخر فرزند تھے مذہباً حنفی مشرباً سنی اور مسلکاً علماء دیوبند کے پختہ کار پیرو تھے مگر ایسے کہ دوسرے تمام مسالک و مشارب اور ان کے پیروکاروں کے لیے وہ بہت وسیع القلب تھے۔ ان کے نزدیک علماء کے باہمی نزاع کا انداز ان کی کوتاہ نظری کے علاوہ اغیار کی سازش کا مظہر

ہے اور اسلام کی اس سے بڑی خدمت اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس کے نام لیوا ایک ہوجائیں اور جب تک ایسا نہیں ہوگا عالم میں مسلمان ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے اس ضمن میں حضرت مفتی صاحب کے فکر وعمل کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں، جمعیت علمائے اسلام کراچی ڈویژن کے سرپرست حضرت مولانا نور الہدیٰ صاحب فرماتے ہیں۔

ایک دفعہ کسی محفل میں ایک شخص نے سوال کیا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ ہو یا فقہ جعفری؟

آپ نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا اور کہا:

"افسوس کی بات ہے کہ تم لوگ بتیس سال تک (۱۹۷۹ء کا واقعہ ہے اس وقت پاکستان کے قیام کو اتنے ہی سال ہوئے تھے) انگریزی نظام کے تحت چپ رہے اب جب ذرا اسلامی نظام کی امید ہوتی ہے تو فقہ حنفیہ اور فقہ جعفریہ پر لڑائی کر رہے ہو۔ فقہ حنفی ہو یا جعفری اس نظام سے تو بہتر ہوگا جو اس وقت انگریزی اور بے دینی کے نظام کی صورت میں رائج ہے۔"

مشہور شیعہ عالم علامہ علی غضنفر کراروی کہتے ہیں کہ:

"ان کے ساتھ میری قربت کا سبب ان کی وسعت نظری اور فراخ قلبی تھا وہ عقائد کے اختلاف عقائد کی حد تک رکھتے تھے ان اختلافات کو سیاسیات میں لانے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا دل بہت بڑا تھا اور دل میں علم کے ساتھ رواداری بھی موجود تھی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کے اختلافات کم ہوں اور ان کے درمیان زیادہ سے زیادہ محبت ورواداری کی فضا پیدا ہو۔"

فقہ حنفی کے پیرو اور اہلسنت والجماعت کے دو معروف فرقوں دیوبندی اور بریلوی نزاع کے متعلق ایک جلسہ عام میں فرمایا کہ:

"دیوبندی کہتے کہ بریلوی اللہ کی صفات اور قدرت میں غیر اللہ کو بھی

شامل کرتے ہیں اور اللہ کی ذات اور صفات میں غیر اللہ کو شامل اور شریک کرنا شرک ہے اس لیے وہ شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ (یعنی بریلوی) دین میں سنت کے علاوہ رسم ورواج کو ثواب سمجھ کر عمل کرتے ہیں اور انھیں جزو دین سمجھتے ہیں لہٰذا وہ اہل بدعت ہیں لیکن بریلوی مسلک کے لوگ اس کی تردید کرتے ہیں کہ وہ شرک وبدعت کے مرتکب ہیں۔

اسی طرح بریلوی حضرات کا موقف ہے کہ دیوبندی مکتبہ فکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کرام کے صحیح مقام کے قائل نہیں بلکہ وہ انھیں عام انسانوں کا درجہ دیتے ہیں لہٰذا وہ گستاخ رسول اور منکر اولیاء ہیں لیکن دیوبندی علماء اس کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نبی کو نبی اور ولی کو ولی کا درجہ دیتے ہیں لیکن مخلوق کو خالق کے برابر نہیں سمجھتے۔

اب آپ ہی بتائیں کہ جب دونوں فرقے ایک دوسرے پر الزامات کی تردید کرتے ہیں تو پھر یہ فساد اور قتال کیوں روا رکھا جارہا ہے؟

عام قاعدہ ہے کہ اقبال جرم کے بغیر سزا نہیں دی جاتی لیکن یہ عجیب تماشا ہے کہ محض الزامات کی بنیاد پر معرکہ آرائی کی جارہی ہے اور ملت کو تقسیم کردیا گیا ہے کیا یہ بہتر نہیں کہ دونوں قوتیں باہم مل کر اسلام کے نظام کے بارے میں مشترکہ جدوجہد کریں۔ اگر دونوں مسلک کے علما سو فیصد اتفاق نہیں کرسکتے تو چند امور پر اختلاف رکھتے ہوئے مشترکہ مقاصد کے لیے اکٹھے تو ہوسکتے ہیں۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

(خطاب خانیوال ۱۹۷۷ء)

اب آئے مسلک اہل حدیث کے راہنما اور معروف خطیب علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید جو پاکستان قومی اتحاد کے صف اول کے راہنماؤں میں شامل تھے سے

رجوع کرتے ہیں کہ وہ حضرت مفتی صاحب کے کردار کے اس پہلو پر کیا روشنی ڈالتے ہیں۔علامہ شہید فرماتے ہیں:

''انھوں (مفتی صاحب مرحوم) نے ایک دور میں ملک کے وسیع تر مفاد میں یہ فیصلہ کیا کہ طبقہ اہل سنت کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جائے۔اس سلسلے میں ایک سیاسی جماعت کی حلیف مذہبی جماعت سے دائمی اتحاد کی تجاویز اس سیاسی جماعت کے راہنما کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ انھیں اتحاد کے لیے آمادہ کریں اور جب اس جماعت کے سربراہ نے اپنی حلیف مذہبی جماعت کے سربراہ سے بات کی تو وہ کہنے لگے، خان صاحب! آپ ان باتوں میں نہ پڑیں ان لوگوں سے ہمارا اختلاف اصولی ہے فروعی نہیں ہے ہم ان سے کسی صورت میں نہیں مل سکتے۔ان کا یہ جواب سن کر انھیں بڑی مایوسی ہوئی اور انھوں نے مفتی صاحب کی موجودگی میں اس بات کا مجھ سے تذکرہ کیا۔یہ مفتی صاحب کے وسیع النظر اور وسیع الظرف ہونے کی دلیل تھی اس سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں انھوں نے ایسے مذہبی اتحاد کے لیے ایک دوبار ایسے اقدامات بھی کیے جو سیاسی طور پر ہی نہیں بلکہ جماعتی طور پر بھی ان کے لیے نقصان دہ تھے لیکن انھوں نے وسیع تر اتحاد کے لیے اپنی جماعتی اور سیاسی پوزیشن کو بھی داؤ پر لگا دیا۔یہ الگ بات ہے کہ ان کی کوششوں کے جواب میں دوسری طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے عقائد میں پختہ نہیں تھے۔وہ اپنے عقائد میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے البتہ وہ تنگ دل یا تنگ نظر نہیں تھے کیوں کہ تنگ نظری جہالت کی پیداوار ہوتی ہے۔ان کی غیر اہل سنت کے بارے میں طبع کتب پر خاصی وسیع نظر تھی اہل حدیث علما کے ساتھ وہ

ہمیشہ محبت کا اظہار کرتے تھے اور بعض شخصیتوں مثلاً مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا عبدالقادر قصوریؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ وغیرہ کا جب بھی نام لیتے تو بڑے احترام کے ساتھ ان کی علمی، دینی اور ملّی خدمات کا ذکر کرتے۔'' (قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر)

جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر اور پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور احمد اس ضمن میں فرماتے ہیں:

''فروعی اور فقہی اختلافات کو حد سے بڑھانے کے وہ سخت خلاف تھے۔ کسی دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والے صاحب کے پیچھے انھیں نماز پڑھنے سے گریزاں نہیں دیکھا۔

اور تو اور ایک دن انھوں نے میری موجودگی میں مولانا نورانی میاں صاحب سے کہا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی بنیادی نوعیت کا اختلاف نہیں ہے، فقہی معاملات میں ہمارا اور آپ کا مؤقف یکساں ہے پھر کیوں نہ ہم ایک مشترکہ جماعت کی تشکیل کرلیں؟ مفتی صاحب جب یہ کہہ رہے تھے تو بالکل سنجیدہ تھے لیکن انھیں کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔''

پروفیسر موصوف مزید ارشاد فرماتے ہیں:

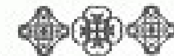
''یادداشت پر بے حد زور ڈالنے کے باوجود میں کوئی چیز ان کے خلاف نہیں ڈھونڈ سکتا۔انھیں کبھی ایک جماعت کے لیڈر کے طور پر بات کرتے نہیں سنا۔وہ ہمیشہ سب کے رہے، سب ہی کے نظر آئے انھیں حلیف سیاسی جماعتیں اپنی مشترکہ متاع سمجھتی تھیں۔''

پاکستان قومی اتحاد اور بھٹو حکومت میں مذاکرات کے بالکل آخری مرحلے میں اچانک ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا اور یوں وطن عزیز میں سیاسی بساط لپیٹ کر آمریت کی ایک بار پھر طرح ڈال دی گئی۔اگرچہ آمر وقت نے نوے دن میں انتخاب کرانے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ رفتہ رفتہ اپنے وعدے سے پھرتا چلا گیا اور اسلام کے نام

پر اپنے اقتدار کو طول دینے کی طویل پالیسی پر گامزن ہونے لگا تو حضرت مفتی صاحب نے قوم کو اس خطرے سے بروقت آگاہ کرتے ہوئے مارشل لاء حکومت کو متنبہ کیا کہ ان کے عزائم ملک وملت کے لیے سودمند ثابت نہیں ہوں گے لہٰذا جس قدر جلد وہ اپنے وعدے کے مطابق انتخابات کرا کر اقتدار عوامی نمائندوں کو سونپ دیں اسی قدر قوم اور خود ان کے لیے بہتر ہوگا۔ لیکن اقتدار کے نشے میں سرشار مارشل لاء حکمرانوں کے لیے یہ فغان درویش محض نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی اسلام کے نام پر غیر شرعی طریقے اختیار کیے گئے اور علما کا ایک طبقہ اپنی حمایت میں متحرک کر دیا گیا لیکن مولانا مفتی محمود کی بصیرت نے پھر قوم کی رہنمائی کی اور انھوں نے اعلانیہ اس دام تزویر کو تار تار کر دیا کہ یہ اسلام نہیں بلکہ اسلام کے نام پر فریب دیا جا رہا ہے۔ چناں چہ جہاں انھوں نے ایک طرف مارشل لاء حکومت کے خلاف تمام سیاسی جماعتوں سے رابطہ کرنے کے بعد ایک عظیم اتحاد کی طرف پیش رفت کی تو دوسری طرف زکوٰۃ جیسے شرعی قوانین کے سلسلے میں علما سے مذاکرات شروع کیے۔ اس مشن پر سفر حج پر روانہ ہوتے ہوئے ۱۴؍اکتوبر ۱۹۸۰ء کو کراچی کے علمائے کرام اور مفتیان عظام کا اجتماع جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں طلب کیا تاکہ علما کو حکومت وقت کی نام نہاد اسلامی اصلاحات کے پس پردہ اثرات ومحرکات کے بارے میں آگاہ کر سکیں۔

اجتماع میں حسب پروگرام حضرت مفتی صاحب نے حکومت کی جانب سے جبری زکوٰۃ کے مسئلہ پر اظہار خیال کرنا شروع کیا کہ اچانک خالق حقیقی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ تمام عمر اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرنے اور اس کے نظام کی حکمرانی کے لیے جدوجہد کرنے والا کیسے تاخیر کرتا؟

اور یوں بیت اللہ کا یہ مسافر اپنے عمل صالح کی متاع بے بہا لے کر خدا کے دین کی سربلندی کی گفتگو کرتے ہوئے علما کے اجتماع سے اس شان سے اپنے رب کے حضور روانہ ہوا کہ ایک عالم رشک اور حیرت کی کیفیت سے سرشار ہے۔



مقالاتِ مفتی محمودؒ سیمپوزیم بنوں ۱۹۹۶ء

تذکار محمودؒ

۱۳

مفتی محمود کا پارلیمانی کردار

سید ظہیر الدین ایڈووکیٹ
بنوں

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

(۱۳)

"جب مملکت خداداد پاکستان کے لیے مستقل آئین کا مرحلہ آیا تو مفتی صاحب نے اسمبلی کے اندر اور باہر بے مثال جدوجہد کی اور جب آئین سازی کے لیے تمام پارلیمانی پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک آئین ساز کمیٹی بنی۔ تو اسلام کا یہ سپاہی وہاں سینہ سپر ہو گیا اور اس جدوجہد کا ثمرہ تھا کہ ہمارے دستور میں پہلی بار چند اہم اسلامی دفعات شامل ہوئیں۔ دین اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔"

قومی اسمبلی کے پہلے عام انتخابات جنرل ایوب خان نے ۱۹۶۲ء میں بی ڈی سسٹم کے تحت کرائے اور اس طریقے سے ایوب خان نے بڑی عیاری سے قوم پر آمریت کی کاٹھی ڈالی۔ اگرچہ اس سے پہلے مولانا مفتی محمودؒ نے علمائے دیوبند کے وقار میں اضافہ کے لیے انتھک کوشش کی کیوں کہ انگریزوں نے علما کا وقار ختم کرنے کے لیے جو چالیں چلیں۔ اور ان سے علما کو جو نقصان پہنچا تھا۔ وہ ہندوستان کی دینی و سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اور یہ دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور علمائے دیوبند کی صداقت کی دلیل ہے کہ انگریزوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل سے پورے برصغیر میں جابجا مدرسے اور مسجدیں آج بھی انھی علما کے دم قدم سے آباد ہیں اور انگریزوں کی وجہ سے مدارس دینیہ کے نصاب اور نظام تعلیم میں جو ضعف و انحطاط پیدا ہو چکا تھا۔ مولانا مفتی محمودؒ کے حساس دل اور ہر لحظہ متحرک جسم نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور ۱۹۵۸ء میں مغربی پاکستان کے ان تمام مدارسِ دینیہ کا ایک اجلاس بلایا جن کا فکری رشتہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ تھا اور ان مدارسِ دینیہ کے سرکردہ علما نے مدارس کی اصلاح اور ترقی کے لیے "وفاق المدارس العربیہ" کے نام سے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ جس کی حیثیت دینی یونی ورسٹی کی طرح ہے اور مفتی صاحب یوم تاسیس سے لے کر آخر دم تک اس دینی یونی ورسٹی سے وابستہ رہے۔ مولانا مفتی محمودؒ نے ۱۹۶۲ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں انفرادی حیثیت میں حصہ لیا۔ کیوں کہ سیاسی جماعتوں پر پابندی تھی۔

مولانا مفتی محمودؒ نے اپنے تمام مخالف امیدواروں کی ضمانتیں ضبط کراتے ہوئے کامیابی حاصل کی۔ صرف ایک امیدوار نواب زادہ فتح اللہ خان اپنی ضمانت

بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

قومی اسمبلی کا ممبر منتخب ہونے کے بعد ایوب خان کی اسمبلی میں حزب اختلاف کا کردار ادا کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا کیوں کہ ہر رکن اسمبلی پولیس کی نظروں میں ہوتا تھا۔ حکومت لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتی لیکن مولانا مفتی محمود نے باد مخالف کی تمام تر تندی و تیزی کے باوجود اسلام اور آزادی اظہار کا چراغ اس جرأت سے روشن کیا کہ اپنے پرائے سب حیران رہ گئے۔

مفتی صاحب نے قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں حلف وفاداری کے موقع پر ہی ایوب خان کے غیر اسلامی، غیر جمہوری اور آمرانہ دستور کے خلاف بغاوت کر دی۔ انھوں نے حلف نامے کے اس جملے کے بعد کہ:

''دستور کو باقی اور قائم رکھوں گا''

اپنی طرف سے ان الفاظ کا اضافہ کیا

''اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس کو جوں کا توں رکھیں گے۔ بلکہ اس دستور کے دیے ہوئے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے ان جملہ خرابیوں اور خامیوں کو جو کہ کتاب وسنت یا جمہوری لحاظ سے اس میں ہوں گی ان میں ترمیم وتنسیخ کریں گے۔''

مفتی صاحب کے یہ الفاظ حلف کی کارروائی میں باقاعدہ درج ہوئے۔ اور ان کی نکتہ آفرینی، سیاسی بصیرت اور حق گوئی و بے باکی کے ہمیشہ کے لیے گواہ بن گئے۔

مفتی صاحب نے آزاد خارجہ پالیسی، بجٹ، عائلی قوانین پر جو تقریریں کیں، وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ انھوں نے بنیادی حقوق کے بل میں آزادی مذہب کی شق پر شدید اعتراض کیا۔ کیوں کہ اس طرح ارتداد کا راستہ کھلتا تھا۔ انھوں نے اس دفعہ میں یہ ترمیم پیش کی کہ ''کسی مسلمان کو مرتد ہونے کی اور ملک میں ارتداد کی اشاعت کی اجازت نہیں ہوگی۔'' مفتی صاحب نے دستور میں سربراہ مملکت کے لیے مسلمان ہونے کی ترمیم پیش کر کے اس چور دروازے کو بند کر دیا۔ جس کے ذریعے پاکستان

جیسے خالص مسلم ریاست کا سربراہ کسی وقت بھی غیر مسلم بن سکتا تھا۔

قومی اسمبلی میں دوسرا بڑا معرکہ جو حکومت اور مولانا مفتی محمودؒ مرحوم ومغفور کے درمیان لڑا گیا۔ اس کی بنیاد خلاف اسلام عائلی قوانین تھے۔ وہ معرکہ مفتی صاحب کی زندگی کا ایک تابناک باب ہے۔ مفتی صاحب نے یہ جاننے کے باوجود کہ ایوب خان اس مسئلے کو اپنے ذاتی وقار کا سوال بنا چکا ہے۔ اس آرڈیننس کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس موقع پر مفتی صاحب نے قومی اسمبلی میں جو تقریر کی وہ ایک گھنٹے دس منٹ پر محیط تھی۔ اس تقریر میں مفتی صاحب عائلی قوانین کا ایک ایک گوشہ زیر بحث لائے تھے۔ سارا ایوان مفتی صاحب کی ایمان افروز تقریر کی رو میں بہہ رہا تھا۔ اور اس مسئلے پر حکومت کی شکست یقینی ہوگئی تھی۔ کیوں کہ مفتی صاحب نے ممبران قومی اسمبلی کو اسلام کے مطابق قائل کر لیا تھا۔ مگر اس وقت اقتدار کے فرماں روا ڈپٹی اسپیکر نے کمال ہنر مندی سے کام لے کر رائے شماری کو اگلے وقت پر ڈال دیا۔ اس دوران اگر چہ حکومت ''ضمیر فروش نمائندگانِ قوم'' کا ضمیر خرید کر اس ''لعنت'' کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن عوامی سطح پر ایوب خان کی شہرت کو جو نقصان پہنچا۔ خود ایوب خان نے اپنی خودنوشت میں دو دفعہ اس کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد دوسرے عام انتخابات ایوب خان نے ۱۹۶۵ء میں کرائے اور چوں کہ ایوب خان عائلی قوانین کے آرڈیننس اور خاندانی منصوبہ بندی کے مسئلہ پر مفتی محمود کے لگائے ہوئے زخموں کو بھولا نہ تھا۔ چناں چہ مفتی صاحب کو ۱۹۶۵ء کے عام انتخابات میں اس کی سزا بھگتنا پڑی۔ ان کا انتخابی حلقہ جو ایک مضبوط قلعہ تھا۔ حکومت کی دست رس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں مفتی صاحب کو ناکام بنانے کے لیے خاص ہدایات جاری کردی گئیں۔ اس کے باوجود بھی مفتی صاحب نے الیکشن لڑا۔ لیکن حکومت کی انتہائی مداخلت کی وجہ سے مفتی صاحب یہ الیکشن ہار گئے۔ مگر حقیقت میں یہ ہار بھی ان کی جیت تھی۔

جب ۷؍دسمبر ۱۹۷۰ء کو ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ تو مغربی پاکستان میں

پیپلز پارٹی کے بعد بحیثیت مجموعی سب سے زیادہ ووٹ مفتی محمود صاحب کی جمعیت علمائے اسلام نے حاصل کیے۔ جب کہ مفتی صاحب نے یہ الیکشن بھی اپنے آبائی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان سے لڑا۔ اس دفعہ مدِ مقابل بھی پیپلز پارٹی کے چیئر مین مرحوم ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ اس مردِ درویش کے ہاتھوں بھٹو مرحوم کو تیرہ ہزار ووٹوں کی برتری سے ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اور مفتی صاحب ایک بار پھر قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوگئے اور پورے ملک میں یہ واحد سیٹ تھی جس پر مسٹر بھٹو کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور سارے ملک کے سیاسی لیڈروں نے مفتی صاحب کی کامیابی پر مختلف انداز میں تبصرے کیے لیکن سب سے دلچسپ تبصرہ بذاتِ خود جناب بھٹو صاحب مرحوم کا تھا۔ انھوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''میں آیندہ کبھی مفتی محمود صاحب کے مقابلے میں الیکشن نہیں لڑوں گا۔''

اور اس مقابلے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ مفتی محمود اور ان کی جمعیت علمائے اسلام آگے چل کر ملکی سیاست میں اہم کردار ادا کرے گی۔

آخر کار ان انتخابات کے سوا دو ماہ کے بعد یعنی ۳؍مارچ ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں طلب کرلیا۔ کیوں کہ شیخ مجیب الرحمان کو مشرقی پاکستان (سابقہ) میں زبردست اکثریت حاصل ہوگئی اور بحیثیت مجموعی عوامی لیگ ہی ملک کی سب سے بڑی پارلیمانی پارٹی تھی۔ اگر چہ جنرل یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو نے کافی کوشش کی کہ مفتی صاحب کو قومی اسمبلی کے مجوزہ اجلاس میں جو کہ ڈھاکہ میں منعقد کیا گیا تھا کے بائی کاٹ پر آمادہ کیا جاسکے۔ لیکن مفتی صاحب نے ایک منجھے ہوئے پارلیمینٹرین اور مدبر سیاست دان کی طرح یہ جواب دیا:

''چوں کہ عام انتخابات کے کافی عرصہ بعد قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا جارہا ہے۔ اس لیے اب اسے ملتوی نہیں کرنا چاہیے، نیز مشرقی پاکستان والے پہلے ہی شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں کہ انھیں اکثریت حاصل کرنے کے باوجود حکومت سازی کی دعوت نہیں دی جارہی ہے۔ اور اسمبلی کے اجلاس

میں غیر معمولی تاخیر ہوچکی ہے۔ لہٰذا اب اجلاس بلا کر ملتوی کرنا خوف ناک نتائج پیدا کرسکتا ہے۔ باقی رہا شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکات پر آئین مسلط کرنا تو ہم سب مغربی پاکستان کی مفادات کا تحفظ کریں گے۔ اگر ہم اس میں ناکام رہے تو قومی اسمبلی کے اجلاس سے واک آؤٹ کرجائیں گے۔''

مسٹر بھٹو ۱۲؍فروری کو مفتی صاحب سے پشاور میں ملے تھے۔ لیکن جب مفتی صاحب نے انکار کیا تو بھٹو صاحب نے پشاور ہی میں مجوزہ اجلاس کے بائی کاٹ کا اعلان کردیا۔ جس کے جواب میں مفتی صاحب نے اجلاس میں شرکت کا اعلان کیا۔ اور ۱۷؍فروری ۱۹۷۱ء کو ملتان میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''قومی اسمبلی کے بائی کاٹ سے ملک تقسیم ہوگیا تو اس کی تمام تر ذمہ داری مسٹر بھٹو پر عائد ہوگی۔''

آئین سازی کے معاملہ میں دوسری جماعتوں کے ۵۶؍ارکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ فوج کو سیاسی فریق قرار دے کر مسٹر بھٹو نے ناانصافی کی ہے۔ اور اس وقت کے درپیش مسائل کے بارے میں کہا:

''متنازعہ آئینی مسائل قومی اسمبلی کے اجلاس میں طے کیے جائیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کے ارکان کو اجلاس میں شرکت کرنا چاہیے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے قومی اسمبلی کے اجلاس کا بائی کاٹ کرکے راہِ فرار اختیار کی ہے۔ لیکن ہم ملک کے مفاد کی خاطر آخر دم تک اسمبلی کے اندر جنگ جاری رکھیں گے۔''

۲۰؍فروری ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان نے ایک دفعہ پھر مفتی صاحب پر زور دیا کہ وہ ۳؍مارچ کے ڈھاکہ اجلاس میں شرکت نہ کرنے کا اعلان کریں۔ مفتی صاحب نے یحییٰ خان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا:

''بالفرض شیخ مجیب نے اسمبلی کے اندر ہماری بات نہ مانی اور اپنے چھ نکات پر اصرار کر کے آئین بنالیا۔ تو ملک ٹوٹنے میں کئی سال لگ جائیں گے۔ لیکن اگر ۳ رمارچ کا بلایا ہوا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ تو ملک اسی سال ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جائے گا۔''

یحیٰی خان نہ مانے، ملک دو ٹکڑے ہو گیا، مفتی صاحب کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

۲۰ رفروری ۱۹۷۱ء کی شام مولانا مفتی محمود جب کراچی پہنچے، تو بھٹو مرحوم نے دوبارہ مفتی صاحب کو ۳ رمارچ کے اسمبلی اجلاس میں شرکت نہ کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔ حتیٰ کہ مفتی صاحب کی داڑھی پر ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن اس دھن کے پکے اور قول کے سچے مردِ مومن پر بھٹو کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ مفتی صاحب ۲۱ رفروری ۱۹۷۱ء کو کولمبو کے راستے ڈھاکہ پہنچے اور دھان منڈی میں شیخ مجیب کی رہائش گاہ پر دو گھنٹے تک ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں تفصیلی بات چیت ہوئی۔ یہ پہلے مغربی پاکستانی لیڈر تھے۔ جنھوں نے ڈھاکہ جا کر شیخ مجیب سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے سلسلے میں مفتی صاحب نے ڈھاکہ میں جو بیان دیا۔ پی پی آئی نے اس کو یوں رپورٹ کیا ہے۔

''عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب کی یہ زبردست خواہش ہے کہ پاکستان متحد اور مضبوط رہے۔ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ کہ چھ نکات پر مبنی آئین سے پاکستان کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔''

اور آج یہ بات کوئی راز نہیں رہی ہے کہ مفتی صاحب نہایت دل سوزی اور جگر داری کے ساتھ اجلاس کے حق میں آواز اٹھاتے رہے۔ لیکن ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''

یکم مارچ کو جنرل یحیٰی خان نے اسمبلی کے اجلاس کو کسی اگلی تاریخ پر ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ ''لیگل فریم آرڈر'' جس کے تحت انتخابات ہوئے تھے۔

یحیٰی خان کو اجلاس بلانے کا اختیار تو دیتا تھا۔ لیکن اجلاس ملتوی کرنے کی کوئی اجازت اس میں نہ تھی۔

متحدہ پاکستان کی بدقسمتی کی انتہا یہ تھی کہ سقوطِ ڈھاکہ وقوع پذیر ہوا اور وہ ساری کارروائی اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ مفتی صاحب نے آخر دم تک ملکی وقار پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے کی انتھک سعی کی۔ لیکن فوجی جنتا اپنے ہی منصوبے پر عمل پیرا رہی۔ اور مفتی صاحب کی سعیِ بسیار کے باوجود کسی بھی معقول تجویز کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ نتیجہ قوم کے سامنے ہے ۳ ردسمبر ۱۹۷۱ء سے ۱۷ ردسمبر ۱۹۷۱ء تک پاکستان اور اس کے سادہ لوح عوام کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ داستان بہت طویل بھی ہے اور دردناک بھی۔ ۱۶ ردسمبر ۱۹۷۱ء ہماری تاریخ کا وہ سیاہ دن ہے۔ جب ڈھاکہ میں ہماری افواج نے ہندوستانی سپاہ کے سامنے سرنڈر کیا۔ یعنی ہتھیار ڈال دیے۔ اس شام یحیٰی خان شراب کے نشے میں دھت ریڈیو پاکستان پر اعلان کر رہا تھا۔ ''جنگ جاری ہے۔ ہم دشمن سے برابر لڑتے رہیں گے'' اور جب صبح لوگ بیدار ہوئے تو اخبارات کی شہ سرخیاں چیخ رہی تھیں ''پاکستان نے جنگ بندی منظور کر لی'' اور تاریخ نے سارے حقائق اپنے دامن میں سمیٹ کر ورق پلٹ دیا۔ ۲۰ ردسمبر ۱۹۷۱ء کو یحیٰی خان گئے اور ذوالفقار علی بھٹو صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے آ گئے۔

قومی اسمبلی کے آئندہ اجلاس کے بارے میں ۶ رمارچ ۱۹۷۲ء کو پیپلز پارٹی، نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کے مابین ایک سہ فریقی معاہدہ طے پا گیا۔ لیکن بعد میں اس کی ایک شق پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ معاہدے پر ذوالفقار علی بھٹو، خان عبدالولی خان اور جناب مولانا مفتی محمود نے دستخط کیے تھے۔ لیکن اختلاف کی وجہ سے وہ معاہدہ ختم ہو گیا اور جب مسٹر بھٹو نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کے ارکان توڑنے میں ناکام ہو گئے۔ تو پھر مذاکرات کا سہارا لیا۔ ۲۲ راپریل ۱۹۷۲ء کو ایوانِ صدر میں مسٹر بھٹو، خان عبدالولی خان اور مولانا مفتی محمود کے مابین ازسرِنو سیاسی مذاکرات ہوئے اور ایک نئے سہ فریقی معاہدے پر ۲۷ راپریل ۱۹۷۲ء کو دستخط ہو گئے۔ جس کی رو سے نیپ

کے میر غوث بخش بزنجو اور ارباب سکندر خان خلیل بالترتیب صوبہ بلوچستان اور سرحد کے گورنر قرار پائے۔

۲۹/اپریل ۱۹۷۲ء کو کراچی میں انھوں نے حلف لیا۔ یکم مئی ۱۹۷۲ء کو مولانا مفتی محمود اور سردار عطاء اللہ خان مینگل نے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے وزرائے اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھالیا۔ اس طرح ۲۷/اپریل ۱۹۷۲ء کے معاہدے کی رو سے سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کی مخلوط حکومتیں قائم ہوگئیں۔ مارشل لا سے نجات پانے کے لیے عبوری آئین ۱۷/اپریل ۱۹۷۲ء کو منظور ہوا۔ اور ۲۱/اپریل ۱۹۷۲ء کو نافذ کیا گیا۔ اس آئین کی بنیاد صرف اور صرف اقتدار کا تحفظ تھا۔ یہ آئین تمام چھوٹی پارٹیوں کو ایک دوراہے پر لے آیا۔ ایک طرف مارشل لا تھا۔ دوسری طرف عبوری آئین۔ ان کے لیے دونوں ہی قابل قبول نہ تھے۔ چناں چہ انھوں نے متفقہ طور پر یہ راہ نکالی کہ اس آئین کے تضادات و اسقام پر زبردست تنقید کی جائے۔ لیکن رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ اس طرح عبوری آئین تو منظور ہوا۔ مگر مارشل لا کی چھتری سے نجات مل گئی۔ اس موقع پر مولانا مفتی محمود نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ’’جناب صدر! آج جب ہم اس ایوان میں جمع ہیں۔ عبوری آئین پر بحث ہمارے لیے بڑی مشکل ہے۔ ہمارے لیے اس آئین کی ہر دفعہ کی حمایت بھی مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن ہے۔ اس لیے کہ دفعات میں بہت سی خامیاں ہیں اور اگر اس آئین کی مخالفت کریں۔ تو اُدھر مارشل لا کی تلوار بھی لٹک رہی ہے۔ اگر یہ آئین پاس ہوتا ہے۔ تو مارشل لا یہاں سے ہٹتا ہے۔ اور نجات ملتی ہے اور پاس نہ ہو تو نہ معلوم کتنی مدت اور بھی قائم رہتا ہے۔
>
> بہر حال پھر بھی جو خامیاں ہیں اور ہمیں نظر آتی ہیں۔ ان کی نشان دہی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

> جناب صدر! ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک کو بناتے وقت یہ نعرہ لگایا گیا تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا ’’لا الہ الا اللہ‘‘ ہوگا۔ اور آپ بھی جانتے ہیں کہ چوبیس سال تک حکم رانوں اور سیاست دانوں نے اسلام کو سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کے نظریے اور دین و مذہب کا تعلق ہے۔ تو اس سے انحراف کی تمام کوششیں جاری ہیں۔ اس آئین میں ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا ہے۔ مگر بنظر عمیق دیکھنے سے بھی اسلام کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے آئینوں میں بھی اس کا یہی نام رکھا گیا تھا۔ مگر دور بین لگا کر بھی اس نظام میں اسلام کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے نام کو تو جمہوریہ کہا گیا ہے۔ مگر جمہوریت کی کوئی بات اس میں ہمیں نہیں مل سکتی اور اب بھی ملک مارشل لا کے تسلط میں چل رہا ہے۔‘‘

اس کے بعد مفتی صاحب نے کئی اسقام اور فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی کہ:

> ’’اس آئین میں اسلام کو ریاست کا مذہب نہیں قرار دیا گیا ہے۔ بنیادی حقوق کے نام پر ارتداد کی چھٹی دی گئی ہے۔ خلاف اسلام عائلی قوانین کو تحفظ دیا گیا ہے۔ سرکاری ملازمین کو تحفظ نہیں ہے۔ نظر بندی کے جابرانہ قوانین شامل آئین ہیں۔‘‘

بہر حال رائے شماری کے وقت اپوزیشن کے متفقہ فیصلے کے مطابق اس میں حصہ نہ لیا۔ اس طرح ۱۷/اپریل ۱۹۷۲ء کو یہ آئین منظور ہوا اور ۲۱/اپریل کو اس کے نفاذ کے ساتھ ہی مارشل لا ہٹا دیا گیا۔

آئین پاکستان کی تشکیل:

آئین اور دستور ایک ایسی دستاویز ہوتی ہے۔ جس پر ملک کے نظام کی گاڑی

چلتی ہے۔ ہمارے ملک کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے چھبیس سالوں تک اسلامی اور ملی تقاضوں سے ہم آہنگ کوئی دستور ملک اور قوم کو نہیں دیا۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء میں دو دستور ہمیں ملے۔ ان میں ون یونٹ کی بات تو تھی۔ وفاقی پارلیمانی نظام بھی تھا۔ اور صدارتی نظام بھی مگر اسلام، وہ اسلام جو کہ پاکستان کا سب سے بڑا تخلیقی عنصر تھا۔ وہ اسلام جس کے لیے لاکھوں افراد نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ وہ اسلام جس کے لیے لاکھوں افراد نے اپنا گھر بار چھوڑا تھا۔ وہ اسلام جو دین و دنیا کا جامع ہے۔ وہ نظام جو ہماری بقا کا ضامن ہے۔ وہ اسلام جو پاکستان کی بقا کے ہم معنی ہے۔ وہ اسلام جس کے لیے ہماری ماؤں، بہنوں، بہوؤں اور بیٹیوں کی عزتیں پامال ہوئیں۔ وہ اسلام ان دو دساتیر میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ ۱۹۶۲ء کے آئین کے خالق جنرل ایوب خان مرحوم تو پاکستان کے ساتھ ''اسلامیہ جمہوریہ'' کا سابقہ تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ ۱۹۵۶ء کا آئین مرتب کرنے والوں نے بھی اسلام کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا۔ یہ حکمرانوں کے ظلم و ستم تھے۔ دوسری طرف سیاست دان تھے۔ جنھوں نے سیاست و انتظام ملکی میں سیکولرازم، سوشلزم، ڈیماکریسی، اور صوبائی خود مختاری کے نام نہاد نعرے تو بلند کیے بنیادی جمہوری حقوق کے چیمپیئن بھی بہت تھے۔ زبانی جمع کلامی اسلام کا نام لینے والے بھی بہت سے تھے۔ مگر اسلام کے سنہری اصولوں کو دستور میں شامل کرنے والا یہ مرد درویش حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور اس کی جماعت جمعیت علمائے اسلام کی مساعی حد درجہ منفرد قابل ستائش اور ہماری پارلیمانی تاریخ کا درخشاں اور ناقابل فراموش باب ہے۔

جب مملکت خداداد پاکستان کے لیے مستقل آئین کا مرحلہ آیا تو مفتی صاحب نے اسمبلی کے اندر اور باہر بے مثال جدوجہد کی اور جب آئین سازی کے لیے تمام پارلیمانی پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک آئین ساز کمیٹی بنی۔ تو اسلام کا یہ سپاہی وہاں سینہ سپر ہوگیا اور اس جدوجہد کا ثمرہ تھا کہ ہمارے دستور میں پہلی بار چند اہم اسلامی دفعات شامل ہوئیں۔ دین اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ صدر

اور وزیر اعظم کو مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ان پانچ چیزوں پر ایمان رکھنے کے اقرار کا پابند کیا گیا (۱) توحید الٰہی، (۲) صحائف آسمانی جن میں قرآن پاک آخری صحیفہ ہے (۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر اور یہ کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں (۴) یوم قیامت پر (۵) قرآن و سنت کے تمام تقاضوں اور تعلیمات پر۔ مفتی صاحب بیان کرتے ہیں کہ اپوزیشن کو آئین میں اسلامی دفعات شامل کرانے میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پیپلز پارٹی کے ارکان نے ہر قدم پر رکاوٹیں پیدا کیں۔ قومی اسمبلی کے آئین ساز کمیٹی میں جب اپوزیشن نے وزیر اعظم کے مسلمان ہونے کی شرط پیش کی۔ تو حزب اقتدار کے ارکان نے اس کی مخالفت کی۔ رائے شماری پر اپوزیشن کی یہ قرارداد ایک ووٹ کی اکثریت سے تسلیم کر لی گئی۔ اس وقت کے مرکزی وزیر داخلہ عبدالقیوم خان ہر مرحلہ پر اس بات کی مخالفت کرتے رہے کہ صدر پاکستان اور وزیر اعظم کے لیے آئین میں مسلمان ہونے کی شرط رکھی جائے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مفتی صاحب نے صرف یہی نہیں کہ اسلامی زاویہ نگاہ سے پاکستان کے دستور کی تشکیل میں گراں قدر حصہ لیا۔ بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ جمہوری بنانے میں بھی مفتی صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ ملک کے ایک معروف ہفت روزہ ''لیل و نہار'' نے مفتی صاحب کے بارے میں ۴ر مارچ ۱۹۷۳ء کے شمارے میں تحریر کیا ہے کہ:

> ''مفتی صاحب بھٹو کے مقابلے میں ابھی تک ہر دباؤ اور تحریص کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور ان کے اس کردار کی وجہ سے بڑی حد تک نہ صرف دونوں صوبوں سرحد اور بلوچستان میں بحران کی گتھی سلجھے گی بلکہ قومی سطح پر حزب اختلاف کی منشا کے مطابق آمریت کے سایوں سے بچانے میں مدد ملے گی۔''

مستقل آئین کی تدوین کے موقع پر جب اپوزیشن نے سرکاری مسودۂ دستور پر اختلافی نوٹ لکھے، تو حکومت بوکھلا اٹھی۔ اور ایک بحران پیدا ہوگیا۔ حکومت کا الزام

یہ تھا کہ اپوزیشن نے ٢٠ ر اکتوبر کے سمجھوتے سے انحراف کیا ہے۔ اس آئینی سمجھوتے میں طے پایا تھا کہ

(الف) مملکت کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا۔

(ب) ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔

(ج) صدر مسلمان ہوگا اور صدر کے عہدے کا حلف لیتے وقت اس بات کا بھی حلف اٹھائے گا کہ وہ مسلمان ہے۔

(د) اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی جائے۔

(ہ) عدلیہ اور چیف الیکشن کمشنر انتظامیہ سے آزاد ہوں گے۔

(و) وفاقی پبلک سروس کمیشن میں ہر صوبے کے نمائندے ہوں گے، جن کا تقرر صدر مملکت صوبائی حکومتوں کی سفارش پر کریں گے۔

(ز) سرکاری ملازموں کی ملازمت کا تحفظ آئین میں شامل نہیں ہوگا۔ یہ تحفظ قانون کے تحت ہوگا جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے۔

(ح) آئین میں ترمیم قومی اسمبلی کے دو تہائی ارکان کی تائید سے ہو سکے گی۔ اور اس کے بعد سینیٹ میں سادہ اکثریت سے اس کی توثیق لازمی ہوگی۔

(ط) آئین میں شہریوں کے بنیادی حقوق کی ضمانت شامل ہوگی۔

(ی) شہریوں کو بلا جواز امتناعی نظر بندی کے خلاف تحفظ دی جائے گا۔

(ک) قومی اسمبلی کے ارکان کی تعداد دو سو دس (٢١٠) ہوگی جس میں دس خواتین شامل ہوں گی جنھیں اسمبلی کے باقی ارکان منتخب کریں گے۔

(ل) سینیٹ کے ارکان کی تعداد ساٹھ (٦٠) ہوگی جس میں ہر صوبے کے چودہ چودہ نمائندہ ہوں گے، اسلام آباد کے وفاقی علاقے کے دو اور قبائلی علاقوں کے دو ارکان سینیٹ کے رکن ہوں گے۔

اسی آئینی سمجھوتے پر پارلیمانی پارٹیوں کے نمائندوں (١) ذوالفقار علی بھٹو

(پیپلز پارٹی) (٢) عبدالقیوم خان (مسلم لیگ قیوم گروپ) (٣) غوث بخش بزنجو اور ارباب سکندر خان خلیل (نیپ) (٤) مولانا مفتی محمود (جمعیت علمائے اسلام) (٥) سردار شوکت حیات (کونسل مسلم لیگ) (٦) میجر جنرل جمال دار خان (قبائلی ارکان) (٧) مولانا شاہ احمد نورانی (جمعیت علمائے پاکستان) (٨) پروفیسر غفور احمد (جماعت اسلامی) اور (٩) سردار شیر باز خان مزاری (آزاد ارکان) کے دستخط تھے۔

لیکن اب حکومت اپوزیشن کو اس معاہدے سے انحراف کا الزام دے رہی تھی۔ اس موقع پر تمام پارلیمانی پارٹیوں کے راہ نماؤں کو ریڈیو اور ٹی وی پر اپنا مؤقف پیش کرنے کی اجازت دی گئی۔ مولانا مفتی محمود نے اس موقع پر جو معرکہ آرا تقریر کی اور جس طرح انٹرویو لینے والے کو صحیح اور مدلل جوابات دیے۔ وہ مفتی صاحب کی آئینی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دستور کے پر پیچ اور آئینی مندرجات پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ آئینی بحث پر یہ اس شخص کے خیالات ہیں جس نے ایک دن کے لیے بھی کسی لا کالج یا یونی ورسٹی سے قانون یا سیاسیات کا درس نہیں لیا ہے۔ بلکہ ساری عمر مدرسہ اور مسجد کی چٹائی اس کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔

بہر حال کافی بحث وتمحیص کے بعد حکومت نے اپوزیشن کے چند اہم مطالبات تسلیم کر لئے اور بعض مطالبات سے اپوزیشن دست بردار ہوئی اور اس طرح ١٠ ر اپریل ١٩٧٣ء کو اسمبلی نے متفقہ طور پر ایک آئین منظور کر لیا۔ جس کو ١٩٧٣ء کا آئین پاکستان کہا جاتا ہے۔ یہ پاکستان کا پہلا وفاقی آئین تھا۔ جسے عوام کے منتخب نمائندوں نے تشکیل دیا اور جس میں سابقہ تمام دساتیر کی نسبت اسلام کے اصولوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ ملی۔ نیز صوبائی خودمختاری کا مسئلہ بھی بالاتفاق طے ہوگیا۔

قادیانی مسئلے کا آئینی حل:

حضرت مولانا مفتی محمود مرحوم ومغفور کا بحیثیت پارلیمانی لیڈر سب سے شاندار کارنامہ مرزائیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دلوانا ہے۔ اور اللہ رب العزت

جب کسی سے کام لینا چاہے۔ تو انتظام بھی فرما دیتے ہیں۔ قادیانیوں کی پاکستان اور اسلام دشمن سرگرمیوں کے باعث مسلمانانِ پاکستان پہلے ہی برانگیختہ تھے۔ مئی ۱۹۷۴ء کے آخری دنوں میں منہ زور قادیانیوں نے ربوہ ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے مسلمان طلبہ پر تشدد کیا، یہ بھس میں چنگاری ڈالنے والی بات تھی۔ ملک بھر میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ چند ہی دنوں میں قادیانیوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ ۱۹۵۳ء میں ناموس رسالت کے مسئلے پر دس ہزار پاکستانی مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ غالباً ان کا خون رنگ لایا تھا اور قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ مسئلہ جس پر ہزاروں جانیں قربان ہوئی تھیں۔ ہزاروں لوگ جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ مفتی محمودؒ کی مدبرانہ اور عالمانہ سیاست کی وجہ سے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر کامیابی سے حل ہونے پر منتج ہوتا ہے۔ اور جب حکومت نے دیکھا کہ یہ سیل بے پناہ کس بھی طرح نہیں تھمتا تو وہ اس مسئلہ کو قومی اسمبلی میں لے گئی۔

مولانا مفتی محمود صاحب نے اس موقع پر اسمبلی کے اندر اور باہر جس محنت، لگن، اور تدبر سے یہ معرکہ سر کیا حقیقت میں انہی کا حق تھا۔ اور بلاشبہ اس پر وہ پوری ملت اسلامیہ کے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

۳۰ جون ۱۹۷۴ء کو حزب اختلاف کے ۳۷ ارکان نے جن میں سرفہرست مولانا مفتی محمود کا نام تھا یہ قرارداد ایوان میں پیش کی۔

جناب اسپیکر .... قومی اسمبلی پاکستان

محترمی!

ہم ذیل تحریک پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قادیان کے مرزا غلام احمد نے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ نیز ...... نبی ہونے کا اس کا جھوٹا اعلان قرآن پاک کی بہت سی آیتوں کو جھٹلانے اور جہاد کو ختم کرنے کی اس کی کوششیں اسلام کے بڑے بڑے احکامات کے خلاف غداری تھیں۔ وہ سامراج کی پیداوار تھا۔

اور اس کا واحد مقصد مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنا اور اسلام کو جھٹلانا تھا۔ پوری امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار چاہے وہ مرزا غلام احمد مذکور کی نبوت کا یقین رکھتے ہوں۔ یا اسے اپنا مذہبی مصلح یا مذہبی راہ نما، کسی بھی صورت میں گردانتے ہوں۔ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ ان کے پیروکار چاہے انھیں کوئی بھی نام دیا جائے۔ مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر اور اسلام کا ایک فرقہ ہونے کا بہانہ کر کے اندرونی اور بیرونی طور پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

عالمی مسلم تنظیموں کی ایک کانفرنس جو مکہ مکرمہ کے مقدس شہر میں رابطہ عالم اسلامی کے زیر انتظام ۶ رتا ۱۰ راپریل ۱۹۷۴ء کو منعقد ہوئی۔ اور جس میں دنیا بھر کے تمام حصوں سے ۱۴۰ مسلمان تنظیموں اور اداروں کے وفود نے شرکت کی۔ متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ قادیانیت اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ایک تخریبی تحریک ہے۔ جو ایک اسلامی فرقہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

اب اس اسمبلی کو یہ اعلان کرنے کی کارروائی کرنی چاہیے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار انھیں چاہے کوئی بھی نام دیا جائے مسلمان نہیں۔ اور یہ کہ قومی اسمبلی میں ایک سرکاری بل پیش کیا جائے، تاکہ اس اعلان کو مؤثر بنانے کے لیے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر ان کے جائز حقوق و مفادات اور تحفظ کے لیے احکام وضع کرنے کی خاطر آئین میں مناسب اور ضروری ترمیمات کی جائیں۔

یکم جولائی ۱۹۷۴ء کو اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے اور کوئی حل تجویز کرنے کی غرض سے قومی اسمبلی کے تمام ارکان پر مشتمل خصوصی کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا۔ ایک راہ بر کمیٹی قائم ہوئی۔ ''حزب اختلاف'' نے راہ بر کمیٹی کی معرفت تجویز کیا کہ چوں کہ اس معاملے کا ایک فریق قادیانی ہیں۔ لہٰذا انھیں بھی اسمبلی میں بلانا چاہیے اور ان کے دلائل سننے چاہئیں۔ تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے دلائل سنے بغیر فیصلہ کیا گیا ہے۔ حزب اختلاف کی اس تجویز پر قادیانی سربراہ مرزا ناصر احمد اور لاہوری پارٹی کے سربراہ کو اسمبلی میں طلب کیا گیا۔ مرزا ناصر احمد شلوار کرتے میں

جب کسی سے کام لینا چاہے۔ تو انتظام بھی فرما دیتے ہیں۔ قادیانیوں کی پاکستان اور اسلام دشمن سرگرمیوں کے باعث مسلمانانِ پاکستان پہلے ہی برانگیختہ تھے۔ مئی ۱۹۷۴ء کے آخری دنوں میں منہ زور قادیانیوں نے ربوہ ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے مسلمان طلبہ پر تشدد کیا، یہ جس میں چنگاری ڈالنے والی بات تھی۔ ملک بھر میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ چند ہی دنوں میں قادیانیوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

۱۹۵۳ء میں ناموس رسالت کے مسئلے پر دس ہزار پاکستانی مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ غالباً ان کا خون رنگ لایا تھا اور قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ مسئلہ جس پر ہزاروں جانیں قربان ہوئی تھیں۔ ہزاروں لوگ جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ مفتی محمودؒ کی مدبرانہ اور عالمانہ سیاست کی وجہ سے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر کامیابی سے حل ہونے پر منتج ہوتا ہے۔ اور جب حکومت نے دیکھا کہ یہ سیل بے پناہ کسی بھی طرح نہیں تھمتا تو وہ اس مسئلہ کو قومی اسمبلی میں لے گئی۔

مولانا مفتی محمود صاحب نے اس موقع پر اسمبلی کے اندر اور باہر جس محنت، لگن، اور تدبر سے یہ معرکہ سر کیا حقیقت میں انہی کا حق تھا۔ اور بلا شبہ اس پر وہ پوری ملت اسلامیہ کے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

۳۰ رجون ۱۹۷۴ء کو حزب اختلاف کے ۳۷ ارکان نے جن میں سرفہرست مولانا مفتی محمود کا نام تھا یہ قرارداد ایوان میں پیش کی۔

جناب اسپیکر .... قومی اسمبلی پاکستان

محترمی!

ہم ذیل تحریک پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قادیان کے مرزا غلام احمد نے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ نیز ...... نبی ہونے کا اس کا جھوٹا اعلان قرآن پاک کی بہت سی آیتوں کو جھٹلانے اور جہاد کو ختم کرنے کی اس کی کوششیں اسلام کے بڑے بڑے احکامات کے خلاف غداری تھیں۔ وہ سامراج کی پیداوار تھا۔

اور اس کا واحد مقصد مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنا اور اسلام کو جھٹلانا تھا۔ پوری امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار چاہے وہ مرزا غلام احمد مذکور کی نبوت کا یقین رکھتے ہوں۔ یا اسے اپنا مذہبی مصلح یا مذہبی راہ نما، کسی بھی صورت میں گردانتے ہوں۔ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ ان کے پیروکار چاہے انھیں کوئی بھی نام دیا جائے۔ مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر اور اسلام کا ایک فرقہ ہونے کا بہانہ کر کے اندرونی اور بیرونی طور پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

عالمی مسلم تنظیموں کی ایک کانفرنس جو مکہ مکرمہ کے مقدس شہر میں رابطہ عالم اسلامی کے زیر انتظام ۶ رتا ۱۰ راپریل ۱۹۷۴ء کو منعقد ہوئی۔ اور جس میں دنیا بھر کے تمام حصوں سے ۱۴۰ مسلمان تنظیموں اور اداروں کے وفود نے شرکت کی۔ متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ قادیانیت اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ایک تخریبی تحریک ہے۔ جو ایک اسلامی فرقہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

اب اس اسمبلی کو یہ اعلان کرنے کی کارروائی کرنی چاہیے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار انھیں چاہے کوئی بھی نام دیا جائے مسلمان نہیں۔ اور یہ کہ قومی اسمبلی میں ایک سرکاری بل پیش کیا جائے، تاکہ اس اعلان کو مؤثر بنانے کے لیے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر ان کے جائز حقوق و مفادات اور تحفظ کے لیے احکام وضع کرنے کی خاطر آئین میں مناسب اور ضروری ترمیمات کی جائیں۔

یکم جولائی ۱۹۷۴ء کو اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے اور کوئی حل تجویز کرنے کی غرض سے قومی اسمبلی کے تمام ارکان پر مشتمل خصوصی کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا۔ ایک راہ بر کمیٹی قائم ہوئی۔ ''حزب اختلاف'' نے راہ بر کمیٹی کی معرفت تجویز کیا کہ چوں کہ اس معاملے کا ایک فریق قادیانی ہیں۔ لہٰذا انھیں بھی اسمبلی میں بلانا چاہیے اور ان کے دلائل سننے چاہئیں۔ تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے دلائل سنے بغیر فیصلہ کیا گیا ہے۔ حزب اختلاف کی اس تجویز پر قادیانی سربراہ مرزا ناصر احمد اور لاہوری پارٹی کے سربراہ کو اسمبلی میں طلب کیا گیا۔ مرزا ناصر احمد شلوار ...... میں

ملبوس سفید طرے دار پگڑی باندھ کر آیا۔ متشرع سفید داڑھی، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی زبان پر لاتے تو پورے ادب کے ساتھ درود شریف پڑھتے۔ قرآن مجید کی آیت بھی پڑھ لیتے۔ سادہ لوح ارکانِ اسمبلی اس پر بڑے مخمصے میں پڑے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ داڑھی والے سفید پگڑی والے جو درود بھی بھیجتے ہیں۔ آیتیں بھی پڑھتے ہیں یہ کیسے کافر ہو سکتے ہیں؟ ایسے ماحول میں ارکان اسمبلی کے ذہنوں کو تبدیل کرنا آسان کام نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک کٹھن کام تھا۔ خود مفتی صاحب ماہ نامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک کے شمارہ جنوری ۱۹۷۵ء کے صفحہ نمبر ۴۱ پر بیان فرماتے ہیں۔

''یہ مسئلہ بہت بڑا اور مشکل تھا۔''

اب رب کائنات کی شان دیکھیے کہ پورے ایوان پر مشتمل اس خصوصی کمیٹی کے روبرو حزب اختلاف کی ترجمانی کا شرف مفتی صاحب کو عطا کیا۔ جنھوں نے راتوں کو جاگ کر مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابیں مطالعہ کیں۔ حوالے نوٹ کیے اور پھر سوالات کو ترتیب دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب مرزا غلام احمد کے طویل بیان کے بعد جرح کا آغاز ہوا۔ تو ماہ نامہ مذکورہ بالا کے مطابق بقول مفتی صاحب:

''ہمارا کام پہلے ہی دن بن گیا۔''

مرزا ناصر احمد پر جرح:

اُس روز قومی اسمبلی میں نمائندگانِ اسلام اور نمائندگان ارتداد کے مابین جو سوال و جواب ہوئے ان کی ایک جھلک آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ سوال مفتی صاحب کرتے تھے اور جواب مرزا ناصر احمد دیتا تھا۔

سوال: مرزا غلام احمد کے بارے میں آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب: وہ امتی نبی تھے۔ امتی نبی کا معنی یہ ہے کہ امت محمدیہ کا فرد جو آپ کے کامل اتباع کی وجہ سے نبوت کا مقام حاصل کرلے۔

سوال: اس پر وحی بھی آتی تھی؟

جواب: آتی تھی۔

سوال: خطا کا کوئی احتمال؟

جواب: بالکل نہیں۔

سوال: مرزا قادیانی نے لکھا ہے کہ جو شخص مجھ پر ایمان نہیں لاتا ''خواہ اس کو میرا نام نہ پہنچا ہو'' کافر ہے۔ پکا کافر۔ دایرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس عبارت سے تو ستر کروڑ مسلمان سب کافر ہیں؟

جواب: کافر تو ہیں۔ لیکن چھوٹے کافر ہیں، جیسا کہ امام بخاری نے اپنے صحیح میں ''کفر دون کفر'' کی روایت درج کی ہے۔

سوال: آگے مرزا نے لکھا ہے۔ پکا کافر؟

جواب: اس کا مطلب ہے اپنے کفر میں پکے ہیں۔

سوال: آگے لکھا ہے دایرۂ اسلام سے خارج ہے۔ حال آں کہ چھوٹا کفر ملت سے خارج ہونے کا سبب نہیں بنتا ہے؟

جواب: دراصل دایرہ اسلام کے کئی دوایر ہیں۔ اور مختلف کیٹی گریاں (Categrces) ہیں۔ اگر بعض سے نکلا ہے تو بعض سے نہیں نکلا ہے۔

سوال: ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ جہنمی بھی ہے؟

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ممبروں نے جب یہ سنا تو سب کے کان کھڑے ہوگئے کہ اچھا ہم جہنمی ہیں۔ اس سے ممبروں کو دھچکا لگا۔ وہ سمجھ گئے کہ ہم تو انھیں مسلمان کہتے ہیں اور وہ ہمیں کافر قرار دیتے ہیں۔ ادھر نیا سوال آیا کہ مرزا قادیانی سے پہلے کوئی نبی آیا ہے جو امتی نبی ہو؟ کیا صدیق اکبرؓ یا حضرت عمر فاروقؓ امتی نبی تھے۔ جواب تھا......نہیں۔

اس پر مفتی صاحب نے کہا پھر تو اس کے مرنے کے بعد آپ کا اور ہمارا عقیدہ ایک ہوگیا۔ جو ہمارا تصور ہے۔ خاتم النبیین کے متعلق وہی آپ کا بھی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم سمجھتے ہیں۔ تم مرزا قادیانی کے بعد

ملبوس سفید طرے دار پگڑی باندھ کر آیا۔ متشرع سفید داڑھی، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی زبان پر لاتے تو پورے ادب کے ساتھ درود شریف پڑھتے۔ قرآن مجید کی آیت بھی پڑھ لیتے۔ سادہ لوح ارکانِ اسمبلی اس پر بڑے مخمصے میں پڑے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ داڑھی والے سفید پگڑی والے جو درود بھی بھیجتے ہیں۔ آیتیں بھی پڑھتے ہیں یہ کیسے کافر ہو سکتے ہیں؟ ایسے ماحول میں ارکان اسمبلی کے ذہنوں کو تبدیل کرنا آسان کام نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک کٹھن کام تھا۔ خود مفتی صاحب ماہ نامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک کے شمارہ جنوری ۱۹۷۵ء کے صفحہ نمبر ۴۱ پر بیان فرماتے ہیں۔

''یہ مسئلہ بہت بڑا اور مشکل تھا۔''

اب رب کائنات کی شان دیکھیے کہ پورے ایوان پر مشتمل اس خصوصی کمیٹی کے روبرو حزب اختلاف کی ترجمانی کا شرف مفتی صاحب کو عطا کیا۔ جنھوں نے راتوں کو جاگ کر مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابیں مطالعہ کیں۔ حوالے نوٹ کیے اور پھر سوالات کو ترتیب دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب مرزا غلام احمد کے طویل بیان کے بعد جرح کا آغاز ہوا۔ تو ماہ نامہ مذکورہ بالا کے مطابق بقول مفتی صاحب:

''ہمارا کام پہلے ہی دن بن گیا۔''

مرزا ناصر احمد پر جرح:

اُس روز قومی اسمبلی میں نمائندگانِ اسلام اور نمائندگان ارتداد کے مابین جو سوال و جواب ہوئے ان کی ایک جھلک آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ سوال مفتی صاحب کرتے تھے اور جواب مرزا ناصر احمد دیتا تھا۔

سوال: مرزا غلام احمد کے بارے میں آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب: وہ امتی نبی تھے۔ امتی نبی کا معنی یہ ہے کہ امت محمدیہ کا فرد جو آپ کے کامل اتباع کی وجہ سے نبوت کا مقام حاصل کر لے۔

سوال: اس پر وحی بھی آتی تھی؟

جواب: آتی تھی۔

سوال: خطا کا کوئی احتمال؟

جواب: بالکل نہیں۔

سوال: مرزا قادیانی نے لکھا ہے کہ جو شخص مجھ پر ایمان نہیں لاتا ''خواہ اس کو میرا نام نہ پہنچا ہو'' کافر ہے۔ پکا کافر۔ دایرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس عبارت سے تو ستر کروڑ مسلمان سب کافر ہیں؟

جواب: کافر تو ہیں۔ لیکن چھوٹے کافر ہیں، جیسا کہ امام بخاری نے اپنے صحیح میں ''کفر دون کفر'' کی روایت درج کی ہے۔

سوال: آگے مرزا نے لکھا ہے۔ پکا کافر؟

جواب: اس کا مطلب ہے اپنے کفر میں پکے ہیں۔

سوال: آگے لکھا ہے دایرۂ اسلام سے خارج ہے۔ حال آں کہ چھوٹا کفر ملت سے خارج ہونے کا سبب نہیں بنتا ہے؟

جواب: دراصل دایرہ اسلام کے کئی دوایر ہیں۔ اور مختلف کیٹی گریاں (Categrces) ہیں۔ اگر بعض سے نکلا ہے تو بعض سے نہیں نکلا ہے۔

سوال: ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ جہنمی بھی ہے؟

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ممبروں نے جب یہ سنا تو سب کے کان کھڑے ہوگئے کہ اچھا ہم جہنمی ہیں۔ اس سے ممبروں کو دھچکا لگا۔ وہ سمجھ گئے کہ ہم تو انھیں مسلمان کہتے ہیں اور وہ ہمیں کافر قرار دیتے ہیں۔ ادھر نیا سوال آیا کہ مرزا قادیانی سے پہلے کوئی نبی آیا ہے جو امتی نبی ہو؟ کیا صدیق اکبرؓ یا حضرت عمر فاروقؓ امتی نبی تھے۔ جواب تھا......نہیں۔

اس پر مفتی صاحب نے کہا پھر تو اس کے مرنے کے بعد آپ کا اور ہمارا عقیدہ ایک ہوگیا۔ جو ہمارا تصور ہے۔ خاتم النبیین کے متعلق وہی آپ کا بھی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم سمجھتے ہیں۔ تم مرزا قادیانی کے بعد

ایسا سمجھتے ہو۔تو گویا تمہارا خاتم النبیین مرزا غلام احمد ہے۔ اور ہمارے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

مرزا ناصر: وہ فنافی الرسول تھے۔ یہ ان کا اپنا کمال تھا۔ وہ تو عین محمد ہو گئے تھے (معاذ اللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے زیادہ توہین کیا ہو سکتی تھی۔ منکروں کو ’’ذریۃ البغایا‘‘ کہنے کی بات بھی ہوئی۔

مفتی صاحب نے کہا: مرزا قادیانی نے اپنے کتابوں کے بارے میں لکھا ہے:

تلك كتب ينظر اليها كل مسلم بعين المحبته والمودة وينتفع من معارفها ويقبلني دعوتي الا ذرية البغايا الن ين ختم الله علي قلوبهم فهم لا يقبلون.

’’ان کتابوں کو ہر مسلم محبت ومودت کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے اور ان کے معارف سے نفع اٹھاتا ہے، مجھے قبول کرتا ہے اور دعوے کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر بدکار عورتوں کی اولاد، وہ لوگ جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا رکھی ہے۔ وہ مجھے قبول نہیں کرتے۔‘‘

مرزا ناصر: بغایا کے معنی سرکشوں کے ہیں۔

مفتی صاحب: بغایا کا لفظ قرآن پاک میں آیا ہے۔

وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا. (سورۂ مریم:۲۸)

’’اور تیری ماں بدکارہ نہ تھیں۔‘‘

مرزا ناصر: قرآن میں بغیا ہے بغایا نہیں۔

مفتی صاحب: صرف مفرد اور جمع کا فرق ہے، نیز جامع ترمذی شریف میں اس مفہوم میں لفظ بغایا بھی مذکور ہے یعنی البغایا اللاتی ینکحن انفسھن بغیر بینة. میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں۔ کہ تم اس لفظ ’’بغیہ‘‘ کا استعمال اس معنی (بدکارہ) کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں ہرگز نہیں دکھا سکتے۔

یہ جرح تیرہ روز تک جاری رہی۔ گیارہ دن ربوہ گروپ پر جو مرزا قادیانی کو نبی

تسلیم کرتا ہے اور دو دن لاہوری گروپ پر جو مرزا قادیانی کو مجدد مانتا ہے۔ ہر روز آٹھ گھنٹے جرح ہوئی۔ اس طویل جرح وتنقید نے قادیانیت کے بھیانک چہرے کو بے نقاب کر دیا۔ حزب اختلاف نے ’’ملتِ اسلامیہ کا مؤقف‘‘ کے عنوان سے دو سو صفحات پر مشتمل ایک مطبوعہ دستاویز ارکانِ اسمبلی میں تقسیم کی۔ شہنشاہ حقیقی نے اپنے خصوصی فضل ورحمت کے ساتھ ایسی کایا پلٹی کہ ممبران قومی اسمبلی قادیانیت کا کماحقہ احتساب کرنے پر تل گئے۔ اور انھوں نے مسٹر بھٹو کو صاف صاف لفظوں میں بتا دیا کہ بے شک آپ ہمارے سیاسی لیڈر ہیں۔ لیکن یہ معاملہ خالص دین ومذہب کا ہے۔

۲۲/اگست ۱۹۷۴ء کو حزب اختلاف کے چھ راہ نماؤں کی جو کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، پروفیسر غفور احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، چوہدری ظہور الٰہی، مسٹر غلام فاروق اور سردار مولا بخش سومرو اور حزب اقتدار کے عبدالحفیظ پیرزادہ پر مشتمل ایک سب کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ سب کمیٹی کے ذمے یہ کام لگا کہ وہ مذاکرات اور افہام وتفہیم کے ذریعے قادیانی مسئلے کا حل متفقہ طور پر تلاش کرے۔ ۲۲/اگست سے ۵/ستمبر کی شام تک اس کمیٹی کے بہت سے اجلاس ہوئے مگر متفقہ حل کی صورت گری ممکن نہ ہو سکی۔

سب سے زیادہ جھگڑا دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم کے مسئلے پر ہوا۔ اس دفعہ کے تحت صوبائی اسمبلیوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو نمائندگی دی گئی ہے۔ بلوچستان میں ایک، سرحد میں ایک، سندھ میں دو اور پنجاب میں تین سیٹیں اور چھ اقلیتوں کے نام لکھے ہیں۔ عیسائی، ہندو، سکھ، پارسی، بدھ، اور شیڈول کاسٹ یعنی اچھوت۔ حزب اختلاف کے نمائندگان چاہتے تھے۔ ان چھ کی قطار میں قادیانیوں کو بھی شامل کیا جائے۔ تاکہ کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ اس کے لیے حکومت تیار نہ تھی۔ اور ویسے بھی قادیانیوں کا نام اچھوتوں کے ساتھ پیوست پڑتا تھا۔ پیرزادہ نے کہا اس کو رہنے دیں۔ مفتی صاحب نے کہا کہ جب اور اقلیتی فرقوں کے نام فہرست میں شامل ہیں۔ تو ان کے نام بھی لکھ دیں۔ پیرزادہ نے جواب دیا کہ اور اقلیتی فرقوں کا مطالبہ تھا۔ جب کہ مرزائیوں کی ڈیمانڈ نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ یہ تو تمہاری تنگ نظری اور ہماری فراخ دلی کا

ایسا سمجھتے ہو۔ تو گویا تمہارا خاتم النبیین مرزا غلام احمد ہے۔ اور ہمارے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

مرزا ناصر: وہ فنافی الرسول تھے۔ یہ ان کا اپنا کمال تھا۔ وہ تو عین محمد ہو گئے تھے (معاذ اللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے زیادہ توہین کیا ہو سکتی تھی۔ منکروں کو "ذریۃ البغایا" کہنے کی بات بھی ہوئی۔

مفتی صاحب نے کہا: مرزا قادیانی نے اپنے کتابوں کے بارے میں لکھا ہے:

تلك كتب ينظر اليها كل مسلم بعين المحبته والمودة وينتفع من معارفها ويقبلني دعوتي الا ذرية البغايا الن ين ختم الله علي قلوبهم فهم لا يقبلون.

"ان کتابوں کو ہر مسلم محبت ومودت کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے اور ان کے معارف سے نفع اٹھاتا ہے، مجھے قبول کرتا ہے اور دعوے کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر بدکار عورتوں کی اولاد، وہ لوگ جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا رکھی ہے۔ وہ مجھے قبول نہیں کرتے۔"

مرزا ناصر: بغایا کے معنی سرکشوں کے ہیں۔

مفتی صاحب: بغایا کا لفظ قرآن پاک میں آیا ہے۔

وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا. (سورۂ مریم: ۲۸)

"اور تیری ماں بدکارہ نہ تھی۔"

مرزا ناصر: قرآن میں بغیا ہے بغایا نہیں۔

مفتی صاحب: صرف مفرد اور جمع کا فرق ہے، نیز جامع ترمذی شریف میں اس مفہوم میں لفظ بغایا بھی مذکور ہے یعنی البغايا اللاتي ينكحن انفسهن بغير بينة۔ میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں۔ کہ تم اس لفظ "بغیہ" کا استعمال اس معنی (بدکارہ) کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں ہرگز نہیں دکھا سکتے۔

یہ جرح تیرہ روز تک جاری رہی۔ گیارہ دن ربوہ گروپ پر جو مرزا قادیانی کو نبی

تسلیم کرتا ہے اور دو دن لاہوری گروپ پر جو مرزا قادیانی کو مجدد مانتا ہے۔ ہر روز آٹھ گھنٹے جرح ہوئی۔ اس طویل جرح وتنقید نے قادیانیت کے بھیانک چہرے کو بے نقاب کر دیا۔ حزب اختلاف نے "ملتِ اسلامیہ کا موقف" کے عنوان سے دو سو صفحات پر مشتمل ایک مطبوعہ دستاویز ارکانِ اسمبلی میں تقسیم کی۔ شہنشاہ حقیقی نے اپنے خصوصی فضل ورحمت کے ساتھ ایسی کایا پلٹی کہ ممبران قومی اسمبلی قادیانیت کا کماحقہ احتساب کرنے پر تل گئے۔ اور انھوں نے مسٹر بھٹو کو صاف صاف لفظوں میں بتا دیا کہ بے شک آپ ہمارے سیاسی لیڈر ہیں۔ لیکن یہ معاملہ خالص دین ومذہب کا ہے۔

۲۲ راگست ۱۹۷۴ء کو حزب اختلاف کے چھ راہنماؤں کی جو کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، پروفیسر غفور احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، چوہدری ظہور الٰہی، مسٹر غلام فاروق اور سردار مولا بخش سومرو اور حزب اقتدار کے عبدالحفیظ پیرزادہ پر مشتمل ایک سب کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ سب کمیٹی کے ذمے یہ کام لگا کہ وہ مذاکرات اور افہام وتفہیم کے ذریعے قادیانی مسئلے کا حل متفقہ طور پر تلاش کرے۔ ۲۲ راگست سے ۵ رستمبر کی شام تک اس کمیٹی کے بہت سے اجلاس ہوئے مگر متفقہ حل کی صورت گری ممکن نہ ہو سکی۔

سب سے زیادہ جھگڑا دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم کے مسئلے پر ہوا۔ اس دفعہ کے تحت صوبائی اسمبلیوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو نمائندگی دی گئی ہے۔ بلوچستان میں ایک، سرحد میں ایک، سندھ میں دو اور پنجاب میں تین سیٹیں اور چھ اقلیتوں کے نام لکھے ہیں۔ عیسائی، ہندو، سکھ، پارسی، بدھ، اور شیڈول کاسٹ یعنی اچھوت۔ حزب اختلاف کے نمائندگان چاہتے تھے۔ ان چھ کی قطار میں قادیانیوں کو بھی شامل کیا جائے۔ تاکہ کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ اس کے لیے حکومت تیار نہ تھی۔ اور ویسے بھی قادیانیوں کا نام اچھوتوں کے ساتھ پیوست پڑتا تھا۔ پیرزادہ نے کہا اس کو رہنے دیں۔ مفتی صاحب نے کہا کہ جب اور اقلیتی فرقوں کے نام فہرست میں شامل ہیں۔ تو ان کے نام بھی لکھ دیں۔ پیرزادہ نے جواب دیا کہ اور اقلیتی فرقوں کا مطالبہ تھا۔ جب کہ مرزائیوں کی ڈیمانڈ نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ یہ تو تمہاری تنگ نظری اور ہماری فراخ دلی کا

ثبوت ہے کہ ہم ان کو ڈیمانڈ کیے بغیر ان کا حق انھیں دے رہے ہیں۔ ۷/ستمبر کو اسمبلی نے متفقہ فیصلہ سنانا تھا اور ۵/ستمبر کی شام تک کمیٹی کوئی فیصلہ ہی نہ کر سکی۔ چناں چہ ۶/ستمبر کو مسٹر بھٹو نے مولانا مفتی محمود سمیت سب کمیٹی کے ارکان کو پرائم منسٹر ہاؤس بلایا۔ جہاں دو گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے باوجود بنیادی نقطہ نظر پر کوئی اتفاق رائے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ حکومت کی انتہائی کوشش تھی کہ آئین کے دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم کا مسئلہ رہنے دیا جائے۔ جب کہ اپوزیشن سمجھتی تھی کہ اس کے بغیر حل ادھورا رہے گا۔ بڑی بحث و تمحیص کے بعد مسٹر بھٹو نے کہا کہ میں سوچوں گا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں دوبارہ بلاؤں گا۔ عصر کو اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ پیرزادہ نے مفتی صاحب کو دیگر ارکان سمیت اسپیکر صاحب کے کمرے میں بلالیا۔ اپوزیشن نے اپنا مؤقف پھر واضح کیا کہ دفعہ ۱۰۶ میں چھ اقلیتی فرقوں کے ساتھ مرزائیوں کی تصریح کی جائے۔ اور بریکٹ میں ''قادیانی گروپ اور لاہوری گروپ'' لکھا جائے۔ پیرزادہ نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو مرزائی نہیں کہتے احمدی کہتے ہیں۔ مفتی صاحب نے کہ کہ احمدی تو ہم ہیں۔ ہم ان کو احمدی تسلیم نہیں کرتے پھر مفتی صاحب نے کہا کہ چلو ''مرزا غلام احمد کے پیرکار'' لکھ دو۔ پیرزادہ نے نکتہ اٹھایا کہ ''آئین میں کسی شخص کا نام نہیں ہوتا'' حال آں کہ دستور میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قائداعظم کے نام موجود ہیں۔ اور پھر سوچ کر بولے مفتی صاحب! مرزا کے نام سے دستور کو کیوں پلید کرتے ہو، پیرزادہ صاحب کا خیال تھا شاید مفتی اس حیلے سے ٹل جائیں۔ مفتی صاحب نے فوراً جواب دیا شیطان ابلیس خنزیر اور فرعون کے نام بھی تو قرآن پاک میں موجود ہیں۔ اس سے قرآن پاک کی صداقت و تقدس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پیرزادہ لاجواب ہو کر کہنے لگے۔ ایسا لکھ دو جو اپنے آپ کو احمدی کہلاتے ہیں۔ مفتی صاحب کہتے ہیں میں نے کہا بریکٹ بند ثانوی درجہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حرف وضاحت کے لیے ہوتا ہے۔ یوں لکھ دو ''قادیانی گروپ، لاہوری گروپ'' جو اپنے آپ کو احمدی کہلاتے ہیں، اور اس پر فیصلہ ہو گیا۔

تاریخی فیصلہ:

۷/ستمبر ۱۹۷۴ء ہماری پارلیمانی تاریخ کا وہ یادگار دن ہے۔ جب ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کے شہیدان ختم نبوت کا خون رنگ لایا اور ہماری قومی اسمبلی نے ملی امنگوں کی ترجمانی کی اور عقیدہ ختم نبوت کو آئینی تحفظ دے کر قادیانیوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا۔

اس روز دستور کی دفعہ ۲۶۰ میں اس تاریخی شق کا اضافہ ہوا کہ:

''جو شخص خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر مکمل اور غیر مشروط ایمان نہ رکھتا ہو۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی معنی و مطلب یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعوے دار ہو یا اس قسم کا دعویٰ کرنے والے کو پیغمبر یا مذہبی مصلح مانتا ہو۔ وہ آئین یا قانون کے مقاصد کے ضمن میں مسلمان نہیں ہے۔''

دفعہ ۱۰۶ کی شکل کچھ یوں بنی:

''بلوچستان، پنجاب، سرحد اور سندھ کے صوبوں کی صوبائی اسمبلیوں میں ایسے افراد کے لیے مخصوص فاضل نشستیں ہوں گی، جو عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ اور پارسی فرقوں اور قادیانی گروہ یا لاہوری افراد (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) یا شیڈول کاسٹس سے تعلق رکھتے ہیں، بلوچستان ایک۔ سرحد ایک۔ پنجاب تین۔ اور سندھ دو۔''

ان دستوری ترامیم کے علاوہ یہ تین سفارشات آئیں:

(ا) تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ الف میں حسب ذیل تشریح درج کی جائے:

''کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ ۲۶۰ کی شق نمبر ۳ کی تصریحات کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے خلاف اقرار، عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ہذا کے تحت مستوجب سزا ہوگا۔ تعزیرات پاکستان کی

ثبوت ہے کہ ہم ان کو ڈیمانڈ کیے بغیر ان کا حق انھیں دے رہے ہیں۔ ۷ رستمبر کو اسمبلی نے متفقہ فیصلہ سنانا تھا اور ۵ رستمبر کی شام تک کمیٹی کوئی فیصلہ ہی نہ کر سکی۔ چناں چہ ۶ رستمبر کو مسٹر بھٹو نے مولانا مفتی محمود سمیت سب کمیٹی کے ارکان کو پرائم منسٹر ہاؤس بلایا۔ جہاں دو گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے باوجود بنیادی نقطہ نظر پر کوئی اتفاق رائے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ حکومت کی انتہائی کوشش تھی کہ آئین کے دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم کا مسئلہ رہنے دیا جائے۔ جب کہ اپوزیشن سمجھتی تھی کہ اس کے بغیر حل ادھورا رہے گا۔ بڑی بحث و تمحیص کے بعد مسٹر بھٹو نے کہا کہ میں سوچوں گا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں دوبارہ بلاؤں گا۔ عصر کو اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ پیرزادہ نے مفتی صاحب کو دیگر ارکان سمیت اسپیکر صاحب کے کمرے میں بلالیا۔ اپوزیشن نے اپنا موقف پھر واضح کیا کہ دفعہ ۱۰۶ میں چھ اقلیتی فرقوں کے ساتھ مرزائیوں کی تصریح کی جائے۔ اور بریکٹ میں ''قادیانی گروپ اور لاہوری گروپ'' لکھا جائے۔ پیرزادہ نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو مرزائی نہیں کہتے احمدی کہتے ہیں۔ مفتی صاحب نے کہ کہ احمدی تو ہم ہیں۔ ہم ان کو احمدی تسلیم نہیں کرتے پھر مفتی صاحب نے کہا کہ چلو ''مرزا غلام احمد کے پیرکار'' لکھ دو۔ پیرزادہ نے نکتہ اٹھایا کہ ''آئین میں کسی شخص کا نام نہیں ہوتا'' حال آں کہ دستور میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قائد اعظم کے نام موجود ہیں۔ اور پھر سوچ کر بولے مفتی صاحب! مرزا کے نام سے دستور کو کیوں پلید کرتے ہو، پیرزادہ صاحب کا خیال تھا شاید مفتی اس حیلے سے ٹل جائیں۔ مفتی صاحب نے فوراً جواب دیا شیطان ابلیس خنزیر اور فرعون کے نام بھی تو قرآن پاک میں موجود ہیں۔ اس سے قرآن پاک کی صداقت و تقدس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پیرزادہ لاجواب ہو کر کہنے لگے۔ ایسا لکھ دو جو اپنے آپ کو احمدی کہلاتے ہیں۔ مفتی صاحب کہتے ہیں میں نے کہا بریکٹ بند ثانوی درجہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حرف وضاحت کے لیے ہوتا ہے۔ یوں لکھ دو ''قادیانی گروپ، لاہوری گروپ'' جو اپنے آپ کو احمدی کہلاتے ہیں، اور اس پر فیصلہ ہو گیا۔

تاریخی فیصلہ:

۷ رستمبر ۱۹۷۴ء ہماری پارلیمانی تاریخ کا وہ یادگار دن ہے۔ جب ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کے شہیدان ختم نبوت کا خون رنگ لایا اور ہماری قومی اسمبلی نے ملی امنگوں کی ترجمانی کی اور عقیدہ ختم نبوت کو آئینی تحفظ دے کر قادیانیوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا۔

اس روز دستور کی دفعہ ۲۶۰ میں اس تاریخی شق کا اضافہ ہوا کہ:

''جو شخص خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر مکمل اور غیر مشروط ایمان نہ رکھتا ہو۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی معنی و مطلب یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعوے دار ہو یا اس قسم کا دعویٰ کرنے والے کو پیغمبر یا مذہبی مصلح مانتا ہو۔ وہ آئین یا قانون کے مقاصد کے ضمن میں مسلمان نہیں ہے۔''

دفعہ ۱۰۶ کی شکل کچھ یوں بنی:

''بلوچستان، پنجاب، سرحد اور سندھ کے صوبوں کی صوبائی اسمبلیوں میں ایسے افراد کے لیے مخصوص فاضل نشستیں ہوں گی، جو عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ اور پارسی فرقوں اور قادیانی گروہ یا لاہوری افراد (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) یا شیڈول کاسٹس سے تعلق رکھتے ہیں، بلوچستان ایک۔ سرحد ایک۔ پنجاب تین۔ اور سندھ دو۔''

ان دستوری ترامیم کے علاوہ یہ تین سفارشات آئیں:

(۱) تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ الف میں حسب ذیل تشریح درج کی جائے:

''کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ ۲۶۰ کی شق نمبر ۳ کی تصریحات کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے خلاف اقرار، عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ہذا کے تحت مستوجب سزا ہوگا۔ تعزیرات پاکستان کی

اس دفعہ میں ۲ سال قید کی سزا موجود ہے۔"

(۲) متعلقہ قوانین مثلاً نیشنل رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۷۳ء اور انتخابی فہرستوں کے قواعد ۱۹۷۴ء میں قانون سازی اور ضابطے کے ذریعے ترامیم کی جائیں۔

(۳) تیسری سفارش عمومی نوعیت کی تھی۔ جس میں دستور میں پہلے سے دی گئی ضمانت کو دہراتے ہوئے کہا گیا کہ:

"پاکستان کے تمام شہریوں خواہ وہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں کے جان و مال آبرو اور آزادی اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے گا۔"

یہ بات اسمبلی کے ریکارڈ پر ہے کہ اس ترمیم کے حق میں ایک سو تیں ووٹ آئے جب کہ مخالفت میں ایک ووٹ بھی نہ آیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ:

"اس فیصلے پر پوری قوم مبارک باد کی مستحق ہے۔ اس پر نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام میں اطمینان کا اظہار کیا جائے گا۔ میرے خیال میں مرزائیوں کو بھی اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اب انھیں غیر مسلم کے جائز حقوق ملیں گے۔"

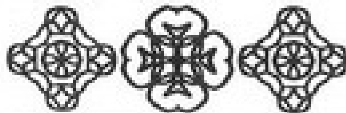
مفتی صاحب نے مزید کہا کہ

"سیاسی طور پر تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ الجھے ہوئے مسائل کا حل بندوق کی گولی میں نہیں مذاکرات کی میز پر ہے۔"

پارلیمانی حزب اختلاف کی قیادت:

مولانا مفتی محمود کو جن حالات میں قومی اسمبلی کے اندر حزب اختلاف کی قیادت کرنا پڑی۔ ماضی میں شاید ہی کوئی قائد حزب اختلاف ایسے حالات سے دو چار ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر نذیر، خواجہ رفیق، عبدالصمد اچک زئی اور مولانا شمس الدین ڈپٹی اسپیکر بلوچستان اسمبلی کو نامعلوم قاتلوں کی گولیاں اور بم چاٹ چکے تھے۔ فروری ۱۹۷۵ء

پشاور یونی ورسٹی میں ایک انتہائی طاقت ور بم کا دھماکہ ہوا۔ جس میں صوبہ سرحد کے سینئر وزیر اور پیپلز پارٹی کے صوبائی سربراہ حیات محمد خان شیر پاؤ اس کی نذر ہو گئے۔ ملک کے تمام سربرآوردہ سیاسی راہ نماؤں نے اس وحشیانہ قتل کی مذمت کی اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیا۔ یہ تھے وہ حالات جس میں متحدہ حزب اختلاف کے قائد خان عبدالولی خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان حالات میں متحدہ حزب اختلاف کی نگاہِ انتخاب مولانا مفتی محمود پر پڑی۔ اور انھیں قائم مقام قائد حزب اختلاف چنا گیا۔ مفتی صاحب نے جس ہمت اور تدبر کے ساتھ مسٹر بھٹو کا مقابلہ کیا۔ وہ قابل داد ہی نہیں قابل صد آفرین ہے۔ انھوں نے توازن شائستگی اور بردباری کے امتزاج کے ساتھ اپنے تدبر اور استقامت کا لوہا دوست تو دوست دشمن تک سے منوالیا اور آج ان کا کردار ہماری پارلیمانی تاریخ کا وہ روشن باب ہے جس پر آنے والی نسلیں یقیناً فخر کرتی رہیں گی۔



اس دفعہ میں ۲ سال قید کی سزا موجود ہے۔"

(۲) متعلقہ قوانین مثلاً نیشنل رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۷۳ء اور انتخابی فہرستوں کے قواعد ۱۹۷۴ء میں قانون سازی اور ضابطے کے ذریعے ترامیم کی جائیں۔

(۳) تیسری سفارش عمومی نوعیت کی تھی۔ جس میں دستور میں پہلے سے دی گئی ضمانت کو دہراتے ہوئے کہا گیا کہ:

"پاکستان کے تمام شہریوں خواہ وہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں کے جان و مال آبرو اور آزادی اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے گا۔"

یہ بات اسمبلی کے ریکارڈ پر ہے کہ اس ترمیم کے حق میں ایک سو تیس ووٹ آئے جب کہ مخالفت میں ایک ووٹ بھی نہ آیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ:

"اس فیصلے پر پوری قوم مبارک باد کی مستحق ہے۔ اس پر نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام میں اطمینان کا اظہار کیا جائے گا۔ میرے خیال میں مرزائیوں کو بھی اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اب انھیں غیر مسلم کے جائز حقوق ملیں گے۔"

مفتی صاحب نے مزید کہا کہ

"سیاسی طور پر تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ الجھے ہوئے مسائل کا حل بندوق کی گولی میں نہیں مذاکرات کی میز پر ہے۔"

پارلیمانی حزب اختلاف کی قیادت:

مولانا مفتی محمود کو جن حالات میں قومی اسمبلی کے اندر حزب اختلاف کی قیادت کرنا پڑی۔ ماضی میں شاید ہی کوئی قائد حزب اختلاف ایسے حالات سے دوچار ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر نذیر، خواجہ رفیق، عبدالصمد اچکزئی اور مولانا شمس الدین ڈپٹی اسپیکر بلوچستان اسمبلی کو نامعلوم قاتلوں کی گولیاں اور بم چاٹ چکے تھے۔ فروری ۱۹۷۵ء

پشاور یونیورسٹی میں ایک انتہائی طاقت ور بم کا دھماکہ ہوا۔ جس میں صوبہ سرحد کے سینئر وزیر اور پیپلز پارٹی کے صوبائی سربراہ حیات محمد خان شیرپاؤ اس کی نذر ہوگئے۔ ملک کے تمام سربرآوردہ سیاسی راہ نماؤں نے اس وحشیانہ قتل کی مذمت کی اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیا۔ یہ تھے وہ حالات جس میں متحدہ حزب اختلاف کے قائد خان عبدالولی خان کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان حالات میں متحدہ حزب اختلاف کی نگاہِ انتخاب مولانا مفتی محمود پر پڑی۔ اور انھیں قائم مقام قائد حزب اختلاف چنا گیا۔ مفتی صاحب نے جس ہمت اور تدبر کے ساتھ مسٹر بھٹو کا مقابلہ کیا۔ وہ قابل داد ہی نہیں قابل صد آفرین ہے۔ انھوں نے توازن شائستگی اور بردباری کے امتزاج کے ساتھ اپنے تدبر اور استقامت کا لوہا دوست تو دوست دشمن تک سے منوالیا اور آج ان کا کردار ہماری پارلیمانی تاریخ کا وہ روشن باب ہے جس پر آنے والی نسلیں یقیناً فخر کرتی رہیں گی۔

